دبستانِ بجنور

ڈاکٹر شیخ نگینوی

خوش آئند ابتدا

یوں تو اپنی جائے ولادت سے جذباتی لگاؤ تمام ہندوستانیوں کے مزاج کا حصہ ہے۔ اہالیان بجنور اس سلسلے میں شاید سب سے سبقت لے گئے ہیں۔ ہماری تربیت ہی ایسے ماحول میں ہوتی ہے جہاں شہر پرستی وطن پرستی کا ہی حصہ سمجھی جاتی ہے۔ میں نے یہاں بہت سے بزرگوں کی زبانی سنا ہے کہ جو اپنے علاقے سے محبت نہیں کر سکتا وہ وطن سے بھی محبت نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ رستم علی بجنوری اور قائم چاند پوری سے تاجور نجیب آبادی تک ہر اہل قلم نے اپنے ساتھ اپنے وطن کے نام کا لاحقہ بھی ضروری سمجھا۔ اپنے نام کے ساتھ شہر کا نام وابستہ کرنا ایران میں قدیم روایت ہے لیکن ہندوستان میں قائم چاند پوری سے قبل کسی نے اپنے شہر کا نام اپنے نام کا جزو بنانا ضروری نہیں سمجھا۔ قائم چاند پوری کے بعد یہ روایت بڑی مستحکم ہوئی۔

برادرم شیخ نگینوی نے بھی حق وطن پرستی ادا کرنے کا مصمم ارادہ کیا ہے۔ ظاہر ہے جہاں جذباتی تعلق ہوگا وہاں مبالغہ آرائی اور خوش بخشی بھی ہوگی۔ اسی وجہ سے انھوں نے بجنور کو بھی ایک باقاعدہ دبستان کی شکل دے دی ہے۔ ابھی تو دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کا قضیہ بھی پوری طرح طے نہ ہوا تھا کہ ایک اور دبستان وجود میں آ گیا۔ رام پور کے بعض شعرا کو بھی دبستان رام پور کی موجودگی کا یقین ہے اور اس کام سے دو کتابیں بھی موجود ہیں لیکن فرنچ تذکرہ نگار جارج فاتنوم سے شکیب رام پوری تک متفق ہیں کہ رام پور میں شعر و سخن کی محفلیں قائم چاند پوری کی بدولت شروع ہوئیں اور قائم ہی دبستان رام پور کے موسس کہے جا سکتے ہیں۔

خواہ تکنیکی اعتبار سے دبستان بجنور کو ایک ادبی اسکول قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن بجنور کی ادبی اہمیت سے انکار ناممکن ہے۔ میر و سودا کے زمانے میں قائم، منعم اور خشونت رائے شاداب جیسے قابل ذکر شعرا موجود تھے۔ بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ اردو کی ابتدائی نثر میں رستم علی بجنوری نے بھی اپنا نام درج کرایا تھا۔ رستم علی بجنوری کی تصنیف "قصہ و احوال روہیلہ" ایک نیم تاریخی کتاب ہے جو شجاع الدولہ کی وفات پر ختم ہو جاتی ہے۔ رستم علی بجنوری نے دارا نگر چھاؤنی کا بھی ذکر کیا ہے، ممکن ہے یہ دارا نگر گنج ہو جو آج بھی بعض تاریخی عمارتوں و نشانیوں کو محفوظ کیے ہوئے ہے۔ رستم علی بجنوری چھاؤنی میں انگریزوں کے بچوں کو اردو پڑھاتے تھے۔

غالب کے دو عزیز شاگرد بھی بجنور اور نہٹور کے رہنے والے تھے۔ غالب نے بعض خطوط میں قائم کو بڑے احترام سے لفظ "استاذ" کے ساتھ یاد کیا ہے اور ان کے اشعار پر تصرف کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ اس وجہ سے غالب کا بھی ایک دور دراز کا تعلق ہم سے قائم ہوتا ہے۔ میر لکھنؤ جاتے ہوئے نجیب آباد سے گزرے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دوردرشن بمبئی کے ایک پرانے پروگرام "ترنم بھی" میں ایک صراحی بنانے والے نے بمبئی میں کہا تھا کہ میں صراحیوں میں تھوڑی سی بجنور کی مٹی شامل کرتا ہوں اس کی وجہ سے صراحیوں میں سے ہمیشہ سوندھی سوندھی خوشبو آتی رہی ہے۔ میں "قائم چاند پوری" اور "عبدالرحمٰن بجنوری" پر تصانیف شائع کرا کے تھوڑا بہت حق ادا کر چکا ہوں۔ لیکن یہ بھی مانتا ہوں کہ مٹی کا ابھی بہت قرض باقی ہے۔

بجنور کے بعض اہل قلم یقیناً اس قابل ہیں کہ ان پر تفصیلی تصانیف شائع کی جائیں۔ برادرم شیخ نگینوی نے ایک خوش آئند ابتدا کی ہے مجھے قوی امید ہے کہ اس کارواں میں مزید اہل قلم شامل ہوں گے۔

پروفیسر خالد علوی

ذاکر حسین کالج دہلی یونیورسٹی، دہلی

نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اقبالؒ

دبستانِ بجنور

مؤلف

ڈاکٹر شیخ نگینوی

بُک کارپوریشن، دھلی-۶

DABISTAN-E-BIJNOR

by

DR. SHAIKH NAGINVI

Year of Edition 2015

ISBN 81-88912-66-2

₹ 300/-

نام کتاب	:	دبستانِ بجنور
مرتب	:	ڈاکٹر شیخ نگینوی
پتہ	:	چھنگا والا چوک، نگینہ ضلع بجنور، یوپی 246762
رابطہ	:	9412326875
ای میل	:	shaikh.naginvi@gmail.com
سنہ اشاعت	:	۲۰۱۵ء
تعداد اشاعت	:	۶۰۰
کمپوزنگ	:	ذی وقار احمد، مراد آباد (09897694581)
قیمت	:	۳۰۰ روپے
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔ ۶

دستیابی:۔۔۔

☆ دفتر میڈیا پوسٹ، A-72 ابول الفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی 25 ☆ دفتر، میڈیا آبزرور، چھنگا والا چوک، نگینہ-246762 (یوپی) ☆ انجمن ترقی اردو بازار، جامع مسجد دہلی-06

☆ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ-04 ☆ دانش بک محل ڈپو، امین آباد، لکھنؤ

☆ رحمانی پبلی کیشنز، 1032، اسلام پورہ مالیگاؤں (مہاراشٹر)

Published by

BOOK CORPORATION

3191, Ground Floor, Mirza Ahmad Ali Marg
Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax: 0091-11-23211540
E-mail: ephdelhi@yahoo.com

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

مجھے ڈھونڈ لے جب بھی چاہے زمانہ

میں ہر موڑ پر ایک نشاں چھوڑتا ہوں

جنوں سہسپوری

انتساب

اپنے عزیز ترین دوست

ڈاکٹر وسیم اقبال نگینوی

کے نام

جو فروغ اردو کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔

پیش لفظ

ہر زبان اپنے ساتھ زندہ تہذیب رکھتی ہے۔ دنیا کی جتنی بھی بڑی زبانیں ہیں سب کا ماضی تابناک، حال محفوظ اور مستقبل روشن نظر آتا ہے۔ ہماری پیاری زبان اردو کا ماضی نہایت تابناک رہا ہے۔ اس کو دنیا کے عظیم ملک بھارت میں پیدا ہونے، پھلنے، پھولنے اور مستحکم ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس کی بنیادیں اتنی مضبوط اور پختہ ہیں کہ بدخواہوں کے تعصب اور تنگ نظری کے ساتھ ساتھ، بہی خواہوں کی نادانیوں اور بے اعتنائیوں کے باوجود، اس کی خوبصورتی، دیدہ زیبی اور رعنائیاں چمک دمک رہی ہیں۔ ماضی کے ادیبوں نے جو ابواب قائم کیے ہیں موجودہ نسل ان میں اضافے کر رہی ہے اور آئندہ نسلوں کے لیے وہ نقوش ثبت کر رہی ہے جن کی اتباع یقیناً مشعلِ راہ ہوگی۔

آج کے دور میں ہر شخص اپنی الگ شناخت قائم کرنا چاہتا ہے۔ موجودہ نسل اپنے آپ سے ایک سوال پوچھتی ہے who are we (ہم کون ہیں) ہر فرد اس سوال کا اپنے انداز سے جواب فراہم کرتا ہے۔ کچھ لوگ فلسفوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک کر رہ جاتے ہیں۔ اور کچھ اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ادب میں اس سوال اور تلاش جواب نے علاقہ نگاری کی نئی جہت قائم کی۔ انگریزی ادب میں تھامس ہارڈی نے بیسویں صدی کے آغاز میں علاقہ نگاری کی شروعات کی۔ اس نے انگلینڈ کے wessex کو چنا۔ اس کے زیادہ تر ناول اسی علاقہ کے گرد و نواح سے متعلق رہے۔ یہ تجربہ ساری دنیا کو جلد ہی متاثر کر گیا اور باقاعدہ علاقہ

نگاری ایک مستقل صنفِ ادب بن گئی۔ زیادہ تر اہلِ قلم حضرات نے اپنے رہائشی پسندیدہ علاقے چنے۔ ہم نے موجودہ تالیف کے لیے اپنے علاقہ ضلع بجنور کا انتخاب اسی جذبہ سے متاثر ہو کر کیا۔ یوں بھی ہندوستان جیسے عظیم ملک میں اگر علاقوں کی نشاندہی نہ کی جائے تو ہم گمنامی کے اندھیروں میں گم ہونے کا Risk نہیں لے سکتے۔ ہاں! یہ علاقہ نگاری علاقائیت اور علاقی حد بندی یا تعصب کی نہج پر نہیں کی جانی چاہیے۔

ضلع بجنور شمالی ہندوستان کا ایک زرخیز علاقہ ہے۔ گنے کی میٹھی پیداوار کے لیے پورے ملک میں مشہور ہے۔ اسی طرح دنیا کی سب سے شیریں زبان یعنی اردو کی آبیاری کے لیے بھی اس کا اپنا الگ مقام ہے۔ بجنور میں علاقہ نگاری کی شروعات فرقان احمد صدیقی نے کی ان کی کتاب ''ضلع بجنور کے جواہر'' کو اس سلسلے میں اولیت حاصل ہے۔ اس کتاب میں نہ صرف ادبیات بلکہ کسی بھی میدان میں سرگرمِ عمل اشخاص کو تلاش کیا گیا۔ اور ان کے تذکرے کو زندہ جاوید کر دیا گیا۔ انھوں نے ایک فردِ واحد ہوتے ہوئے مستقل ادارے کا کام کیا۔ ہم بھی اپنے نحیف کاندھوں پر یہ ذمہ داری اٹھاتے ہوئے ''دبستانِ بجنور'' کی تالیف میں اپنی معلومات کی حد تک منہمک ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اپنی کوشش کمال حد تک کرنے کے باوجود بھی عنوان کا کماحقہ حق ادا کرنا بیحد مشکل ہے۔

ضلع بجنور سے متعلق سرکردہ ادبی شخصیات کو تلاش کرنا اور ان کی خدمات کا اعتراف سپردِ قلم کرنا نہایت دشوار گذار کام ہے۔ ہم نے اسی سلسلے میں خود بھی کچھ سمینار منعقد کیے۔ اور مختلف سمیناروں میں حصہ لیا۔ جستجو یہی رہی کہ اس تعلق سے زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہنچے۔

اس مردم خیز علاقے پر کام کرنے کے بعد ہمیں حیرت ہوئی کہ مرحومین کے بعد معاصرین بھی بڑی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ یوں تو یہ ایک ضلع ہے مگر ہم نے اسے دبستان کا نام دیا ہے۔ ہمارے جمع کردہ مواد سے ثابت ہو جائے گا کہ ضلع بجنور اپنا ایک الگ اور منفرد لب و لہجہ رکھتا ہے۔ اسی دبستان کے گل بوٹے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ تلاشِ معاش اور مجبوری یہ دو ایسے عوامل ہیں، جنھوں نے دنیا میں ہزارہا نئی تہذیبوں کو جنم دیا ہے۔ بجنور کے لوگ جہاں بھی

ہیں، ان کے لب ولہجہ کو الگ ہی پہچانا جا سکتا ہے۔ ضلع بجنور کی بولی، زبان، لہجہ، الفاظ کا انداز گفتگو، تحریر کا اسلوبِ نگارش اپنی جگہ ممتاز مقام رکھتا ہے۔ اسی لیے اسے ''دبستان بجنور'' کا نام دیا ہے۔

مولوی نذیر احمد اردو کے اولین ناول نگار ہیں۔ جنھوں نے تعزیرات ہند کا اردو میں ترجمہ کیا جو ہندوستان کی تمام عدالتوں میں رائج ہوا۔ اسی طرح عبدالرحمٰن بجنوری نے غالبؔ کو تمام دنیا سے متعارف کرایا اور غالبیات کا افتتاح کیا، ان کے ریسرچ ورک ''محاسن کلام غالب'' نے غالب کو غالب بنایا اور اسے انگریزی، جرمن اور فرنچ ادیبوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ یہ دو اشخاص ایسے ہیں جن پر بجنور جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ یوں تو ہر ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔ ہم نے یہاں مثال کے طور پر یہ دو نام اس لیے پیش کیے ہیں کہ ہماری تالیف اور ہمارا جمع کردہ مواد اپنا تعارف بہتر انداز میں دنیا سے کرا سکے۔ ہمیں امید ہے کہ ہماری یہ چھوٹی سی کوشش آنے والی نسل کو وہ ورثہ دے گی، جس کی بنیاد پر ضلع بجنور کے علاوہ شمالی ہندوستان بلکہ پورے برصغیر کے گم شدہ افراد کی حیات وخدمات کی تدوین کا کام زور پکڑے گا۔

خاکسار کو آل انڈیا ریڈیو نجیب آباد سے خصوصی گفتگو پیش کرنے کے لیے ایک عنوان ملا ''ضلع بجنور کے معروف اردو ادیب اور ان کا تعاون'' جب اس عنوان پر خصوصی گفتگو پیش کرنے کے لیے کتب بینی کی تو معلوم ہوا کہ اس زرخیز زمین میں تو نایاب گوہر جمع ہیں۔ اسی سے تحریک پا کر ایک قومی سیمنار ''اردو کی ترقی میں ضلع بجنور کا کردار'' موضوع پر نگینہ میں منعقد ہوا۔ سیمنار میں کئی مقالات جمع ہو گئے۔ اور اپنی بعض مصروفیات کی وجہ سے کئی ادبی شخصیات وعدہ کے باوجود شرکت نہ کر سکیں۔ میرے عزیز دوست ڈاکٹر وسیم اقبال صدیقی اور میرے سرپرست جناب طفیل احمد ایڈوکیٹ (علیگ) کے مشورہ پر کتاب کی ترتیب شروع کی۔ ضلع بجنور کے موجودہ ادبی قلمکاروں سے مذکورہ موضوع پر مضمون رمقالے کی درخواست کی گئی اور جس کی قبولیت پر یہ کتاب عمل میں آئی۔

خاکسار اللہ تبارک تعالٰی کے شکر اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف وتمجید کے

بعد شکر گزار ہے ابرار کرتپوری صاحب، عشرت جاوید صاحب، معین شاداب صاحب، سرور نگینوی صاحب، انجینئر محمد سمیع الدین صاحب (علیگ)، اقبال احمد صدیقی صاحب، تہذیب ابرار صاحب، محمد احمد دانش رواتوی صاحب، پرویز عادل صاحب، ظہیر ربانی صاحب، پروفیسر محمد عرفان نگینوی صاحب، جلیس نجیب آبادی صاحب، ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی صاحب، مفتی محمد اویس اکرم صاحب، مولانا نوشاد احمد تاراپوری صاحب، ڈاکٹر احتشام نعمانی صاحب، ڈاکٹر وسیم اقبال صاحب کے علاوہ بجنور ضلع کے باہر کے ادیبوں میں علیم ہاشمی صاحب (مغربی بنگال)، ڈاکٹر منصور احمد صدیقی صاحب (مرادآباد)، انجینئر محمد فرقان سنبھلی صاحب، ڈاکٹر زیبا ناز صاحبہ (مرادآباد)، ذی وقار احمد صاحب (مرادآباد)، ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی صاحب (امروہہ) اور فرح ناز صاحبہ (میرٹھ) کا جنھوں نے میری درخواست قبول کی اور بروقت اپنا مقالہ روانہ کیا۔ یہ تمام اہل قلم حضرات عصرِ حاضر میں اردو ادب کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اور ان کے مضامین اور مقالوں نے، عہد گذشتہ میں خواتین و فرزندان ضلع بجنور نے اردو کی ترقی میں جو کردار ادا کیا ہے اس کا مختصر تعارف کرایا ہے فرزندانِ ضلع بجنور نے کس کس صنف میں طبع آزمائی کی ہے؟ ان مضامین کو پڑھنے کے بعد بھی قارئین میں تشنگی برقرار رہے گی کیونکہ "ضلع بجنور یا دبستان بجنور" کا اتنا بڑا کام ہے کہ جسے ایک کتاب یا چند مضامین میں نہیں سمیٹا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ کتاب ریسرچ اسکالرس کی رہنمائی ضرور کرے گی اور نئی نسل میں "ضلع بجنور" اور اردو کے تعلق سے ایک تحریک پیدا کرے گی۔

اس کتاب کے نام کے سلسلے میں کئی ادیبوں اور مخلصین سے مشورے ہوئے۔ پروفیسر محمد عرفان نے "دبستان بجنور" کی جانب اشارہ کیا اور ڈاکٹر احتشام نعمانی صاحب اور ڈاکٹر وسیم اقبال صاحب کی "ص" پر کتاب کا نام "دبستان بجنور" طے ہوا۔

میں بہت مشکور ہوں ڈاکٹر محمد احسن صاحب (نجی)، پروفیسر خالد علوی صاحب (دہلی)، جمیل جوہری (علیگ) قنوج، ڈاکٹر نصرت مہدی (بھوپال) ڈاکٹر ابو شہیم خاں (ساگر، ایم پی) ڈاکٹر رضاالرحمٰن عاکف سنبھلی ڈاکٹر قاسم انصاری صاحب اور

محمد انور صاحب (دہلی) کا جنھوں نے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازہ اور میری حوصلہ افزائی کی۔

میں بیحد شکر گزار ہوں اپنی والدہ محترمہ کا جن کی دعائیں، بلاؤں سے میری نگہبانی کرتی ہیں اور ترقی کی راہ پر کامیابی عطا ہوتی ہے اور ساتھ ہی شکر گذار ہوں میں اپنی شریک حیات نازیہ پروین کا بھی جو میرے قلم کی رفتار برقرار کھنے میں ماحول عطا کرتی ہیں۔

آخر میں شکریہ ادا کرتا ہوں آپ کا بھی کہ آپ نے اس کتاب کے لیے اپنے قیمتی وقت کا صرفہ کیا۔

خاکسار
ڈاکٹر شیخ نگینوی
9412326875

اردو کا طالب علم: شیخ نگینوی

محمد ارشد معروف بہ ڈاکٹر شیخ نگینوی کی پیدائش 11 رجنوری 1973 کو نگینہ میں محمد راقم صاحب کے یہاں ہوئی۔ ابھی ابتدائی تعلیم کا سلسلہ شروع ہی ہوا تھا کہ اپریل 1979 کو ایک حادثہ میں والد کا انتقال ہو گیا۔ مشرقی تہذیب کو اپنانے والی والدہ نے تمام جستجو، محنت اور مشقت کے ساتھ چھ بچوں کی مثالی پرورش کی اور سب کو تعلیمی زیور سے آراستہ کیا۔ محمد ارشد نے پرائمری درجات اردو میڈیم سے پڑھنے کے بعد چھٹی کلاس سے پوسٹ گریجویشن تک کامرس پڑھی۔ ادب اور اکاؤنٹس دو الگ سمت ہونے کے باوجود گھر میں والد نے ورثہ کے طور پر چھوڑی اردو کی کتابوں کے مطالعہ نے اردو سے وابستگی قائم رکھی۔ نویں کلاس سے ہی کالج میگزین میں مضامین لکھے اور ضلع سطحی مضمون نویسی مقابلوں میں شرکت کر انعام حاصل کیے۔

1989 میں نشتر خانقاہی کی زیرِ ادارت بجنور سے شائع روزانہ ''خبر جدید'' سے صحافتی زندگی کا آغاز کیا اور اپنا قلمی نام شیخ نگینوی رکھا۔ گوشوارہ رڑکی، وارتا مرادآباد، دنیا کی کھوج مرادآباد، سونے پہ سہاگہ دھام پور، عالمی جرائم دہلی، فیصل جدید دہلی، قومی آواز دہلی اور لکھنؤ سے شائع ہونے والے ہفت روزہ ''جدید مرکز'' میں اعزازی نامہ نگار کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ کئی فیچر ایجنسی کے ذریعہ ادبی اور اصلاحی مضامین ملک کے مختلف اردو، ہندی اخبارات ورسائل میں شائع ہوئے۔

2007 میں ''میڈیا پوسٹ'' نئی دہلی میں مدیر ادب بنائے جانے پر شیخ نگینوی کے تحریر کردہ ادبی مضامین، کتابوں پر تبصرے اور انٹرویو میڈیا پوسٹ کی زینت بنے۔ 2010 سے

اردو سیمناروں میں مقالہ نگار کی حیثیت سے شرکت کر پچاس سے زائد مقالے پیش کیے اور ان ادبی مضامین اور مقالات کا مجموعہ "فیضانِ راقم" کے نام سے 2015 میں شائع ہوا۔ دوسری کتاب "دبستانِ بجنور" آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ تیسری کتاب مشاہیرِ نگینہ" زیرِ ترتیب ہے۔ کئی ادبی وسماجی تنظیموں سے اعزاز حاصل کر چکے ڈاکٹر شیخ نگینوی روہیل کھنڈ کی ادبی سرگرمیوں کا حصہ ہونے کے ساتھ ساتھ سوشل میڈیا پر بھی سرگرم ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو نجیب آباد سے کئی بار خصوصی گفتگو نشر ہو چکی ہے۔ تاریخ ادب ضلع بجنور، صد سالہ صحافت ضلع بجنور ڈائرکٹری امر اجالا، دہلی ساہتیہ ندیشالیہ، آل انڈیا پتر کار کوش ممبئی میں ڈاکٹر شیخ نگینوی کا نام وتعارف شامل ہے۔

ڈاکٹر ابو شہیم خاں

ڈاکٹر ایچ ایس گور منسٹر یونیورسٹی ساگر

مدھیہ پردیش

دبستان بجنور

ڈاکٹر شیخ نگینوی

شمالی ہندوستان میں کوہ ہمالیہ کی شوالک پہاڑیوں کے دامن میں بسا ضلع بجنور ایک تاریخی اور مردم خیز خطہ ہے۔ یہ علاقہ ادبی سرگرمیوں اور تحریکوں کا گہوارہ تو نہیں رہا لیکن یہاں کی قابلِ فخر شخصیتوں نے ادبی ارتقا کی تاریخ میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اردو زبان وادب سے بجنور کا قریبی اور گہرا تعلق ہے۔ ضلع بجنور کی سرزمین جتنی گنّے اور آم کی کاشت کے لئے زرخیز ہے، اس سے زیادہ رسیلی اور میٹھی زبان اردو کے لئے بھی زرخیز ہے۔ اردو زبان کی بنیاد جس بولی پر رکھی گئی اس کے علاقے میں اس ضلع کا بھی بڑا حصہ شامل ہے۔ گویا اردو کا تعلق بجنور سے کافی گہرا ہے۔

اتر پردیش کی مرادآباد کمشنری کے ضلع بجنور کی جانب مشرق میں مرادآباد، نینی تال (اتراکھنڈ)، مغرب میں ہری دوار، میرٹھ، مظفر نگر، شمال کی جانب اتراکھنڈ کا گڑھوال اور ہری دوار جنوب کی جانب ضلع امروہہ ہیں۔ سمندری سطح سے 284 میٹر اونچائی والے ضلع بجنور 30.29 زاویہ اور 29.2 ڈگری مشرق زاویہ کے وسط میں واقع ہے۔ گنگا، رام گنگا، مالن اور کھوہ ندیاں اسی ضلع بجنور میں بہتی ہیں اور سرزمین کو سرسبز وشاداب بنائے ہوئے ہیں۔ انتہائی قدیم یہ ضلع مہابھارت عہد سے بھی قبل آباد ہے۔ حکومت دہلی کے قیام کے بعد اس کا بیشتر حصہ ریاست سنبھل کی قلم رو میں آگیا۔ 1817ء میں ضلع مرادآباد کا ایک حصہ کاٹ کر نیا ضلع شمال ڈویژن کے نام پر بنایا گیا۔ جس کا صدر مقام نگینہ رکھا گیا۔ جو 1824ء میں منتقل ہو کر بجنور چلا گیا اور ضلع بجنور کہلایا۔ 1901ء میں ضلع بجنور کی آبادی 7,80,105 تھی جو 2011ء میں 36 لاکھ 83 ہزار ہوگئی۔ جن میں 59.56 فیصد ہندو، 37.45 فیصد مسلمان، 2.16 فصد سکھ باقی دیگر مذاہب

کے لوگ رہتے ہیں۔اردو یہاں کے 32.98 فیصد عوام کی زبان ہے۔بجنور ضلع میں بجنور، چاند پور، دھام پور، نگینہ، نجیب آباد پانچ تحصیلیں ہیں۔جبکہ بجنور، نگینہ، مراد آباد تین پارلیمانی حلقہ اس ضلع سے منسلک ہیں۔آٹھ اسمبلی حلقوں، گیارہ بلاک، بارہ میونسپل بورڈ، 6 شہر پنچایت، 956 گرام پنچائت پر مشتمل ضلع بجنور کی زبان کو کھڑی بولی کہا جاتا ہے۔

پنجاب اور ہریانہ قریبی صوبے ہونے کی وجہ یہاں کی عوامی زبان خاص کر دیہات میں سپاہیانہ وتحکمانہ ہے جبکہ قصبوں اور شہروں میں لکھنو، رام پور، مراد آباد اضلاع کا اثر ہے شہری عوام کے لب ولہجے نیز الفاظ میں نوابی نزاکت وتکلف کی چاشنی کا عنصر پایا جاتا ہے۔الفاظ میں تشدید کا استعمال ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے۔منفرد لب ولہجہ، الفاظ اور اندازِ گفتگو یہاں زبان کو الگ پہچان بناتی ہے جو دنیا بھر میں پہچانی جاتی ہے۔کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو بجنوریوں کی پہچان بن چکے ہیں مثلاً یوں (اس طرح) کاں (کہاں) اُرے (اِدھر) پرے (اُدھر) کررا (کررہا) ہووے (ہوئے) وے (وہ) آوے (آئے) اِنگھے (اس طرف) اُنگھے (اُس طرف) آریا (آرہا) جاریا (جارہا) وغیرہ

سیاسی اعتبار سے بجنور چونکہ شاہان دہلی اور حکمرانِ اودھ دونوں سے متعلق رہا، اس لئے یہاں کی ادبی محفلوں میں دبستانِ دلّی اور لکھنو دونوں کا تتبع کیا گیا اور آج تک یہاں کی زبان و بول چال پر اس کا اثر موجود ہے۔بیسویں صدی میں رام پور اسکول کی ادبی روایات سے بھی یہاں کے شعرأ نے اکتساب سے گریز نہیں کیا۔اردو ادب کے دو بڑے مرکز حیدر آباد اور بھوپال نے بھی اس ضلع کی ادبی شخصیتوں کو نواز کر یہاں کی ادبی زندگی میں روح پھونکی۔

شعرائے متقدمین قائم چاند پوری کا نام سرِ فہرست ہے۔تذکرہ نگاروں نے قائم، غالبؔ، ذوقؔ اور خصوصاً داغؔ کے ان شاگردوں کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق ضلع بجنور سے ہے۔دورِ متوسط اور دورِ آخر میں بھی نامور اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے والے شعرائے بجنور کی ایک اچھی خاصی فہرست ہے۔جن کا ذکر تذکرہ نگاروں نے نہیں کیا لیکن اس زمانے کے مشہور گلدستوں اور رسائل میں ان کا کلام اور بعض بعض کے حالاتِ زندگی محفوظ ہیں۔

شعروشاعری میں جہاں یہاں کے اہل علم دادِ سخن لیتے رہے، وہیں دوسری اصناف نظم ونثر میں بھی بجنوریوں نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ مولوی نذیر احمد کا نام اردو ناول نگاری اور افسانہ نویسی کی تاریخ میں ہمیشہ اولین ادیبوں کی فہرست میں آتا رہے گا۔ اردو زبان کے مورخین کا تذکرہ اکبرشاہ خاں نجیب آبادی کے نام کے بغیر نامکمل رہے گا۔ دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے والوں کی فہرست جب بھی مرتب کی جائے گی سید سجاد حیدر یلدرم کا نام ترکی زبان سے ترجمہ کرنے والوں کی ابتدائی فہرست میں ہمیشہ جگہ پائے گا۔ اردو تخلیق وتنقید نگاری کی تاریخ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کو فراموش نہیں کرسکتی۔ غالب شناسی کا دور صحیح معنوں میں ''محاسن کلامِ غالب'' کی تخلیق کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔ اردو زبان وادب سے متعلق تحریروں میں علامہ تاجور نجیب آبادی اور سرتج بہادر سپرو کا نام بھی آتا رہے گا۔

صحافت کے میدان میں بھی بجنور کی خدمات قابلِ ذکر ہیں یہاں کی صحافتی زندگی کا قلب مدینہ اخبار رہا ہے۔ صحافت کی نامور شخصیتیں قاضی عدیل عباسی، ابوسعید بزمی، نیاز فتحپوری، شوکت تھانوی، محمد عثمان فارقلیط، نصراللہ خاں عزیز، حامدالانصاری غازی اور ضیاالحسن فاروقی وغیرہ سب مدینہ سے متعلق رہے۔ (شرافت مرزا)

دبستان بجنور کے پروفیسر عبدالصمد صارمؔ، ڈاکٹر عثمان اطہر پرویز، ماہر لسانیات گیان چند جین، مجاہد ملت حفظ الرحمٰن سیوہاروی، تاریخ داں اکبر شاہ نجیب آبادی، صحافی مولانا مجید حسن (مدینہ)، نشترؔ خانقاہی، رفعت سروش، پروفیسر خورشیدالاسلام، شاعر قائمؔ چاندپوری، علامہ تاجور نجیب آبادی، بینا بجنوری، نہال سیوہاروی، عرفان رومانی، شمس کنولؔ، ظفر احمد نظامی، کوثرؔ چاندپوری، امام الشعراء اختر الایمان، چندر پرکاش جوہرؔ بجنوری، ہلالؔ سیوہاروی، رام اوتار مضطرؔ نجیب آبادی، رام کمار ورما تمؔ بجنوری، ڈاکٹر ذکاء الرب ربابؔ، پرکاش مونس، پروفیسر ریاض الاسلام، شمبھو سنگھ دانش، مولوی عبدالبصیر عتیقی آزاد، علامہ شبیر احمد عثمانی، مفتی عزیزالرحمٰن، منشی کنول نین سرکش، شوق بجنوری، نور بجنوری، شیون بجنوری، افسر جمشید، جاوید ندیم، جیراج سنگھ بشنوئی، ڈاکٹر شرافت حسین مرزا، حافظ محمد رحمت اللہ فرحت نگینوی، سید مصطفٰی حسین قادری فرخ نگینوی ظ

میرٹھی، عشرت کرتپوری، حکیم نیر واسطی، ڈپٹی نثار حیدر نہٹوری، حافظ عبدالسمیع سیمابی، مختار زنجانی، ظفر بجنوری، عبدالقیوم ارشق شیر کوٹی خواتین میں نذر سجاد، صدیقہ بیگم، قرۃ العین حیدر، پنہاں انصاری، پروفیسر ثریا حسین، ڈاکٹر شمع افروز زیدی، نصرت مہدی، علینہ عترت رضوی، ڈاکٹر شبانہ نذیر، صائمہ فہیم عظیمہ نشاط، نئی نسل میں اسدرضا، حبیب سوز، خالد علوی، ڈاکٹر وسیم اقبال، جاوید اختر، معین شاداب، اطہر شکیل، ابرار کرتپوری، شکیل جمالی، عشرت کرتپوری، سالک دھامپوری، عبد الغفار دانش نور پوری، سراج الدین ندوی، ڈاکٹر شیخ نگینوی، جاوید اقبال، عشرت جاوید، محمد احمد دانش، مسرت شیزی، انور بجنوری، شفق بجنوری، فاخر ادیب، شناور کرتپوری، منصور بجنوری، مرزا طالب بیگ، شمیم احمد صدیقی، ارشد ندیم، تہذیب ابرار، پرویز عادل، شکیل بجنوری شکیل رحمانی، جلیس نجیب آبادی، اخگر جلال آبادی، حفیقیصر زیدی، قاضی سجاد حسین کرتپوری، انجینئر سمیع الدین، یوسف بہزاد، مولانا ریاست علی، ڈاکٹر محمد یعقوب عامر سیوہاروی، ڈاکٹر زین العابدین، طیب آزاد شیر کوٹی، ڈاکٹر فرزانہ خلیل، شہناز کنول، ڈاکٹر عابدہ سمیع، پروفیسر عابد ملک وغیرہ وہ نام ہیں جو تاریخ ادب اردو میں سنہرے الفاظ میں درج ہیں۔ ان ادیبوں اور شاعروں نے بڑی تعداد میں تصانیف تخلیق کر کے اردو کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ہے ضلع بجنور بھی تاریخ اردو میں مگر
لگ گئیں صدیاں کہ اردو کے سنورنے کے لیے

اردو ادب کی ایسی کوئی صنف نہیں ہے جسے ضلع بجنور کے ادیبوں نے اپنے قلم کے ذریعے سجا سنوار کر مضبوطی نہ دی ہو۔ گیت، غزل، نظم، قصیدہ، مرثیہ، ناول، افسانہ، ڈرامہ، انشاء پردازی، سوانح نگاری، اوپیرا، طنز و مزاح، صحافت، ترجمہ نگاری، تنقید و تبصرہ وغیرہ۔ وغیرہ سبھی اصناف میں ضلع بجنور کے اردو ادیبوں نے طبع آزمائی کی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو ادب ضلع بجنور کے ادیبوں کے بغیر نامکمل ہے۔ ضلع بجنور کے سبھی شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں روشنی ڈالنے کے لیے ایک پورے دفتر اور لمبے وقت کی ضرورت ہوگی، اس لئے ہم یہاں ضلع بجنور کے چند خاص ادیبوں کے بارے میں مختصر تحریراً کرتے ہیں۔

قائم چاند پوری-محمد قیام الدین "قائم چاند پوری" سنہ 1726ء میں ضلع بجنور کے قصبہ چاند پور میں پیدا ہوئے۔ قائم کے استاد رفیع احمد سودا تھے۔ مشہور ادیب پروفیسر خورشید الاسلام نے لندن سے قائم کا دیوان تلاش کرا کے جمع کیا اور لکھا "حقیقت یہ ہے کہ غزل کے میدان میں قائم، میر کے ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔ قصیدہ میں سودا کو چھوڑ کر سب سے بہتر ہیں، بیانیہ اور تمثیلی مثنوی میں کوئی ان کے برابر نہیں، قطعہ اور رباعی میں وہ جہاں ہیں، وہاں اکیلے اور تنہا نظر آتے ہیں۔ قائم مجموعی طور پر بھی معاصرین میں ممتاز ہیں"۔ "مخزن نکات" قائم چاند پوری کا ادبی مجموعہ ہے جس میں انہوں نے اردو شاعروں کے بارے میں تذکرہ کیا ہے۔ یہ 18ویں صدی کا پہلا اہم اور بنیادی مجموعہ ہے۔ قائم چاند پوری کا سنہ 1793ء میں رام پور میں انتقال ہو گیا تھا۔ ان کا مشہور شعر ہے۔

مجلسِ واعظ تا دیر رہے گی قائم
یہ ہے مہ خانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری : غالب کو غالب بنانے میں جتنا ہاتھ مولانا حالی کا تھا، عبدالرحمٰن بجنوری کا اس سے کم نہ تھا بلکہ اگر سچ پوچھا جائے تو غالب کو دنیائے شعر و ادب میں غالب کرنے کا کارنامہ ڈاکٹر بجنوری تھا۔ غالب نے جو کچھ کہا تھا اس میں بجنوری کا کوئی اضافہ کرنے کا تو سوال تو تھا نہیں بلکہ سوال اسے سمجھنے اور سمجھانے کا تھا اور انھوں نے اسے بالکل نئے ڈھنگ سے سمجھنے کی ضرور کوشش کی، بقول رشید احمد صدیقی۔ "اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب کو نفسیاتی اسلوب تنقید کی روشنی میں پہلے پہل بجنوری مرحوم ہی نے پیش کیا۔ یہ بجنوری کے مقالے کا اثر ہے کہ آج کل کے پڑھے لکھوں میں غالب سے شیفتگی پیدا ہوئی اور ارباب ذوق و فکر نے غالب ہی نہیں بلکہ دوسرے شعراء کو بھی بجنوری مرحوم ہی کے اندازِ تنقید سے جانچنا اور پرکھنا شروع کیا۔"

"محاسن کلامِ غالب" کے پہلے جملے سے ہی غالب پرستی کا اعلان ہوتا ہے۔

ہندوستان میں الہامی کتابیں دو ہیں ایک مقدس وید دوسری دیوانِ غالب۔"

قاضی عبدالغفار خاں نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''محاسن کلامِ غالب کے متعلق عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے اپنا جو نقطہ نظر پیش کیا ہے اگر اس سے بعض نقادِ فن اختلاف بھی کریں تب بھی وہ بجنوری کی وسعت نظر اور عالمانہ تنقید کا وزن ضرور محسوس کریں گے''

بجنوری نے اگر دیوانِ غالب کو الہامی کتاب مانا تو بے جا نہیں ۔اس لئے کہ ان کا خیال تھا اور صحیح تھا کہ'' کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں کون سا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ۔''اور اسی لئے انھوں نے غالب کو ایک ''رب صنوع''تسلیم کیا ہے۔

غالب پر ان کا یہ دیباچہ جو بعد کو'' محاسن کلام'' کے نام سے شائع ہوا غالب کے سلسلے میں سب سے اہم دستاویز ہے۔جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری 1882 میں سیوہارہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے ان کے والد خان بہادر نور اسلام کوئٹہ میں انجینئر تھے اس لئے ان کی پرورش ۔ابتدائی تعلیم انگریزی ماحول میں ہوئی ،اور بنیادی مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی پڑھائی گئی لیکن اعلی تعلیم علی گڑھ میں شروع ہوئی ۔علی گڑھ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد بیرسٹری کے لئے انگلستان روانہ ہو گئے ۔بجنوری کو شروع سے انگریزوں سے منافرت تھی ۔بیرسٹری کا امتحان شاندار کامیابی کے ساتھ پاس کرنے کے بعد وہیں انگلستان میں انگریزوں کے خلاف کام شروع کر دیا۔فرانس میں رہ کر آپ نے پی۔ ایچ ۔ڈی کے لئے مقالہ لکھا یہ مقالہ جرمنی زبان میں لکھا اور وہیں چھپا، یہ مقالہ فقہ پر ہے۔

ہندوستان کی آزادی اور دوسرے مسائل پر وہاں گاندھی جی سے آپ کی تفصیلی بات ہوئی تھی ۔آپ کو مادرِ درس گاہ علی گڑھ سے غیر معمولی دلچسپی تھی ۔اور آپ کا خیال تھا کہ اس قسم کی کئی یونیورسٹیاں قائم کی جائیں اسی لئے جب یونی ورسٹی کا قانون بنا تو ڈاکٹر بجنوری نے دہرادون میں ایک اسکیم بنائی اور اپنے دوستوں خاص طور سے شعیب قریشی ،عبیدالرحمٰن سندھی ، ڈاکٹر سید محمود کو شریک کیا پھر یونی ورسٹی کے ڈھانچے کو ترتیب کرنے کے لئے جب ایک کمیٹی بنائی تو اس کے سلسلے میں مشاورتی جلسہ ڈاکٹر بجنوری نے امروہہ میں طلب کیا۔

نواب حمید اللہ خاں (بھوپال)نےآپ کو اپنا صلاح کار بنالیا۔نواب صاحب بھوپال

آپ کے کلاس فیلو تھے اور ڈاکٹر بجنوری بھوپال میں رہنے لگے۔ وہیں دیوان غالب نظر سے گزرا۔ یہ نسخہ بھوپال کے فوجدار خاں کو نذر کیا گیا۔ تھا ڈاکٹر صاحب نے فوراً اس کو طبع کرانے کا انتظامات کیے، لیکن وہ نسخہ "نسخہ حمیدیہ" کے نام سے ان کے انتقال کے بعد چھپا۔

ڈاکٹر بجنوری کے خطوط کے مجموعے "باقیاتِ بجنوری" اور "یادگارِ بجنوری" کے نام سے چھپے ہیں۔ جن سے اس دور پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ان دونوں مجموعوں میں مضامین بھی شامل ہیں۔ جو ان کی جدّت طرازی کا نقش ہیں۔

"محاسن کلامِ غالب" میں دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے اور آج بھی غالب پر اتنا کام ہونے کے باوجود اس پائے کا مقالہ نہیں لکھا جا سکا۔

7 نومبر 1918ء کو عبد الرحمٰن بجنوری کا بھوپال میں صرف 33 برس کی کم عمری میں انتقال ہو گیا، لیکن اردو ادب کے لیے وہ صدیوں کا کام کر گئے۔ ناہید، ہندوستان، مجذوب ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ ؎

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا میرے بعد

اکبر شاہ نجیب آبادی۔ اکبر شاہ خان، اکبر شاہ نجیب آبادی کی پیدائش بجنور ضلع کے نجیب آباد شہر میں ہوئی۔ شاہ اردو کے عظیم تاریخ داں، ادیب اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باصلاحیت محقق بھی تھے۔ انھوں نے ادب، سیاست اور فلسفہ پر بیش قیمت مضامین تحریر کیے۔ ان کی ادبی تخلیق "بحر الفصاحت" فن عروض پر مستند کتاب ہے۔ اکبر شاہ نجیب آبادی کا ایک بڑا کارنامہ اردو زبان میں "تاریخ اسلام" تین جلدوں میں مرتب کرنا ہے۔ انھوں نے 1910ء سے 1938ء تک لگاتار "عبرت" نامی ادبی اخبار کی ادارت اور اشاعت کی۔ 1942ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ بقول ظفر عدیم۔

لہجے کا گوشہ نطق کا پہلو اداس ہے
اک شخص کے نہ ہونے سے اردو اداس ہے

علامہ تاجور نجیب آبادی۔ برصغیر میں بیسویں صدی میں جو ادبی شخصیات پیدا ہوئیں ان میں

ایک نام علامہ تآجور نجیب آبادی کا بھی ہے۔ بیسویں صدی کے ادیب اور شاعر جن ماہناموں اور جریدوں میں چھپنا فخر سمجھتے تھے اور چھپنے کے بعد ان کا شمار معیاری ادیبوں اور شاعروں میں ہونے لگتا تھا، ان ماہناموں اور جریدوں کی ادارت علامہ تآجور نجیب آبادی کرتے تھے۔ علامہ تآجور نجیب آبادی کا اصلی نام احسان اللہ خاں تھا۔ 1894ء میں ان کی پیدائش ضلع بجنور میں نجیب آباد قصبہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد علامہ تآجور نجیب آباد سے دیو بند چلے گئے اور 1914ء میں لاہور سے اپنی تعلیم مکمل کر وہیں دیال سنگھ کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ تآجور 1916ء میں ''مخزن'' کے مدیر بنے۔ ادبی میگزین ''ہمایوں'' کے اڈیٹر ''پریم'' اور ''ادبی دنیا'' میگزین کے پبلشر بھی علامہ رہے۔ 1934ء میں علامہ تآجور نجیب آبادی نے ''شاہکار'' نام سے ایک میگزین شائع کی جس نے ادبی حلقوں میں بڑی شہرت حاصل کی۔

مشہور ادیب گوپال متل لکھتے ہیں کہ ''پنجاب میں محمد حسین کے بعد اردو کی ترقی میں دوسرا نمبر تآجور کا ہے''۔ تاجور نے ''روحِ انتخاب'' نامی کتاب بھی تصنیف کی۔ علامہ تآجور نجیب آبادی کو ''بلیغ الملک'' کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ 30 جنوری 1951ء کو علامہ تآجور نجیب آبادی کا پاکستان میں ہی انتقال ہو گیا۔ علامہ کا ایک شعر۔

پس اتنی داد دینا بعد میرے میری الفت کو
کہ یاد آؤں تو اپنے آپ کو تم پیار کر لینا

اظہار آثر کرتپوری۔ برصغیر کے معروف ناول نگار اظہار آثر کرتپوری کی پیدائش 1928ء میں ضلع بجنور کے قصبہ کرتپور میں ہوئی۔ روزگار کی تلاش میں اظہار آثر 1943ء میں لاہور چلے گئے اور وہاں استاد شاعر احسان دانش کے شاگرد بن گئے۔ 1950ء میں اظہار آثر دہلی واپس آئے۔ اس وقت تک آثر شاعری کیا کرتے تھے۔ دہلی میں چلمن، بانو، کی ادارت کی اور آریہ ورت کے نائب مدیر رہے۔ تنخواہ ناکافی تھی اس لئے انھوں نے سوچا کہ ''شاعری داد دے سکتی ہے، پیٹ بھرنے کو روٹی نہیں دے سکتی''۔ اس لئے افسانے لکھنے شروع کر دیے۔ 1952ء میں ان کا پہلا ناول ''ناگن'' آیا اور بیحد مقبول ہوا۔ اس کے بعد آثر نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور ادب کی ہر صنف

شاعری، افسانہ، رباعی، سماجی، سائنسی اور جاسوسی ناول، انشائیے، تنقید، ریڈیو، ٹی وی اور اسٹیج بھی میں طبع آزمائی کی۔ نصاب میں ان کی تخلیقات شامل ہیں۔ "فرعونہ" اور "ناگن" اردو جاسوسی ادب کے بہترین نمونے ہیں۔ ان کا کئی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا ہے۔ اظہار آثر انڈو پاک کے پہلے سائنسی شاعر کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ ان کی ہزار کے قریب تخلیقات منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ فرانس کے ادیب موپاساں اور روسی ادیب گورکی نے اظہار آثر کو متاثر کیا۔ 2011 میں اظہار آثر کا انتقال ہوگیا۔ اظہار آثر کا شعر

حسرتِ دید کی تفصیل لکھو گے کب تک

نامۂ دل میں اتر کر چشمِ تمنا رکھ دو

ہلال سیوہاروی: عالمی شہرت یافتہ طنز و مزاح کے شاعر ہلال سیوہاروی کا 15 نومبر 2012ء کو انتقال ہوگیا۔ یہ خبر اردو ادب اور خاص طور پر طنز و مزاح کی شاعری کے لئے بڑی المناک تھی، کیونکہ طنز و مزاح میں شاعری کرنا اور اس کا معیار قائم رکھنا آسان کام نہیں ہے۔ لیکن ہلال سیوہاروی نے اپنی شاعری کے ذریعے اردو ادب میں معیاری مزاحیہ وطنزیہ شاعری کی کمی کو کافی حد تک پورا کیا۔

ہلال صاحب نے اپنی شاعری عام اور آسان اردو زبان میں کی اور اپنی طنزیہ شاعری میں سیاست، سیاست داں، سرمایہ داری اور سرمایہ داروں، افراد اور سماج سبھی کو ہدف بنایا، اسی لئے ان کا کلام آج بھی مجلسوں میں گفتگو کا موضوع اور اخبار کی سرخی بنتا ہے۔

15 جنوری 1928ء کو ضلع بجنور (یوپی) کے قصبہ سیوہارہ میں قاضی فضلِ حق صاحب کے یہاں پیدا ہوئے۔ حبیب الرحمن نے جب شاعری شروع کی تو اپنا قلمی نام ہلال سیوہاروی رکھا اور یہ ہلال اردو شعروادب کی دنیا میں چاند کی طرح چمکا۔ ادیب ماہر تک تعلیم حاصل کرنے والے ہلال کو شعری ذوق فارسی کے بڑے اور خوشگو شاعر دادا قاضی مظہر الحق سے ورثہ میں ملا۔ 1946ء میں شوگر مل سیوہارہ میں فیٹر کی پوسٹ پر ملازمت شروع کی اور ساتھ ہی اپنے شعروں سے معاشرہ کو بھی فٹ کرتے رہے۔ فریب سحر، فریب نظر، انگوٹھا چھاپ، اگر برا نہ لگے اور دھندلا سویرا ان کی

تصانیف ہیں۔

15 اگست 1998ء کو ایوان غالب نئی دہلی میں ڈاکٹر منموہن سنگھ نے ہلال سیوہاروی کی کتاب ''اگر برا نہ لگے'' کا رسم اجراء کیا۔ اردو اکادمی دہلی کی جانب سے غالب انسی ٹیوٹ میں اس وقت کے نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے طنز ومزاح غالب ایوارڈ 88-1987 سے ہلال سیوہاروی کو نوازا تھا۔ 4 نومبر 2000ء کو نگینہ میں تنویر اختر کی کنویز شپ میں ''جشن ہلال'' منایا گیا، جس میں ملک کے نامور ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی تھی۔ ہلال سیوہاروی نے روس، انگلینڈ، پاکستان، متحدہ عرب امارات، قطر، عمان، فرانس وغیرہ ملکوں میں ہوئے مشاعروں میں شرکت کی اور اپنے کلام سے سامعین کو داد دینے کے لئے مجبور کیا۔ شہنشاہِ جذبات دلیپ کمار، جانی واکر سے ہلال سیوہاروی کے بیحد قریبی تعلقات تھے۔ ہلال کی آخری کتاب ''نقطۂ نظر'' میں 'اپنی بات' میں ہلال سیوہاروی نے لکھا ہے۔ ''نئی نسل کے نوجوان چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلم، سبھی اردو بولتے ہیں اور سمجھتے ہیں مگر بدقسمتی سے انھیں اردو پڑھنا اور لکھنا نہیں آتا ہے۔

دنیا میں جہاں جہاں بھی اردو پڑھی جاتی ہے اس کے نصاب میں ضلع بجنور کے اردو ادیبوں اور ان کے اہم تعاون اور تصانیف کو ضرور شامل کیا گیا ہے۔ ضلع بجنور کے ادیبوں پر بڑی تعداد میں تحقیقی مقالے لکھے جارہے ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی سیمناروں میں بھی بجنوری ادیب بحث کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔ آخیر میں اتنا کہنا درست ہوگا کہ بجنور ضلع کے اردو ادیبوں کا ادب میں اہم تعاون ہے، جو ناقابلِ فراموش ہے۔

سلیقے سے ہواؤں میں جو خوشبو گھول سکتے ہیں
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جو اردو بول سکتے ہیں

رابطہ: 9412326875

نئی تخلیقی حسیّت کا شاعر: سرور نگینوی

سرور نگینوی ضلع بجنور کا ہی نہیں بلکہ اردو ادب کے عصری منظر نامے میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ آپکا کلام ادبی رسائل وجرائد میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتا رہا ہے۔ آپ ۱۹۶۰ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ آپ قصبہ کوٹرہ نگینہ میں ۱۹۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ دس سال کی عمر میں اپنے والد حاجی عبدالرشید کے ساتھ جھریا ضلع دھن باد (جھارکھنڈ) چلے گئے۔ آپ نے جھریا ہی سے اپنا شعری سفر شروع کیا، وہ جھریا جہاں کوئلے کی کانیں ہیں۔ شان بھارتی، وقار قادری، آمر صدیقی، سرور نگینوی ہم پیالہ، ہم نوالہ رہے اور چاروں نے شعری سفر ایک ساتھ شروع کیا۔ اور اردو دنیا میں ایک ساتھ پہچان بنائی ہے سرور نگینوی ۱۹۶۲ء میں ماؔہر الحمیدی الہ بادی کے شاگرد بنے۔ ان کے مشورہ سے علامہ ابؔر احسنی گنوری سے اصلاح لی۔ ابؔر احسنی کے قتل کے بعد جناب مشیر جھنجھانوی سے مشورہ کرتے رہے اور انھوں نے دونوں سے اکتسابِ فن حاصل کیا۔

ان کا مجموعہ کلام ''بکھرا بکھرا لہجہ'' شائع ہوکر اردو دنیا میں مقبول ہوا۔ بقول ڈاکٹر توقیر احمد خاں، صدر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی ''سرور نگینوی نے اپنی شاعری میں گہرے شعور کا ثبوت دیا ہے۔ مشہور نقاد و شاعر پروفیسر عنوان چشتی نے کہا تھا کہ سرور نگینوی اردو کے ان مخلص شاعروں میں شامل ہیں جنھوں نے صلہ وستائش اور نام ونمود سے دور رہ کر اردو غزل کے نگار خانے میں اپنے خونِ جگر سے روشنی کی ہے۔''

سرور نگینوی نے اپنی شاعری میں اپنی زندگی کے تجربات کو بہت خوبصورتی کے ساتھ شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ وہ زندگی کے جملہ پہلوؤں کو نظر میں رکھتے ہیں انھوں نے ان گنت حقائق کی کیفیتوں کو خوبصورت لہجے میں شعری پیکر عطا کیا ہے۔ سرور نگینوی کی بلند خیالی، بے ساختگی، برجستگی، ندرت وجدت، وسعت وگہرائی، تجربات ومشاہدات کی عکاسی، جذبات ومحسوسات کی

آمیزش ان کے شعروں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ بقول ڈاکٹر خلیق انجم، ''سرور نگینوی کی شاعری میں اردو زبان اپنی پوری انفرادیت اور رعنائی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔''

سرور نگینوی اردو کے جاں نثاروں میں شامل ہیں۔ انھوں نے نگینہ سے پندرہ روزہ ''خواب زار'' تقریباً دس سال تک شائع کیا۔ سہ ماہی ''معمارادب'' بھی نکالا۔ اب دہلی سے روزنامہ ''شام کا ساتھی'' نکال رہے ہیں۔ اس طرح سرور نگینوی نے ایک صحافی کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت قائم کی۔ انھیں سیاست کا بھی شوق ہے۔ وہ سیاسی، سماجی طور پر بھی مصروفِ کار رہتے ہیں۔ وہ علمی وادبی کاموں میں بھی اپنا سرمایہء جاں لٹاتے رہے ہیں۔

میں نے سرور نگینوی سے ''اردو کی ترقی میں ضلع بجنور کا کردار'' موضوع دے کر ایک نظم کہنے کی گزارش کی۔ سرور نگینوی نے تیسرے دن نظم کہہ کر میرے حوالے کر دی نظم شاملِ اشاعت ہے۔ سادہ الفاظ تزئین کاری وپُر کاری سے مزیّن نظم ہمارے خوابوں، خیالوں کا ایک حصہ بن چکی۔ وہ شخصیتیں جن کا ذکر ہی کر کے نظم کو سدا بہار بنا دیا ہے۔ انھوں نے قائم چاند پوری سے لے کر تہذیب ابرار تک شعرا، ادبا کی خدمات اور ان کے کارہائے نمایاں کو اپنی فکری کاوش اور انفرادیت کے ساتھ نژادِ نو کو آگاہی دی ہے۔

تہذیب مٹ نہ جائے یہ اردو زبان کی
زندہ رہے زبان یہ ہندوستان کی

سرور نگینوی نے سیاسی، معاشی اور تہذیبی نقطہء نظر کے عمل سے گزرتے ہوئے اردو کی بقا اور اس کے فروغ کے لئے کمربستہ ہونے کی تلقین کی ہے غرضیکہ سرور نگینوی کی شاعری نئی تخلیقی حسیت اور ادبی شعور کی آئینہ دار ہے۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی

اردو کی ترقی اور ضلع بجنور

سرور نگینوی

اردو کے ارتقا میں یہ بجنور کا مقام
پیدا ہوئے ہیں کتنے ہی مہتابِ لالہ فام
آزادیٔ وطن میں بھی آئے ہیں کچھ تو کام
جینا جنھوں نے کر دیا انگریز کا حرام
جس دن سے ہفت روزہ مدینہ نکل گیا
ہندوستان سے گورا کمینہ نکل گیا

قائمؔ ہیں چاندپور کے رخشندہ ایک قمر
طرزِ جدا شکیلؔ کی اردو میں جلوہ گر
فکرِ معاش میں ہیں کئی لوگ اِدھر اُدھر
اسلمؔ ہیں اور شکیلؔ ہیں جاویدؔ اور نظرؔ
یہ لوگ جا بسے ہیں جو شہرِ نگار میں
اپنے وطن سے دور ہیں اردو کے پیار میں

....

قائم چاندپوری، شکیل جمالی، اسلم کرتپوری، اطہر شکیل، جاوید اختر، نظر بجنوری

رحمٰن کی نذیر کی حیدر کی بات ہو
ہاں بات اشک کی ہو کہ جوہر کی بات ہو
وہ گیان چندجین کی نشتر کی بات ہو
ارشدکمال کی ہو کہ افسر کی بات ہو
یہ باکمال لوگ ہیں اردو کے تاجدار
مخلص ہیں حق پرست ہیں اور ہیں وفا شعار

رفعت سروش ہوں کہ ہوں جوہر یا تاجور
ہیں یلدرم بھی نثر میں اردو کے راہبر
نکلا ہلال طنز ومزاح کی لئے سپر
روشن نے کر دیا جو نگینہ کو خوب تر
اردو ادب میں اخترالایمان کا مقام
افلاکِ اردو اس نے کیا اپنے زیردام

....

عبدالرحمٰن بجنوری، ڈپٹی نذیراحمد، سجادحیدریلدرم، مہیندراشک، چندرپرکاش جوہر، نشترخانقاہی،
افسرجمشید، محمدعلی جوہر، علامہ تاجور، ہلال سیوہاروی، روشن نگینوی

سیوہارہ جسکو کہتے ہیں قصبہ ہے اک قدیم
مقبولؔ ہیں نہالؔ ہیں ماہرؔ ہیں اور نسیمؔ
حاصل ہوئی ہے حفظؔ کو کیا شہرتِ عظیم
باغِ جہاں میں پھیلی ہے اس پھول کی شمیم
ملت کا درد دوستوں رو رو کے کہہ گیا
دریائے حق پرستی میں باطل تو بہہ گیا

ہاں دھامپور کو آج بھی شہرِ ادب کہیں
صفدرؔ، کفیلؔ کی جو تھی بزم طرب کہیں
حافظؔ، علیمؔ غزلوں کو کیا بے سبب کہیں
بسملؔ کی نعت ایسی جو اہلِ عرب کہیں
ارمانؔ ہیں نسیمؔ ہیں اعجازؔ بھی تو ہیں
بہزادؔ جیسے دیکھو سخن ساز بھی تو ہیں

....

مقبول سیوہاروی، ماہرالقادری، حفظ الرحمٰن سیوہاروی، صفدر دھامپوری، کفیل دھامپوری، حافظ سیمابی، علیم الدین، بسمل، ارمان دھامپوری، نسیم دھامپوری، اعجاز دھامپوری، بہزاد یوسف

مخزوںؔ نگینہ میں ہوئے اخترؔ بھی باوقار
دیکھو تو ان کا داغؔ کے حلقے میں تھا شمار
راہیؔ نے نورؔ نے بھی غزل کو دیا نکھار
شاکرؔ، سلامؔ اب بھی ہیں اردو کے شہسوار
شادابؔ اس ضلع کے ہیں ارشد ندیمؔ بھی
کچھ تو جدید لوگ ہیں اور کچھ قدیم بھی

جب بھی عزیزؔ نے کہیں چھیڑی کوئی غزل
آواز ایسی پیاری کہ ہر اک دل گیا مچل
مخمورؔ سے کہا تھا کہ اے دوست اب سنبھل
کس نے کہا شکیلؔ کی اب تو بھی راہ چل
کھایا تھا زخم دل پہ تو وہ دل جلے رہے
قطعہ کہا رباعی کہی مرثیے کہے

،فخرالدین مخزوں، سیداختر نگینوی، رئیس راہی، نورالدین فرشوری، محمد شاکر، عبدالسلام، شاداب ظفر، عزیز نہٹوری، شکیل رحمانی

پرویزؔ شیخؔ بھی تو ہیں اردو کے جاں نثار
داؤدؔ محترم سے ہے رنگینیٔ بہارؔ
عرفانؔ کا نام بھی تو ہے اردو میں پر وقار
حافظؔ بھی دیکھتے تھے سیاست کے تاجدار
سرورؔ کی ہے دعاء یہی قلبِ صمیم سے
وابستہ ہیں امیدیں ابھی کچھ وسیمؔ سے

اظہارؔ اثر نے نثر میں جادو جگا دیا
عشرتؔ نے بھی غزل کو مرصع بنا دیا
افضلؔ نے اپنے شعروں کو کیسا سجا دیا
شاکرؔ کی شاعری نے بھی تو سکہ جما دیا
ابرارؔ نے بھی شوق سے نعتِ نبی پڑھی
آئے ہیں یاد ہمکو بہت آج میرٹھی

پرویز عادل، شیخ نگینوی، داؤد ملتانی، بہار شمسی، پروفیسر عرفان، حافظ محمد ابراہیم، وسیم اقبال، اثر کرتپوری، عشرت کرتپوری، افضل کرتپوری، شاکر کرتپوری، ابرار کرتپوری، حفیظ میرٹھی،

شاعر بھی ہیں صحافی ہیں دیکھو اسد رضا
پھیلا رہے ہیں علم و ادب کی وہ اک ضیا
تحریر ان کی دیکھئے ہوتی ہے حق نما
مضمون ہو کہ شعر ہوں ہے رنگ اک سا
شعر و ادب کا سر میں ہیں سودا لئے ہوئے
ملتے ہیں روز ہم سے "سہارا" لئے ہوئے

اردو کے کنبے کی کبھی عترت کی بات کر
مینا کی بات کر کبھی نصرت کی بات کر
رہ کر وطن سے دور بھی قربت کی بات کر
ارشق کی کچھ جلیس کی الفت کی بات کر
فائق ہوں یا فروغ یا ماہر منڈاوری
مقبولِ عام اب ہے شناور کی شاعری

علینا عترت رضوی، مینا نقوی، نصرت مہدی، ارشق شیرکوٹی، جلیس نجیب آبادی، الفت نجیب آبادی، فائق کرتپوری، غلام حسین فروغ، شناور کرتپوری

منصورؔ ہے شفیقؔ ہے فاخرؔ ادیب ہے
فاروقؔ ہے شکیلؔ ہے یا کہ اریبؔ ہے
ایس، یو، ظفرؔ بھی دیکھئے کیا خوش نصیب ہے
ہر لمحہ دوستو وہ اناؔ کے قریب ہے
قاسمؔ وطن سے دور کراچی میں جا بسے
اُس پیکرِ خلوص نے ہجرت کے غم سہے

ارشادؔ نے سجائی تھی بزمِ سخن کبھی
اخترؔ سے سوز سے جو وہ مخفیؔ نہیں رہی
لکھی عزیزؔ نے بھی تھی اک نظم واقعی
لب خشک شاعروں کے تھے کچھ ایسی پیاس تھی
شہرِ نجیب آباد بہت پُر بہار ہے
ہاں شادؔ کی وہ تشنہ لبی یادگار ہے

علامہ منصور بجنوری، شکیل بجنوری، عبدالرحمٰن ادیب، ایس یو ظفر انا دہلوی کے شوہر، پیرزادہ قاسم، ارشاد نجیب آبادی، اختر ملتانی، سوز نجیب آبادی، رشید مخفی نجیب آبادی، عزیز نجیب آبادی، نریش کمار شاد

جب بھی رشیدؔ کا میں کہیں تزکرہ کروں
یعنی غمِ فراق میں دل مبتلا کروں
ناظمؔ، نویدؔ کے لئے دل اپنا وا کروں
طیبؔ تمہارے واسطے بولو میں کیا کروں
تہذیبؔ مٹ نہ جائے یہ اردو زبان کی
زندہ رہے زبان یہ ہندوستان کی

بجنور نے دئے ہیں وہ اردو کے جاں نثار
اردو زباں پہ جن سے کہ آیا ہے اک نکھار
دیکھو نظم ونثر میں چھائی ہے اک بہار
خالدؔ نے پا لیا عجب تحقیق میں وقار
بجنور وہ ضلع ہے اردو کا ہمنشیں
سرورؔ تلاش کرنے سے ملتا نہیں کہیں

رابطہ:7417195769

رشید نجیب آبادی، ناظم اشرف،، ابوذرنوید، طیب آزاد شیرکوٹی، تہذیب ابرار، خالد علوی، سرور نگینوی۔

مقناطیسی شخصیت۔ معین شاداب

معین شاداب ایک ایسا نام ہے جو اس شخصیت سے منسوب ہے جو ٹی وی کے ناظرین، مشاعروں کے سامعین اور ادبی دنیا کے شائقین میں بے حد مقبول ہے اور نہ صرف برصغیر ہندوپاک میں بلکہ دنیا بھر میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ نہایت موزوں آواز، مخصوص انداز بیاں، بے حد نرم خو اور جاذب نظر خدوخال کے حامل معین شاداب کا اصل نام معین اختر ہے۔ 1971 میں موضع روانہ شکار پور تحصیل دھام پور میں ایک متوسط گھرانہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام محمد حنیف اختر تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد گریجویشن مہاراجہ ہریش چندر ڈگری کالج مراد آباد سے کیا۔ اس کے بعد ایم اے اردو کیا اور ایم فل کے لئے 'آزاد غزل ایک مطالعہ' کا موضوع لیا۔ شاعری کی طرف رجحان گیارہ برس کی عمر سے تھا۔ گریجویشن کے دوران معین شاداب نے باقاعدہ شاعری شروع کی

معین شاداب کا شمار عہد حاضر کے تازہ کار اور تازہ دم شعراء میں ہوتا ہے۔ پیشہ سے وہ صحافی ہیں، لیکن مشاعروں میں نظامت کے حوالہ سے انھوں نے اپنی ایک مخصوص شناخت قائم کی ہے۔ معین شاداب بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ لیکن دیگر اصناف سخن میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ نثر بھی بہت عمدہ لکھتے ہیں ملک اور بیرون ممالک کے موقر جرائد میں ان کی تخلیقات اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ معین شاداب ان دنوں سہارا انڈیا پریوار سے وابستہ ہیں جہاں اردو نیوز چینل عالمی سہارا نیوز اینکر اور پروڈیوسر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ دور درشن میں بھی اردو نیوز اناؤنسر، نیوز ریڈر کے طور پر کام کر چکے ہیں معین شاداب پرنٹ میڈیا میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھا چکے ہیں روزنامہ راشٹریہ سہارا نئی دہلی، بزم سہارا، اخبار مشرق دہلی، ان

دنوں دہلی، آئینہ عالم مرادآباد، یگ بندھو (ہندی) مرادآباد، ہندی روزنامہ بجنور ٹائمس جیسے مختلف اخبارات ہفتہ روزہ جرائداور ماہناموں میں اپنی صلاحیتوں کو بروکارلا چکے ہیں۔ زبان وقلم کی وجہ سے کئی قومی سطح کے ایوارڈ سے سرفراز بھی ہو چکے ہیں۔ یہ فرزند بجنور برصغیر پاک ہند کے علاوہ بیرون ملک ادبی دنیا میں بحثیت شاعراور کامیاب ناظم پہچانا جاتا ہے۔

کس قدر آسان ہوتا وصل پھر اس کا مرا
کاش وہ لوہے کا ہوتا اور مقناطیس میں

(معین شاداب)

ڈاکٹرشیخ نگینوی

بجنور کا شعری احساس و آہنگ

ڈاکٹر معین شاداب

اسطوری سرزمین بجنور اپنی تخلیقی ذہانت اور علمی ذکاوت کے اعتبار سے ایک الگ حیثیت کی حامل ہے۔ کوہ ہمالہ کے دامن میں آباد یہ سرسبز و شاداب خطہ زرخیز بھی ہے اور مردم خیز بھی۔ یہ رشیوں، منیوں کی وہ پوتر دھرتی ہے جہاں کا نانگل آشرم ہندوستانی دیومالا کا ایک زریں باب ہے۔ جہاں مہارشی وشوامتر کی تپسیا بھنگ کرنے اور انھیں پریم امرت چکھانے کے لیے آکاش لوک کی حسین ترین اپسرا مینکا اتاری جاتی ہے۔ جہاں کالی داس کے شہرۂ آفاق ڈرامے کی مرکزی کردار مجسمہ حسن شکنتلا جنم لیتی ہے۔ دھرت راشٹر کے ہستنا پور کے نزدیک بسے ہوئے بجنور کی ودر کٹی میں جیون کی مہابھارت سے تھکے انسان آج بھی من کی شانتی ڈھونڈتے ہیں۔ آب رود گنگا اور رام گنگا کی دھارا سے سیراب ہوتا بجنور، صرف لہلہاتی فصلوں اور صنعت و حرفت کے لیے مشہور نہیں، بلکہ روہیل کھنڈ کے اس چھوٹے سے ضلع نے علم و فضل شعر و ادب، سائنس و تکنالوجی اور تاریخ و فلسفہ کی ایسی ایسی بڑی شخصیتوں کو جنم دیا ہے کہ ایک ایک نام اپنے آپ میں مکمل ادارہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہ ضلع ہے جو 1857 کی بغاوت اور 1947 کی تحریک آزادی کے لیے ایک سے ایک عظیم سپوت وطن عزیز پر نچھاور کرتا رہا۔ یہ سرزمین یکجہتی کی علمبردار ہے، امن و آشتی کا گہوارہ ہے، قومی اتحاد کی پہچان ہے۔ محبت وطن اور جیالوں کی دھرتی ہے۔ اپنی کشور آرائی کے لیے ہندو مسلمانوں میں نفاق پیدا کرنے کی انگریزوں کی کوشش کے باوجود یہاں کے لوگوں نے ہمیشہ اتحاد و یکجہتی کا مظاہرہ کیا۔

جدوجہد آزادی میں ضلع بجنور کے مثالی کردار کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سرسید ''اسباب بغاوت ہند'' قلم بند کرتے ہیں تو ''سرکشی ضلع بجنور'' ایک الگ باب بن جاتی

ہے۔ مہاتما گاندھی نے اپنی کتاب 'سوراج' میں ہندوستان چھوڑو تحریک میں بجنور کے کردار کا اعتراف کیا ہے۔ بجنور کا شاید ہی کوئی شہر اور قصبہ ایسا ہو جس نے کسی نہ کسی شعبہ میں کوئی تاریخ رقم نہ کی ہو۔ اس ضلع کا قصبہ باسٹہ، ابوالفضل اور فیضی جیسی ذہانتوں کا حوالہ بن جاتا ہے، جنھیں اکبر اعظم اپنے نورتنوں میں شامل کرتا ہے۔ نگینہ، شیرکوٹ اور دھامپور کے آہن گر آزادی وطن کی خاطر دشمنوں سے مقابلے کے لیے توپیں ڈھالتے ہیں۔ سہسپور کرنل ظفر وارثی جیسا جیالا پیدا کرتا ہے جو سینا میڈل سے سرفراز ہوتا ہے۔

بنارس یونیورسٹی کا نقشہ بنانے والے جوالا پرساد کا تعلق بھی بجنور سے ہے جنھیں ہندوستان کا اولین چیف انجینئر ہونے کا افتخار حاصل ہوا۔ ڈاکٹر آتما رام (چاندپور) سیرے مک گلاس کے موجد کہلائے۔ ڈاکٹر حسن نعیم (سیوہارہ) انٹارکٹا میں ہندوستانی پرچم لہرانے والے مہم جوؤں میں شامل رہے۔ یہ ضلع ہندوستان کو شانتی بھوشن (بجنور) جیسا وزیر قانون، مہاویر تیاگی (دارانگر گنج) جیسا وزیر دفاع، خواتین ہاکی ٹیم کو رضیہ زیدی جیسی گول کیپر، ڈاکٹر حنیف بیگ (منڈاور) جیسا سرجن، ڈاکٹر راج ویر جیسا ماہر اطفال اور ڈاکٹر محسن ولی جیسا ماہر امراض قلب عطا کرتا ہے۔ زنجیر، لاوارث، ہیرا پھیری اور مقدر کا سکندر جیسی مقبول فلموں کے پرڈیوسر پرکاش مہرہ بھی اسی دھرتی کے سپوت ہیں۔ مولانا مجید حسن کے اخبار ''مدینہ'' نے صحافت کی ایک نا قابل تسخیر تاریخ رقم کی ہے۔ مولوی مظہر الدین (شیرکوٹ)، فتح چند شرما (بجنور)، پنڈت دیودت شرما، دنیائے صحافت کے تابندہ نام ہیں۔ ٹائمز آف انڈیا جیسے بڑے انگریزی روزنامے کے مالکان کا وطن (نجیب آباد) ہونے کا شرف بھی بجنور کو حاصل ہے۔

مولانا حالی کی تصنیف 'حیات جاوید' کے مطابق ارض بجنور پر ہی سرسید نے دو مبارک خواب دیکھے تھے جن میں انھیں سرور کائنات پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور علی مرتضیٰ کا دیدار نصیب ہوا۔ نجیب آباد کے قریب واقع جوگی رم پورہ کو نجف ہند کا درجہ حاصل ہے۔ حضرت علی کی یہ درگاہ عقیدتوں کا بے مثال مرکز ہے۔ حبیب والا کے نزدیک بہنے والی پاؤں دھوئی ندی صوفی بزرگ شیخ حبیب اللہ کے کمالات کی یاد تازہ کراتی ہے۔

شعر وادب کے حوالے سے ضلع بجنور تخلیقی ترفع کا حامل ہے۔ اگر مردم خیز خطوں کا ایک سخت ترین انتخاب بھی کیا جائے تو اس میں سرزمین ضلع بجنور سرفہرست ہوگی۔ اس ضلع نے جو سوچا وہ پوری دنیا میں صدائے بازگشت بن گیا، جو لکھا وہ حرف آخر کی شکل اختیار کر گیا۔ دیوان غالب کو الہامی کتاب کا درجہ اسی ضلع نے دیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا یہ جملہ کہ ''ہندوستان میں الہامی کتابیں دو ہیں ایک وید مقدس اور دوسری دیوان غالب'' اردو تحقیق وتنقید کا ایک ناگزیر حوالہ بن گیا ہے۔ ایک طرف اگر عبدالرحمٰن بجنوری غالب کی اہمیت کو لازوال کر دیتے ہیں تو دوسری طرف عبدالصمد صارم (سیوہارہ) مصحفی کو اردو کا سب سے بڑا شاعر قرار دیتے ہوئے ان کا مرتبہ طے کرتے ہیں۔ پروفیسر خورشید الاسلام (سیوہارہ) مرزا ہادی رسوا کے ناول ''امراؤ جان ادا'' کو لافانی بنا دیتے ہیں۔ پنڈت پدم سنگھ شرما نے اپنی ناقدانہ بصیرت سے ہندی کوی بہاری کی بلند مقامی کا عرفان کرایا۔ ان کی خطوط نگاری کو ہندی ادب میں قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ راج پور نوادہ کے دشینت کمار ہندی ادب میں غزل کو متعارف کرا کے ہندی غزل کے امام کہلاتے ہیں۔ ''مخزن نکات'' کے مصنف قائم چاند پوری کسی چھوٹے قصبہ کے پہلے ایسے بڑے شاعر ہیں جن کا تذکرہ صف اول کے اساتذۂ فن میں ہوتا ہے۔ مولانا ارشق شیرکوٹی کی مغلیہ دور کی منظوم تاریخ اپنی مثال آپ ہے۔

ریہڑ میں اردو کا پہلا ناول نگار پیدا ہوتا ہے۔ شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد کے ناول 'مراۃ العروس'، 'بنات النعش'، 'توبۃ النصوح' اور 'ابن الوقت' جیسے شاہکار اپنی مثال آپ ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کا تخلیق کیا ہوا کردار مرزا ظاہر دار بیگ افسانوی ادب کا ایک لافانی کردار ہے۔ گھر سے فرار ہو کر 'ایک لڑکا' اختر الایمان زندگی کی تلاش کا استعارہ بن جاتا ہے۔ سجاد حیدر یلدرم (نہٹور) سے رومانی افسانے کا سفر شروع ہوتا ہے۔ رستم علی تاریخی ادب کے اولین مصنفین میں شمار ہوتے ہیں۔ اکبر شاہ خاں کی تاریخ اسلام اساسی اہمیت کی حامل ہے اور قرۃ العین حیدر (نہٹور) جیسی شخصیت صدیوں میں ایک آدھ ہی پیدا ہوتی ہے۔ یہ وہ ضلع ہے جس سے انگلینڈ کی ملکہ وکٹوریہ اردو اور فارسی سیکھتی ہیں۔ منڈاور کے منشی شہامت علی کو ملکہ کے اتالیق کے طور پر انگلینڈ مدعو کیا گیا تھا۔

ضلع بجنور نے قابل ذکر علما اور مذہبی شخصیات بھی پیدا کیں۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی جیسی عظیم شخصیت کے علاوہ اور بہت سے علما ہیں جن کے وجود سے بجنور کو تابندگی حاصل رہی ہے۔ مولانا مرغوب الرحمٰن دنیا کی عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے۔ بے پناہ صلاحیتوں کے مالک، کئی دینی کتابوں کے مصنف اور انتظامی صلاحیتوں سے مالامال مولانا ریاست علی بجنوری کے تصنیفی وتالیفی کمالات کون فراموش کرسکتا ہے۔ مفتی جلیل احمد نے دینی ومذہبی خدمت کے ساتھ سیاسی میدان میں بھی باوقار موجودگی درج کرائی۔ وہ اتر پردیش کے اسمبلی ممبر رہے۔

بجنور شروع سے ہی مضبوط شعری روایت کا حوالہ رہا ہے۔ ناخدائے سخن میرؔ کے ہم عصر قائم چاند پوری، شاہ نامۂ اسلام کے خالق اکبر شاہ خاں، انقلابی شاعر رئیس الاحرار مولانا محمد علی خاں جوہر، بلیغ الملک علامہ تاجور نجیب آبادی، عظیم نظم گو شاعر اختر الایمان، نئی غزل کے پیش رو دشینت تیاگی، جدید شاعری کے علمبردار نشتر خانقاہی جیسے یہ چند نام ہی بجنور کی شعری عظمت کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔ جبکہ ان کے علاوہ بھی خاطر خواہ تعداد میں ایسے شعراء کا خمیر اس مٹی سے اٹھا ہے جنھوں نے دنیائے ادب میں پورے وقار اور اعتبار کے ساتھ اپنی موجودگی درج کرائی ہے۔ سیماب اکبر آبادی کے شاگرد حافظ سیمابی دھام پوری جن کی نظمیں نصاب میں شامل ہیں۔ علامہ ارشق شیر کوٹی جن کے شاگرد برصغیر کے مختلف شہروں میں موجود ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم جنھوں نے صاحب طرز نثر نگاری کے طور پر اپنی شناخت قائم کی۔ ڈپٹی نذیر احمد کے فرزند بشیر احمد کے علاوہ پرکاش چند جین مونسؔ، فرخ نگینوی، محمد یامین خاں شوق بجنوری، عشرت کرت پوری، اظہار اثر، رفعت سروش، بے خود نگینوی، چندر پرکاش جوہر بجنوری، ہلال سیوہاروی اور اسی قبیل کے اور نہ جانے کتنے نام ایسے ہیں جنھوں نے بجنور کے شعری ارتقا میں قابلِ ذکر کردار نبھایا اور مقبولیت بھی حاصل کی۔ اور آگے بڑھیے تو غزاں بجنوری، صوفی زم زم بجنوری، منشی ولایت حسین ولایت، قیام بجنوری، شیون بجنوری، افسر جمشید، منشی بشیر احمد الفت نجیب آبادی، شکیل رحمانی، راہی حمیدی، گوہر نور پوری، مختار زنجانی، کفیل دھام پوری، جنوں سہسپوری، کلیم سیوہاروی، عاصی سیوہاروی وغیرہ

وغیرہ ایسے بہت سے شعرا ہیں جو اپنے حصے کی ذمہ داری خوبی کے ساتھ نبھا کر رخصت ہو گئے۔

ضلع بجنور کے حالیہ شعری منظرنامے پر اگر نظر ڈالی جائے تو آج بجنور میں شکیل بجنوری، اثر ایوبی، ولی بجنوری، انور بجنوری، فاخر ادیب، قاضی ابرار کرت پوری، نجیب آباد میں جلیس نجیب آبادی، مرغوب علی، مہندر اشک، عزیز نجیب آبادی، دھام پور میں یوسف بہزاد، شیر کوٹ میں طیب آزاد، سیوہارہ میں قمر سیوہاروی، عتیق ماہر، یونس نوید، چاند پور میں شکیل جمالی، پرویز اختر، نور پور میں شاہد انجم، زبیر نور پوری، ریاض حنفی، علی اکرم۔ نہٹور میں عزیز نہٹوری، بینا نہٹوری، کرت پور میں شناور کرت پوری، فیضان کرت پوری، واجد جمال، عدیل تابش، ارشد ندیم، سہسپور میں کفیل سہسپوری، حکیم نعمان عادل، نعیم ناداں، اطہر آزاد سہسپوری، نفیس انجم، شفیق مہر، تہذیب ابرار وغیرہ اپنے اپنے علاقے کی بھرپور نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔

ضلع بجنور کے صرف شہر اور قصبات ہی نہیں بلکہ یہاں کے مواضعات میں بھی صاحبان علم وفضل پیدا ہوئے ہیں اور یہ تسلسل اب بھی قائم ہے۔ اختر الایمان نجیب آباد کے نزدیک چھوٹی سی بستی راہو کھیڑی (جلال آباد) میں پیدا ہوئے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی پیدائش تحصیل دھام پور کے قصبہ ریہڑ کی ہے۔ دشینت نے تحصیل نجیب آباد میں ناگل کے نزدیک موضع راج پور نوادہ میں آنکھیں کھولیں۔ اسی طرح عصرِ حاضر میں معروف عالم دین اور ادبی شخصیت مولانا ریاست علی ظفر بجنوری اور انجینئر سمیع الدین کا تعلق تحصیل دھام پور کی مردم خیز بستی حبیب والا سے ہے۔ اسی تحصیل کے موضع سرکڑہ چکرا جمل میں مفکرِ اسلام اور ادیب وشاعر سراج الدین ندوی کے علاوہ فخر الدین فخر اور یٰسین ذکی وغیرہ سخنوری میں منہمک ہیں۔ دھام پور کے نزدیک نیندڑو کی شناخت کا ایک روشن حوالہ صحافی اور شاعر ایم اے کنول جعفری ہیں۔ یہاں حافظ ہلدوانوی اور معصوم نیندڑوی کے علاوہ ڈاکٹر رفعت بھی ادبی ذوق کے مالک ہیں۔ ماضی میں یہاں تمنا نیندڑوی اور اثر نیندڑوی کے نام ملتے ہیں۔ کرت پور کے نزدیک میمن سادات میں قیصر زیدی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں اور بھنیڑہ سادات کے گلشن بجنوری معروف نام ہے۔ ساہن پور مانی جائسی کے شاگرد استاذ شاعر شوق مانوی کی جائے ولادت جو سہارنپور جا بسے۔ ان کے

صاحبزادے جمیل مانوی بھی وہیں آباد ہیں۔ اخگر جلال آبادی اور غیاث جلال آبادی کے جلال آباد کو اظہار جلال آبادی، شاد جلال آبادی اور وفا جلال آبادی نے شمع سخن سے روشن رکھا ہے۔ سیوہارہ کے نزدیک ملک پور بڈھیرن میں پیدا ہونے والے یونس نوید اور مبارک پور گڈھی کے قاری عثمان اعظم نے سخن کی نئی بستیاں آباد کیں ہیں۔ پرگنہ سیوہارہ کے موضع ردانہ میں ادب کا خاصا ذوق ہے۔ یہاں استاد شاعر جمیل اختر روانوی کے علاوہ محمد احمد دانش روانوی، نعیم حیدر، اسلم بدر، نزاکت روانوی، قمر الدین قمر، اسلم ذکی وغیرہ مشق سخن کر رہے ہیں۔ عبدالحکیم شبنم، منشی محمد فاروق محشر اور کلیم اختر ماہر بھی یہاں کی شناخت تھے جو اس دارِ فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔ راقم الحروف (معین شاداب) کا تعلق بھی اسی بستی سے ہے۔

رابطہ:09868123629

انجینئر محمد سمیع الدین۔ایک محقق

یوپی کے ضلع بجنور میں نگینہ۔دھام پور شہروں کے درمیان واقع موضع حبیب والاعرف حسین پور حمید ایک مردم خیز بستی ہے۔اس بستی کو حضرت شیخ حبیب اللہ اوران کے فرزند اکبر علامہ شیخ عبدالحمید نے 1613 میں آباد کیا۔اس چھوٹی سی بستی میں نہ جانے کیسی کشش تھی اور نہ جانے کون سی قدریں تھیں کہ مختلف قصبات شہروں سے متعدد سید،صدیقی،فاروقی اور انصاری خاندان سب عرب النسل سمٹ سمٹ کراس موضع میں رہائش اختیار کرنے کے متمنی اور خواہاں نظر آتے تھے۔

اس موضع کے رہنے والوں کی اولادیں اپنے علم ودانشوری کی وجہ سے دنیا بھر میں پھیلی اور اعلیٰ مقام حاصل کیئے۔انہی بزرگوں کی اولاد میں 1940 میں محمد سمیع الدین کی ولادت با سعادت ہوئی۔ابتدائی تعلیم حبیب والا،دھامپور اور آخر میں بی ایس سی سول انجینئر کی ڈگری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی اور محکمہ آب باشی یوپی میں انجینئر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

محمد سمیع الدین بنیادی طور پر ایک انجینئر ہیں اور ایک انجینئر سے اسلامیات،تصوف، سفرنامہ،تاریخ اور اردو ادب جیسے موضوعات پر طبع آزمائی کی توقع کم ہی کی جاسکتی ہے۔لیکن ان کا کام ادب اور تصوف و تاریخ کے حوالہ سے بہت اہم ہے۔جو شخص بھی ان کی کتابیں لیتا ہے وہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔خاص طور پر تین جلدوں پر مشتمل "تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ" انجینئر محمد سمیع الدین کا لاثانی کام ہے۔کہکشاں،آبگینہ،پریچ پیچ،در بے بہا،تاریخ راپڑی،تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ(پانچ جلدوں میں) حبیب الانساب،گرد سفر،قائم چاند پوری،تحفہ رحمانی،قصہ پائل،قصہ سفیدوں اور اس کی عظمت پارینہ،کلیات ہلال سیوہاروی وغیرہ انجینئر محمد سمیع الدین کی تصانیف ہیں جو اردو ادب میں قیمتی اضافہ ہے۔عمر کے اس پڑاؤ پر بھی انجینئر محمد سمیع الدین کا قلم پورے جوش خروش کے ساتھ جاری ہے اور آئندہ دنوں میں ان کی تحقیق اور علم کیا کیا تاریخ مرتب کرے گی یہ وقت کے ہاتھوں میں ہے۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی

اردو کی ترقی میں ضلع بجنور

انجینئر محمد سمیع الدین

ضلع بجنور جس علاقے میں واقع ہے اس کا آٹھویں صدی عیسوی سے کٹیہر ["کٹیہر ین راجپوتوں" کی نسبت سے] نام ہونے کا پتہ چلتا ہے جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط سے روہیل کھنڈ ["روہیلہ پٹھانوں" کی نسبت سے] کہلانے لگا۔ برٹش دورِ حکومت میں روہیل کھنڈ کو "United Provinces of Agra & Oudh (U.P)" میں ضم کر دیا گیا۔

دورِ اکبری [1605.1555] میں یہ ضلع سرکار (ضلع) سنبھل کا ایک حصہ ہوا کرتا تھا۔ دورِ شاہجہانی [1657.1626] میں "کٹیہر ین" سردار، راجہ رام سنگھ نے بغاوت کی جس کا 1636 میں قلع قمع سنبھل کے صوبیدار، رستم خاں فیروز جنگ نے کیا اور مرادآباد شہر وجود میں آیا [تفصیلات کے لئے احقر کی کتاب "تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ" (جلد اوّل) ملاحظہ فرمائیں]۔

1817 [برٹش دورِ حکومت] میں شمالی مرادآباد کے لئے پہلا کلکٹر مقرر کیا گیا۔ جس کا ہیڈ کوارٹر قصبہ نگینہ رکھا گیا۔ لیکن نگینہ کی Drainage تسلی بخش نہ ہونے کی وجہ سے جلد ہی 1824 میں) قصبہ بجنور ہیڈ کوارٹر کر دیا گیا۔ تبھی سے کلکٹر کا ہیڈ کوارٹر بجنور اور اس کی نسبت سے ضلع کا نام بجنور ہے۔

بجنور ضلع یو۔ پی [آزادی کے بعد سے "یونائیٹیڈ پروانسیز آف آگرہ اینڈ اودھ" کا نام بدل کر اتر پردیش کر دیا گیا ہے لیکن دونوں کا مخفف ایک ہی، یعنی یو۔ پی ہے] کے شمال۔ مغربی اضلاع میں سے، دریائے گنگا کے بائیں کنارے پر واقع ایک نہایت ہی سرسبز و شاداب اور قدرتی وسائل سے مالامال ضلع ہے۔ یہاں کی مٹی نہایت ہی زرخیز (زراعت و شجرکاری/ باغبانی، دونوں

کے لحاظ سے) اور آب و ہوا بہت صحت بخش ہے۔ ہر فصل میں کھیت دل کھول کر غلہ اگلتے ہیں۔ چہار جانب پھلدار (بالخصوص آم اور امرود) باغات کا لامتناہی سلسلہ آنکھوں کو فرحت بخشتا ہے۔ کچھ علاقوں میں خودرو قیمتی جڑی بوٹیاں بھی وافر مقدار میں اگتی ہیں حالانکہ اب چپہ چپہ پر کاشت کیے جانے، چکبندی ہو جانے اور کیمیاوی کھاد کے استعمال کی وجہ سے ان میں بتدریج کمی واقع ہوتی جارہی ہے۔

کھیتوں اور باغات کو سیراب کرنے کے لئے پورے ضلع میں سرکاری ٹیوب ویلوں کا ایک جال سا بچھا ہے۔ ان کے علاوہ دو قدیم نہری نظام [''نگینہ نہری نظام'' اور ''نہٹور نہری نظام''] بھی موجود ہیں۔ اب مزید دو جدید نہری نظاموں [''ایسٹرن گنگا کینال سسٹم'' (ہردوار کے پاس، دریائے گنگا کے بائیں کنارے سے نکلنے والا) اور ''مدھیہ گنگا کینال سسٹم'' (اسٹیج II) (بجنور کے پاس، دریائے گنگا کے بائیں کنارے نکلنے والا سسٹم)] کا بھی قیام عمل میں آگیا ہے۔

مذکورہ قدیم نہری نظام کی تفصیلات بہت دلچسپ ہیں۔ 1824 میں شمالی علاقے کو آبپاشی کی سہولت بہم پہنچانے کی غرض سے کلکٹر نے ایک منصوبہ گورنر جنرل کو ارسال کیا۔ گورنر جنرل نے منصوبہ کا جائزہ لینے کے لئے 1831 میں اس کو سپرنٹنڈینٹ ''بریلی کینالس'' بریلی کو بھیج دیا۔ اس پر 1836 میں ایک تفصیلی رپورٹ تیار کی گئی جس کے تحت کھوندی پر، قصبہ قادر آباد کے قریب ایک ویَر (Weir) بنانے کا منصوبہ تجویز کیا گیا۔ 1638 میں اس منصوبہ کو حکومت سے منظوری حاصل ہوگئی اور پھر 1640 میں محض 57843 روپیہ لاگت سے ''نگینہ نہری نظام'' (ایک weir اور ۳۹،۲۰ کلو میٹر لمبی نہریں) کی تعمیر مکمل ہوگئی اور اسی سال سے نہری پانی کاشتکاروں کو مہیا کرایا جانے لگا۔ یہ نہایت ہی دلچسپ ہے کہ شروع میں یہ نظام سپرنٹنڈینٹ ''بریلی کینالس'' بریلی کے تحت ایک اورسیر (Overseer) کے چارج میں رہا۔ لیکن 1845 میں اس کو کلکٹر بجنور کی تحویل میں دے دیا گیا۔ جس نے تحصیلدار نگینہ اور دھامپور کی مدد سے اس نظام کو چلایا۔ اس نظام کے تحت، مذکورہ weir کی مدد سے کھوندی کا پانی ایک ''فیڈر نہر'' کے ذریعہ سنکھر وندی میں ڈالا جاتا ہے۔ جس مقام پر کھوندی کا یہ پانی سنکھر وندی میں آتا ہے، وہاں اس کے نیچے کی جانب،

سُکھرؔ وندی پر بھی ایک weir تعمیر کیا ہوا ہے۔ جس کی مدد سے یہ پانی سُکھرؔ وندی کے داہنے کنارے سے ایک ''سپلائی نہر'' کے ذریعہ پلکھنؔا نالے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ موضع جوگی رمپورہ کے پاس اس نالے پر ایک ''کراس ریگولیٹر'' بنا ہوا ہے جس کی مدد سے بالآخر یہ پانی ''نگینہ مین کینال'' میں آجاتا ہے۔

مذکورہ ''نگینہ نہری نظام'' کے بعد 1849.50 میں ''نہٹور نہری نظام'' کی تجویز پیش کی گئی۔ اس کی منظوری کے بعد 1850 میں 12123 روپیہ کُل لاگت سے یہ نہری نظام بھی مکمل ہوگیا۔ اس کے تحت قصبہ نہٹورؔ کے پاس، گانگن ندی پر ایک ''بیراج'' (Barrage) اور ساڑھے تیرہ کلومیٹر لمبی نہروں کی تعمیر کا کام کیا گیا۔ اس نہری نظام سے متعلق ''بیراج'' کی حالت اب نہایت تشویش ناک ہے۔ 1994 میں احقر کی پہل پر اس ضمن میں سرکاری سطح پر سینئر انجینئرس کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس نے کافی غور و خوض کے بعد اس کو ناقابلِ استعمال قرار دے دیا۔ اگر وقت رہتے اس رپورٹ پر عمل نہ کیا گیا تو کبھی بھی، کوئی بھی اچانک سنگین حادثہ پیش آسکتا ہے۔ جس سے جان و مال، دونوں طرح کا نقصان ہوسکتا ہے۔

علاقے میں مذکورہ نہری نظاموں کے علاوہ کئی چھوٹی بڑی ندیاں بھی رواں دواں ہیں جن میں سے دریائے گنگا، دریائے رام گنگا، کھوندی، مالن ندی اور گانگن ندی قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ دریائے گنگا پر (قصبہ بجنور کے پاس)، ''گنگا بیراج''؛ دریائے رام گنگا پر ''رام گنگا بیراج'' اور کھوندی پر (قصبہ شیرکوٹ کے پاس) ''کھو بیراج'' واقع ہیں۔ ''کالا گڑھ ڈیم'' بھی اس (ضلع) کی سرحد پر واقع ہے۔ ان سب کے علاوہ علاقے کے اندرونی حصے میں کافی کچھ تالاب واقع ہیں۔ چنانچہ ندیوں، Reservoirs اور تالابوں میں پانی کی موجودگی؛ باغات میں پھلوں اور کھیتوں میں غلّے کی فراوانی کے سبب پیڑوں پر گھونسلے بنا کر ان میں انڈے دینے اور بسیرا کرنے والے، پانی میں اور اس کے کنارے رہ کر اپنی خوراک تلاش کرنے والے؛ غرضیکہ سبھی قسم کے پرندوں کے لئے یہ علاقہ جنّت سے کچھ کم نہیں ہے۔ فضا میں ہمہ وقت رنگ برنگے، قسم قسم کے پرندے قطار در قطار اڑتے اور نغمہ خواں رہتے ہیں۔ [تفصیلات کے لئے احقر کی کتاب ''تذکرہ

گنج ہائے گراں مایہ" (جلد دوئم) ملاحظہ فرمائیں]۔

میرے ایک سرسری اندازہ کے مطابق یہ علاقہ زیرِ زمیں معدنیات سے بھی مالا مال ہے جن کا ابھی تک سرکاری سطح پر کوئی تجزیہ/تجربہ نہیں کیا گیا ہے۔ میں نے خود قادر آباد کے نزد، کھوندی کے ریت میں سے لوگوں کو سونے کے ذرّات تلاشتے دیکھا ہے۔

مذکورہ قدرتی وسائل کے علاوہ یہ علاقہ تاریخی اعتبار سے بھی تینوں فرقوں (بودھ، ہندو اور مسلم) کے لئے نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ آج بھی سلطان الشہداء سید سالار مسعود غازیؒ کی یاد میں ضلع کے مختلف مقامات [نگینہ، نجیب آباد، کرتپور، منڈاور، دھامپور، نہٹور، شیر کوٹ اور افضل گڑھ وغیرہ قصبات] پر (تاریخ مقررہ کو) بہت جوش وخروش سے "نیزے" کے نام سے "گنگا۔ جمنی" تہذیب کے علمبردار عوامی میلوں کا انعقاد ہوتا ہے۔ [تفصیلات احقر کی کتاب "سلطان الشہداء" میں ملاحظہ فرمائیں]۔

742ھ (1341) میں مشہور عرب سیاح، ابن بطوطہ کا اس ضلع سے گزر ہوا۔ اس نے اپنے سفرنامے میں علاقے کو سیراب کرنے والے ایک دریا، رام گنگا کا واضح الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

801ھ (1398) میں دلّی کو تہ وبالا کرنے کے بعد امیر تیمور اسی علاقے سے دریائے گنگا کے کنارے کنارے ہردوار ہوتا ہوا اپنے وطن واپس لوٹا تھا۔ ضلع کے تقریباً ہر قصبے میں مسلم حکمرانوں ["دلّی سلطنت" اور "مغل دورِ حکومت"] کی بنوائی ہوئی مساجد موجود ہیں جن سے علاقے میں ان کی دلچسپی کا عندیہ ملتا ہے۔

مہاراجہ بھرت جن کے نام پر اس ملک کا نام بھارت ورش ہوا، کی والدہ شکنتلا اسی ضلع کی حدود میں پیدا ہوئی تھیں۔ اسی ضلع کے پرگنہ باشٹہ میں ایک قدیم مندر (سیتابانی کے مقام پر) سیتاجی کی یادگار ہے جہاں سیتاجی کا آگ سے purification (اگنی پریکچھا) ہوا تھا۔ کالی داس نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "شکنتلا" میں جس مالنی ندی کا ذکر کیا ہے وہ اسی ضلع سے رواں دواں دریائے مالن ہے۔ دریائے گنگا کے کھادر میں واقع موضع ٹیپ کے نواح میں راجہ کشن واسودیو اور

اس کے بعد کشان راجاؤں کے زمانے [۶۰۶ ق م تا ۶۴۷ ق م] کے سکّے بھی علاقے میں پائے جا چکے ہیں۔ راجہ ہرش وردھن کے عہدِ حکومت [606 تا 648] میں چینی سیاح، ہیوان سانگ ہندوستان آیا۔ اس نے موتوپولو کے نام سے جس جگہ کا ذکر کیا ہے وہ اسی ضلع میں قصبہ منڈاور ہے (قدیم مخطوطات میں اس کو موتی نگر بھی تحریر کیا گیا ہے)۔

مہاتما گوتم بدھ کے دور کی یادگاریں، کتبے اور کندہ تختیاں وغیرہ بھی ضلع کی حدود میں، قصبہ نجیب آباد کے نزد واقع موضع موردھج کے قلعہ کے قریب سے کھدائی کے وقت دستیاب ہوئیں جو لکھنؤ کے عجائب گھر میں محفوظ ہیں۔ وہیں 35 فٹ بلند اور 308 فٹ محیط کا ایک ٹیلہ بھی کھدائی کے وقت نکلا جو یقیناً "استوپا" رہا ہے۔

قصبہ کرتپور سے ملحق موضع شہاب پورارتن میں کھدائی کے وقت زمانۂ قدیم کے کچھ زیورات نکل چکے ہیں جن کا محکمۂ آثارِ قدیمہ جائزہ لے چکا ہے۔ اس سے پہلے قصبہ باشٹہ کے اطراف میں بھی کھیتوں سے مغل دور کے سکّے برآمد ہو چکے ہیں۔

قصبہ بجنور کے جنوب میں، تقریباً ۱۴ کلومیٹر فاصلے سے، "بجنور۔ گجرولہ" شاہراہ پر اور دریائے گنگا کے بائیں کنارے پر "مہابھارت" دور کا ایک موضع، بِدُرکُٹی واقع ہے جو مہاتما بِدُر کا جائے مسکن رہا ہے۔ بِدُر جی "مہابھارت" دور کے ایک مشہور عالم اور رِشی ہوئے ہیں۔ جب کرشن جی کوروؤں اور پانڈوؤں کے درمیان ایک مصالحت کنندہ کی حیثیت سے ہستناپور [بِدُرکُٹی کے ٹھیک سامنے، دریائے گنگا کے دائیں کنارے پر واقع قدیم آبادی ہے۔ تفصیلات احقر کی کتاب "سلطان الشہداء" اور "سید عبدالرحمٰن بن فضل اللہ" میں ملاحظہ فرمائیں] تشریف لائے تھے تو وہ ہستناپور نہ ٹھہر کر بِدُر جی کے پاس بِدُرکُٹی رکے تھے۔ اس طرح سے اس علاقے کا پرانی تہذیب سے گہرا تعلق رہا ہے۔

دنیا میں کتنی ہی تہذیبیں آئیں اور صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔ آج اُن کے باقیات ہمارے لئے عبرت گاہ بنے ہوئے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جس قوم نے اپنے اسلاف کو بھلا دیا؛ اپنے تشخص کو مٹا دیا؛ اپنی زبان، اپنی تہذیب، اپنی ثقافت اور اپنے تمدّن کو فراموش کر دیا؛ اس

کو تاریخ نے کبھی معاف نہیں کیا۔ اس کے برعکس جس قوم نے بادِ مخالف کے باوجود اپنا دیا جلائے رکھا اور موجِ حوادث کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے اپنے زندہ رہنے کا احساس دلائے رکھا، وہی قوم سرخ رو ہوئی اور تاریخ کی کسوٹی پر پوری اترتے ہوئے زندہ قوموں کی صفوں میں گردانی گئی۔

کسی بھی قوم کا شاندار ماضی، اس کا تہذیبی و ثقافتی سرمایہ اس کی تاریخ کا ایک روشن باب ہوا کرتا ہے۔ جب تک وہ باب اس کی تاریخ کا ایک حصہ بنا رہتا ہے، اس قوم کو بقائے دوام حاصل رہتا ہے۔

ہماری ''گنگا جمنی'' تہذیب، بنالحاظ مذہب وملّت اردو زبان میں محفوظ ہے۔ اس لئے اس گراں بہا سرمائے کی حفاظت کرنا، اس سے کماحقہٗ واقف ہونا ہمارا ایک طرح سے دینی و قومی فرض بن جاتا ہے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ کل ہم پر اپنے اسلاف کی تاریخ، اپنی تہذیب، اپنی وراثت اور اپنے تشخص کو فراموش کرنے کا جرم عائد نہ ہو جائے اور ہم دوسروں کے لئے عبرت نہ بن جائیں۔ اس قومی ادائیگی کا تقاضہ یہ ہے کہ دینی و ادبی شخصیات کے کارناموں اور ان کی سرگرمیوں کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور نئی نسل کو ان کی روایات و خدمات اور ان کے اقدامات و امتیازات سے روشناس کرایا جائے۔ فی زمانہ اس ہردل عزیز اور شیریں زبان کے لئے عوامی بیداری کی اشد ضرورت ہے کیونکہ بنا عوام کے تعاون کے کوئی بھی زبان زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رکھی جاسکتی۔ جہاں تک اس ملک میں آزادی کے بعد اس کے فروغ، اس کی بقا کے لئے سرکاری سطح پر کی جانے والی کوششوں کا معاملہ ہے، تو اس کا اندازہ مندرجہ ذیل ایک سچے واقع کی روشنی میں لگایا جاسکتا ہے۔

پہلے ٹیوشن کا رواج نہیں تھا۔ منشی صاحبان بنا کسی اجرت کے بچوں کو اپنے گھر پر پڑھایا کرتے تھے، البتہ مار ضرور لگاتے اور بیگار بھی خوب لیتے تھے۔ ہماری بستی (موضع حبیب والا) میں منشی تجمل حسین صاحب فاروقی کے گھر بھی کافی بچے رات کو پڑھنے آیا کرتے تھے۔ منشی صاحب مرحوم ومغفور نے بستی کی پاؤں دھوئی ندی کے کنارے امرودوں کا ایک باغ لگوایا۔ پیڑوں کی

آبیاری وہ بذریعہ پینگی بچوں سے کرانے لگے۔ بیچارے بچوں کے کندھوں میں ٹھیٹیں پڑنے لگیں۔اس آفتِ ناگہانی سے چھٹکارا پانے کے لئے بچوں نے باہم صلاح ومشورہ کیااور پھر غضنفر علی نامی ایک شریروذہین بچے [غضنفر علی جو بعد میں منشی غضنفر علی کہلائے، احقر کے تائے ہوتے تھے۔موصوف وحشی تخلص سے معیاری اشعار کہتے اور صاحب دیوان شاعر ہوئے] کی تجویز پر کمربستہ ہوگئے۔ چند دنوں بعد ہی پیڑ سوکھنے لگے۔ منشی جی فکرمند ہوئے۔ایک دن انھوں نے ایک پیڑ کی آڑ میں چھپ کر دیکھا تو منظر عجیب نظر آیا۔ بچے پہلے پیڑ کے تھاؤلے میں پانی ڈالتے اور پھر سب مل کراس پیڑ کو خوب ہلاتے۔اسی دن سے منشی جی نے ان بچوں کی چھٹی کردی۔

وقت کا پہیا تیزی سے گھوم رہا ہے۔وہ کسی کا انتظار نہیں کرتا۔چنانچہ وقت کی پکار ہے کہ سرکار محض پر تکیہ نہ کرکے ہم ایک تحریک کی شکل میں خوابِ خرگوش سے بیدار ہوں اور اردو کی بقا کی ذمہ داری خود اپنے کاندھوں پر اٹھائیں۔

یہ ایک المیہ ہے کہ یو۔پی کے مغربی اضلاع (رامپور، مرادآباد، بجنور، سہارنپور، میرٹھ اور مظفرنگر وغیرہ) بالخصوص بجنور ضلع کے شہداء، صوفیا، علما، فضلا نیز دانشوروں [ادبی شخصیات، اطبّاء، سفارتکار، تاریخ وسیاست وقانون داں اور ماہرِ ریاضیات وغیرہ] کے تذکرے مستند کتب میں نہیں ملتے، اگرکسی ایک/دو کے ملتے بھی ہیں تو وہ بہت مختصر سے ہوتے ہیں اور پوری طرح سے ان کی عظمت کا احاطہ نہیں کرتے۔میرے خیال سے اس کی مندرجہ ذیل وجوہات ہوسکتی ہیں:۔

یہاں کے صاحبِ علم وفن بزرگوں نے ازخود گمنامی کی چادر اوڑھے رکھی اور شہرت کو وبالِ جان سمجھ کر ''نیکی کر دریا میں ڈال'' کے مقولے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے، درویشانہ زندگی بسر کراپنے مولائے حقیقی سے جاملے۔

ملک کے والیانِ ریاست (مسلم وغیر مسلم، دونوں)، خاص کر حیدرآباد اور بھوپال نے صاحبِ علم وفضل حضرات کی دل کھول کر پذیرائی کی جس سے یہاں کی لائقِ تذکرہ شخصیتیں اُس جانب کھنچی چلی گئیں اور وہاں کے علمی خزانے کی زینت بن گئیں اور یہ علاقہ ان کی شہرت سے محروم ہوکر رہ گیا۔

1947 میں نقلِ مکانی کا جو سیلاب آیا اُس سے یہ علاقہ نسبتاً زیادہ متاثر ہوا۔ پہلے مرحلہ بطور محض تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ اس پلاننگ کے ساتھ سرحد کے اُس پار چلا گیا کہ پہلے وہ (وہاں) گنجائش پیدا کر لے اور یہاں بزرگ اپنی املاک ٹھکانے لگا دیں لیکن اچانک رحمتِ حق جوش میں آیا اور یہاں والوں کے واسطے یہاں کے حالات بھی سازگار ہو گئے جس سے نقلِ مکانی کا سیلاب قدرے تھم سا گیا اور جو جہاں تھا وہ وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ وقت گزرتا گیا اور کچھ عرصے بعد یہاں کے بزرگ اللہ کو پیارے ہو گئے اور وہاں کے نوجوان پیری کی دہلیز پر دستک دینے لگے اور انھیں اپنی نئی نسل کے تشخص کی فکر دامن گیر ہوئی۔ چنانچہ جب بھی انھوں نے اِدھر کا رُخ کیا (عزیز واقارب سے ملنے کے لئے) واپسی پر وہ اپنے ساتھ یہاں سے مخطوطوں کی شکل میں علمی خزانے لے گئے اور یہاں کی نسل (جوان کے خورد تھے) انھیں انکار نہ کر سکی۔ اس طرح سے یہاں کا علمی خزانہ خالی ہو گیا اور اہلیانِ خطّہ اپنے سرمایے سے نابلد ہو کر رہ گئے۔ علاوہ ازیں برصغیر کی تقسیم سے Brain drain بھی ہوا۔

دیگر علاقوں کے اربابِ تذکرہ نے اس علاقے کو نظر انداز کرتے ہوئے تنگ نظری، جانبداری اور ناانصافی سے کام لیا؛ حالانکہ اس علاقے کے چپّہ چپّہ پر بھی عظیم و مایہ ناز ہستیوں کے مقابر، مزارات، خانقاہیں اور نقوشِ قدم موجود ہیں۔ بقول میر تقی میرؔ

چپّہ چپّہ پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک!
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز!!

مجھے نہیں معلوم کہ میرؔ نے مذکورہ شعر کس علاقے کی نسبت سے کہا تھا، میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ اس کا اطلاق اس سرزمین پر بھی ہوتا ہے جہاں جلیل القدر ہستیوں اور گراں مایہ افراد کی ایک طویل کہکشاں ہے۔ اگر ان کی تفصیلات جمع کی جائیں تو دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ دعوے کی تائید بطور محض چند کا مختصر سا تعارف کرا دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

قدوۃ المشائخ حضرت شیخ حبیب اللہؒ = میزبانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، سیدنا حضرت ابوایوب انصاریؓ کی اولاد سے؛ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ہمعصر؛ سید سلطان بہرائچیؒ کے فرزند،

سید مصطفیٰؒ کے خلیفۂ اوّل اور اپنے وقت کے قطبؒ ہوئے ہیں۔ مزار شریف قصبہ چاندپور سے ملحق سرائے شیخ حبیبؒ میں مرجعِ خلائق ہے۔ 1592 میں آپ نے مذکورہ موضع، سرائے شیخ حبیبؒ اور 1613 میں موضع حبیبؒ والا آباد کیے۔

جس طرح سے شہزادہ سلیم، شیخ سلیم چشتیؒ کی دعاؤں سے پیدا ہوا، اسی طرح آپ کی دعاؤں سے شیخ عبدالرحمٰنؒ (الملقب بہ "افضل خاں") بن شیخ ابوالفضلؒ بن شیخ مبارکؒ ناگوری کے گھر پشوتنؒ پیدا ہوا۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ شیخ مبارکؒ ناگوری کے گھر کی مستورات کو چشتیہ سلسلے میں بیعت کرانا رہا۔

آپ 1554 میں موضع آنٹ (تحصیل مسرکھ، ضلع سیتاپور) میں پیدا ہوئے تھے۔ پرورش اعظم پور (اُس وقت ضلع مراد آباد) میں بندگی شیخ حسین چشتیؒ (بابا فریدالدین گنج شکرؒ کی اولاد سے اور مجذوب۔ سالک بزرگ) کے زیرِ نگرانی ہوئی اور وصال سرائے شیخ حبیب میں ۱۶۳۴ء میں ہوا۔

مجاہدِ ملّت مولانا محمد حفظ الرحمٰن = اصل نام معزالدین تھا۔ مشہور حفظ الرحمٰن کے نام سے ہوئے۔ قصبہ سیوہارہ میں پیدا ہوئے۔ آپ زبردست عالم، فقیہہ، مفکّر، دانشور، شعلہ بیان مقرر اور تحریکِ آزادی کے مقتدر نیز بے باک رہنما تھے۔ آپ میں حب الوطنی اور ملّتِ اسلامیہ کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ آپ کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ آزادی کے بعد سے تادمِ مرگ (۱۹۶۲ء) مسلسل ممبر پارلیمنٹ رہے۔

آپ "ندوۃ المصنفین" کے بانی اور اس کے رفیقِ اعلیٰ تھے۔ جہاں کہیں بھی مسلم کش فساد ہوتا آپ بے دھڑک اور بنا تاخیر وہاں پہنچ جاتے تھے۔ متعدد کتب تصنیف کیں۔

قاضی ظہور الحسن ناظم = قصبہ سیوہارہ میں پیدا ہوئے۔ اردو اور فارسی، دونوں زبانوں کے مشہور صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ بزمِ ادب نے "امیر الشعراء، قادر الکلام" کے خطاب سے نوازا۔ اخترؔ دہلوی (تلمذ غالبؔ)، ساحلؔ دہلوی (جانشین داغؔ)، نواب صامت جنگ جلیلؔ (جانشین امیر مینائی)، نواب عزیز یار جنگ عزیزؔ حیدرآبادی (جانشین داغؔ) نے آپ کے کمالِ سخن

کو سراہا۔

سید سراج الحسن ترمذی، مولانا عبدالستار خواہش، مولانا ابوالخیر مودودی دہلوی اور قاضی عبدالغفار برق (تلمذ داغ) نے آپ پر مضامین لکھے۔ محمد اسحاق ماہر نے آپ پر ایک کتاب تصنیف کی۔ آپ نے تقریباً ۸۰ کتابیں تصنیف کیں جن میں سے تقریباً50 شائع ہوئیں۔ تاریخ گوئی میں تو آپ کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔

آپ چشتیہ، نیازیہ، فخریہ، نقشبندیہ، سہروردیہ سلاسل میں صاحب مجاز بھی تھے۔ ۸۵ سال کی عمر میں 1963 میں انتقال ہوا۔

مولانا ریاست علی ظفر بجنوری = آپ قدوۃ المشائخ حضرت شیخ حبیب اللہ کی اولاد سے، موضع حبیب والا کے ساکن، از حد ذہین، جید عالمِ دین، مدبّر و مفکر، کہنہ مشق شاعر، ''دارالعلوم'' دیوبند اور ''مدرسۃ البنات'' دیوبند کے ترانوں کے خالق اور خداداد صلاحیتوں کے مالک نیز ایک عرصے سے ''دارالعلوم'' دیوبند میں استاذِ حدیث ہیں۔

آپ نے حضرت مولانا سید فخر الدینؒ کے دامن سے مسلسل تیرہ سالوں تک وابستہ رہ کر ان کی علمی مجالس سے استفادہ کیا اور ان کے درسی افادات کو ''ایضاح البخاری'' کے نام سے مرتب کیا جس کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

1984 میں آپ ''دارالعلوم'' دیوبند کی ''مجلسِ تعلیمی'' کے ناظم رہے اور قابلِ قدر اصطلاحات نافذ کرتے ہوئے مختلف دفتری علوم میں آسانیاں اور استواری پیدا کیں، امتحان داخلہ تحریری طور پر منظم کیا، امتحان ششماہی کو سالانہ کی طرح باقاعدہ مستحکم کیا اور تمام امتحانات میں امیدواروں کے نام کے بجائے کوڈ سسٹم رائج کیا۔

1987 میں ''شیخ الہند اکیڈمی'' کا نگراں مقرر ہونے پر آپ نے ''شوریٰ کی شرعی حیثیت'' کے نام سے ایک گراں قدر کتاب تالیف فرمائی۔ اس کے علاوہ بھی متعدد معیاری نیز علمی کتب تصنیف فرمائیں۔

آپ عارضی طور سے ''دارالعلوم'' دیوبند کے مہتمم کے فرائض بھی انجام دے چکے

ہیں۔ظفرؔ تخلص سے طبع آزمائی فرماتے اور معیاری اشعار کہتے ہیں۔کئی دیوان شائع ہو چکے ہیں۔

حکیم سید علی کوثر چاند پوریؒ = بھوپال کے محکمۂ طبابت میں بحیثیت ''افسر الاطباء'' ملازم رہے۔وہاں سے سبکدوش ہو جانے کے بعد ''ہمدرد نرسنگ ہوم'' دہلی میں بحیثیت میڈیکل آفیسر خدمات انجام دیں۔

آپ نے تقریباً ۳۱ ناول، طب پر تقریباً ۹، بچوں کے لئے تقریباً ۱۵، طنز و مزاح پر 5 اور دیگر موضوعات پر تقریباً 6 (کل ملا کر تقریباً 66) کتابیں تصنیف کیں۔

آپ قصبہ چاند پور کے رہنے والے تھے۔ 1991 میں دہلی وفات پائی۔

قاضی حسن مصطفےٰؒ (عبدالصمد صارمؔ) = 1918 میں سیوہارہ میں پیدا ہوئے اور 2003 میں پاکستان انتقال ہوا۔

''دارالعلوم'' دیوبند سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ''پنجاب یونیورسٹی'' سے فاضل، منشی فاضل اور زبدۃ الحکماء کی ڈگریاں حاصل کیں۔''جامعۃ الازہر'' مصر سے سندِ فضیلت حاصل کی اور ''جامعہ مصریہ'' میں بھی زیرِ تعلیم رہے۔

عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں طبع آزمائی فرماتے اور فی البدیہہ اشعار کہتے تھے۔بےخودؔ دہلوی، سائلؔ دہلوی اور فصاحت جنگ جلیلؔ سے اصلاحِ سخن لی۔

[7] **قاضی عبدالخالق (نہالؔ سیوہاروی)** = 1890 میں قصبہ سیوہارہ میں پیدا ہوئے اور 1952 میں کراچی وفات پائی۔

پاکستان میں ''امام الشعراء'' کے خطاب سے نوازے گئے۔آپ کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

جو موت سے نہ کھیلے اسے زندگی نہ کہہ
جو بجلیوں کی زد میں نہیں، آشیاں نہیں

آپ نواب سائل دہلوی (جانشین داغ) کے شاگرد و داماد تھے۔سائل نے اپنی مثنوی، ''قران الاخوین'' میں آپ کی بہت تعریف کی ہے۔آپ کے کئی مجموعۂ کلام شائع ہوئے۔

[8] **ڈاکٹر محمد محمد الحق انصاریؒ** = قدوۃ المشائخ حضرت شیخ حبیب اللہؒ کی اولاد سے، موضع

حبیب والا کے ساکن اور فارسی زبان میں ''پی۔ایچ۔ڈی''، ''ڈی۔لٹ'' تھے۔ شاہ ایران کے معتمدِ خاص اور ''تہران یونیورسٹی'' میں فارسی کے پروفیسر و ''ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ'' رہے۔ 1997 میں کراچی انتقال ہوا۔

[9] **مولوی عبدالبصیر تقی آزاد** = قاضی خاندان قصبہ سیوہارہ سے، فاضلِ دیوبند، فاضلِ حدیث مدینہ منورہ، مولوی فاضل ''الہ آباد یونیورسٹی'' تھے۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں آزادؔ تخلص سے طبع آزمائی فرماتے تھے۔ عبدالرحمٰن بجنوری کے بعد، ''مشیرِ تعلیمات'' حیدرآباد رہے۔ تصنیفات کی تعداد ایک درجن کے قریب ہے۔ ''تذکرۂ سخنورانِ دکن'' میں آپ کا تذکرہ ہے۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

[10] **ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری** = 1885 میں قاضی خاندان قصبہ سیوہارہ میں پیدا ہوئے۔ ''مسلم یونیورسٹی''، علی گڑھ سے ایم۔اے؛ ایل۔ایل۔بی کی ڈگریاں حاصل کر کے لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور جرمن میں رہ کر پی۔ایچ۔ڈی کی۔ جرمن زبان میں ''فقہ اسلام'' پر مقالہ لکھا اور قسطنطنیہ کا سفر کیا۔ ریاست بھوپال میں ''مشیر تعلیمات'' رہے۔

آپ ڈاکٹر شعیب قریشی (ایڈیٹر ''کامریڈ'')، ڈاکٹر انصاری اور علامہ اقبالؔ کے ہمعصر نیز کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں سے مذکورہ کے علاوہ ایک ''محاسنِ کلامِ غالبؔ'' بھی ہے جو ان کی مشہور تصنیف ہے۔ اردو میں چند نظمیں بھی لکھیں۔ دو مجموعے شائع ہوئے۔ 1918 میں انتقال ہوا۔

[11] **پروفیسر ریاض الاسلام** = 1920 میں قاضی خاندان سیوہارہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں والدہ کے پیار سے اور دس سال کی عمر میں والد کے سائے سے محروم ہو گئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ''مسلم یونیورسٹی'' علی گڑھ سے ایم۔اے (تاریخ) میں ٹاپ کیا اور سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ بعد ازاں ''کیمبرج یونیورسٹی'' سے پی۔ایچ۔ڈی کی۔ اس کے بعد ''مسلم یونیورسٹی'' علی گڑھ اور ''پنجاب یونیورسٹی''، ''دہلی یونیورسٹی'' میں تاریخ کے لکچرر رہے۔ 1947 میں پاکستان چلے گئے جہاں ''کراچی یونیورسٹی'' میں تاریخ کے پروفیسر ہوئے۔ کئی کتابوں کے مصنف

تھے۔

[12] **مولوی محی الدین ذکاءؔ** = قاضی خاندان، قصبہ سیوہارہ میں پیدا ہوئے۔ مشہور عالم و فاضل، ریاضی و تاریخ کے استادِ کامل تھے۔ ''دہلی کالج'' دہلی میں تعلیم پائی تھی۔ مولانا مملوک علی و مولانا صہبائی کے شاگرد نیز مولانا ذکا اللہ، ڈپٹی نذیر احمد، حضرت مولانا قاسم اور مولانا رشید احمد کے ہم سبق رہے۔ استاد ذوقؔ کے شاگرد تھے۔ 1898 میں وفات پائی۔

[13] **الحاج منظور علی فاروقی (المعروف بہ تمناؔ بجنوری)** = آپ شاہ عبدالغفور اعظم پوریؒ کی اولاد سے اور موضع حبیبؔ والا کے رہنے والے تھے۔ تاریخی نام ''مظاہر الاسلام'' تھا، یعنی آپ 1309ھ 1891 میں حبیب والا میں پیدا ہوئے۔ 26 اور 27 ویں روزے کی درمیانی شب میں 23/ستمبر 1976 کو علی گڑھ جہاں آپ ''مسلم یونیورسٹی'' میں ملازم رہے، انتقال ہوا۔

آپ ایک بلند پایہ مفکر، مستند و معیاری صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ پہلے گریاں اور بعد ازاں تمنا تخلص سے اردو اور فارسی میں طبع آزمائی کی۔ زود گوئی، تضمین اور تاریخ گوئی میں آپ کو ملکہ حاصل تھا۔ ہمہ وقت آپ کی رہائش گاہ پر دانشورانِ علی گڑھ کی نشست جمی رہتی تھی اور چائے و پان کا دور چلتا رہتا تھا۔ ریاضت کا یہ عالم تھا کہ جب سے ہوش سنبھالا کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔ رمضان شریف میں پندرہ اور عام دنوں میں دس سپارے تلاوت کرنا آپ کا معمول تھا۔

[14] **مولوی محمد یٰسین غریقؔ** = محکمۂ نہر (پنجاب) میں ڈپٹی کلکٹر رہے۔ ترن تارن میں مدفون ہیں۔ متبحر فاضل مولانا غلام حسین سیوہاروی اور شوق دہلوی کے شاگردِ رشید تھے۔ ایک مطبوعہ دیوان جس میں اردو فارسی کا کلام ہے اور دو ضخیم دیوان پرانی وضع موٹے کاغذ پر لکھے ہوئے یادگار چھوڑے ہیں۔

[15] **پیرزادہ قاسمؔ** = اصل نام محی الدین احمد (عرف قاسم رضا) ہے۔ والد کا نام الحاج شاہ ضیاءؔ الدین احمد 1968 کراچی) اور دادا کا نام شیخ ریاض الدین احمد بسملؔ (1926 حبیب والا) تھا۔ جناب ریاض الدین بسمل موضع حبیب والا کے رہنے والے اور صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ کافی ذہین، لائق و فائق شخص تھے۔ ریاست کشن گڑھ (راجستھان) میں تحصیلدار رہے۔ 1923 میں

خلافت تحریک سے وابستہ ہو جانے کے سبب ملازمت چھوڑ کر واپس وطن (حبیب والا) تشریف لے آئے تھے۔

شاہ ضیاءالدین احمد، مولانا حکیم حافظ عبدالقدیر قمر العارفین دہلویؒ (اولاد بابا فریدالدین گنج شکرؒ) کے خلفاء میں سے اور صاحبِ اجازت تھے۔ خلافت تحریک سے وابستگی کے سبب آپ نے ملازمت ترک کر کے صحافت سے ناطہ جوڑ لیا تھا۔ 1923 میں مولانا آزاد کے اخبار ''الہلال'' سے وابستہ رہے۔ بعد ازاں ''الجمعیۃ''، ''اکلیل''، ''پیغام''، ''چنگاری'' وغیرہ میں مضامین لکھنے لگے تھے۔ 1940 میں مسٹر محمد علی جناح اور نواب زادہ لیاقت علی خاں کی تحریک پر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور 1945 سے مسلم لیگ کی پبلی کیشن سے متعلق رہے۔ بعد ازاں انگریزی روزنامہ ''ڈان'' اور مسلم لیگ کے دفتر سے نکلنے والے اردو اخبار ''منشور'' سے بھی کسی نہ کسی طور وابستہ ہو گئے۔ پہلے تو آپ نے پاکستان جانے سے انکار کر دیا تھا لیکن جب دہلی میں قتل و غارت گری کی آندھی چلی تو بالآخر اکتوبر 1947 میں کراچی نقلِ مکانی کر گئے جہاں ''ڈان'' اخبار کی جانب سے Mueis Mansion میں آپ کے قیام کا انتظام کیا گیا۔ مارچ 1966 میں آپ پر زبردست فالج کا حملہ ہوا اور ۲۲ر دسمبر بروز اتوار (یکم شوال المکرم) 1968 کو بعد نماز عید آپ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

آپ (پیرزادہ قاسم) ۸ر فروری (۱۰ر محرم الحرام) 1360ھ (1960) جمعہ۔ ہفتہ کی درمیانی شب کو بارہ بجے پیدا ہوئے۔ عالمی شہرت یافتہ شاعر، محقق اور دانشور ہیں۔ کئی اعزازات سے نوازے جا چکے ہیں۔ ''پرو وائس چانسلر'' اور ''چانسلر''، ''کراچی یونیورسٹی'' بھی رہے۔

علامہ شیخ عبدالحمیدؒ [شیخ حبیب اللہؒ کے فرزندِ اکبر، موضع حبیب والا کے معاون۔ بانی، جید عالم، چشتیہ و قادریہ و طیفوریہ سلاسل سے صاحبِ اجازت بزرگ اور صاحبِ تصانیف تھے]،

منشی فضل حسین سحروںؔ [شیخ حبیب اللہؒ کی اولاد سے، حبیب والا کے ساکن، داغؔ دہلوی کے شاگردِ خاص اور کہنہ مشق و صاحبِ دیوان شاعر تھے (آپ کا ایک دیوان بے نقطے کے اشعار پر مشتمل تھا)]

الحاج مولانا ضیاءالدینؒ قاسمی [جید عالمِ دین، بہترین مقرر اور حبیب والا کے ساکن تھے لیکن بعد

میں علی گڑھ کی سکونت اختیار کرلی تھی۔ عربی بہت روانی سے بولتے تھے۔ ہندوستان سے سب سے پہلی جو تبلیغی جماعت سعودی عرب گئی اس کے لئے آپ ہی کو امیرِ جماعت منتخب کیا گیا تھا۔ سیوری (ضلع ویربھوم، مغربی بنگال) میں واقع مدرسہ ''ضیاء الاسلام'' آپ ہی کے نام پر اور آپ کا قائم کردہ ہے۔ جس طرح سے آسمان پر لاتعد ستاروں کی ایک کہکشاں جلوہ گر ہے اور اس میں موجود روشن ستاروں کا شمار کرنا محال ہے، اسی طرح سے اس ضلع سے متعلق بھی دینی وروحانی، ملی اور ادبی شخصیات کی ایک عظیم کہکشاں ہے۔ وقت کی کمیابی کے سبب ان میں سے محض چند کا ہی مختصر سا تعارف پیش کیا گیا۔ مزید چند کے اسماء اس طرح سے ہیں قائم چاندپوری، پروفیسر خورشید الاسلام (سیوہارہ)، قرۃ العین حیدر (نہٹور)، سجاد حیدر یلدرم (نہٹور)، ڈپٹی نذیر احمد (بجنور)، تاجور نجیب آبادی، اختر الایمان، رفعت سروش (نگینہ)، صدیقہ بیگم سیوہاروی، اطہر پرویز (سیوہارہ)، ہلال سیوہاروی، نشتر خانقاہی (بجنور)، پروفیسر ظفر احمد نظامی (شیرکوٹ)، مولانا مرغوب الرحمٰن (بجنور)، مولانا سلطان الحق قاسمی (حبیب والا)، مولانا محمد جمیل عامر قاسمی (حبیب والا)، مختار احمد (حبیب والا)، مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی، حسن عثمان قاضی (سیوہارہ)، حکیم سید منصور علی (حبیب والا)، ڈاکٹر شمیم احمد (نگینہ۔ لکھنؤ) وغیرہ وغیرہ۔

سرسید احمد خاںؒ (بانی ''مسلم یونیورسٹی'' علی گڑھ) کے نام سے آج کون ذی علم واقف نہیں۔ ان کی عظمت، ان کی مدبرانہ صلاحیت وقیادت کو مخالفین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے فخر ہے کہ ان کے عزم کی تخم ریزی اسی سرزمین سے ہوئی تھی۔ خدا کرے کہ آج کا مذاکرہ علاقے میں ایک نئے دور کا آغاز کرے؛ جس شجر کی آج تخم ریزی ہو اس پر جلد نئی کونپلیں پھوٹیں، نئی شاخیں نکلیں، نئی کلیاں چٹخیں، خوش رنگ پھول کھلیں اور شیریں پھل آئیں؛ وہ جلد نشوونما پاکر ادبی دنیا پر سایہ فگن ہوئے (آمین، ثم آمین)۔

جناب شیخ نگینوی اور ان کے رفقائے کار نے آج پہل کر کے تشنہ لب اہلیانِ خطہ کو آبِ حیات فراہم کردیا ہے۔ موجودہ حالات میں ان کی یہ کاوش لائقِ صد داد وتحسین اور قابلِ ستائش ہے، ساتھ ہی دوسروں کے لئے قابلِ تقلید بھی۔ بقول فنا نظامی کانپوری مرحوم۔

راہبر راہ مسافر کو دکھا دیتا ہے

وہی منزل پہ بھی پہنچائے، ضروری تو نہیں

راہ دکھائی جا چکی ہے۔اب اہلیانِ خطّہ کا کام ہے کہ منزل تک پہنچنے کا کام وہ خود انجام دیں۔

بھول نہ جانا کہیں تم مجھے اپنا کہہ کے!

رہ نہ جائے مری امید کا سورج گہہ کے!!

09759318584

ایک مخلص ادیب: ڈاکٹر وسیم اقبال صدیقی

ضلع بجنور کے نئی نسل کے ادیبوں میں وسیم اقبال ایسا نام ہے، جس نے اپنی ادبی صلاحیت اور حسن اخلاق کی وجہ سے اردو ادب میں بہت کم وقت میں اپنی پہچان قائم کی ہے۔ یکم جولائی 1973 کو نگینہ میں پیدائش ہوئی۔ ابتدائی تعلیم نگینہ میں حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انٹر، بی۔ اے، ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ کرشن گوپال ڈگری کالج نگینہ میں تین سال صدر شعبہء اردو اور دو سال سینئر ایڈیشنل سپرنٹنڈنٹ آف ایگزامینشن کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ وسیم اقبال کی بہترین انتظامی صلاحیتوں کے پیش نظر کالج منتظمہ کمیٹی کی جانب سے انھیں پرنسپل کے عہدے پر مستقل کرنے کی بھی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ ڈاکٹر وسیم اقبال نے کالج میں رہتے ہوئے درمے، قدمے سخنے نہ صرف کالج کی بقا کے لیے کام کیا بلکہ اپنی تین سال کی سیلری بھی کالج ویلفیر فنڈ میں میں ڈونیٹ کردی۔ ڈاکٹر وسیم نے اپنی تحقیق کے حوالے سے نئے نئے نکات، معنی ومفاہیم اور پہلو وضع کیے ہیں۔ پروفیسر وسیم بریلوی، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر محمود الٰہی، پروفیسر طارق چھتاری، پروفیسر عبد الحق، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، پروفیسر محمد انصار اللہ، جناب مخمور سعیدی، جناب عابد سہیل، جناب اسد رضا، ڈاکٹر کاظم علی خاں، محترمہ سلمٰی حجاب وغیرہ نامور اردو داں حضرات نے ڈاکٹر وسیم اقبال کے قلم اور تخلیقات کو سراہا ہے۔ اوراقِ ادب (دو جلدوں میں)، گلدستہ در گلدستہ، (5 جلدوں میں)، گلدستۂ بیت بازی، اردو کی طنزیہ اور مزاحیہ نثر (ایک تنقیدی جائزہ) وغیرہ وسیم اقبال کی اہم تصنیفات ہیں اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ ڈاکٹر وسیم اقبال کی کتابیں جامعہ اردو علی گڑھ کے ماہر اور کامل کے علاوہ اتراکھنڈ میں نصاب میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی

یہ خلدِ بریں ارمانوں کی

ڈاکٹر وسیم اقبال

ضلع بجنور اتر پردیش کے شمال مغرب میں ہندوستان کے مہمان پاسبان ہمالیہ کے میدانی یعنی ترائی کے علاقہ میں واقع ہے اور قدرت نے اسے اپنے خزانوں سے ایسی فراوانی کے ساتھ مالا مال کیا ہے کہ اس کی زمین گل و گلزار اور زرخیز ہی نہیں بلکہ مردم خیز بھی ہے۔ زندگی کے قریب قریب تمام اہم شعبوں میں اس سرزمین کے فرزندان ارجمند نے اپنی بے لوث لیاقت اور اخلاص سے گوشہ زندگی کو ایسا آراستہ کیا ہے کہ دیکھنے والے کی زبان خود بول اٹھتی ہے "یہ خلد بریں ارمانوں کی"۔

آیئے ہم بھی چند منٹ اس گلستان کی مختلف النوع پر بہار کیاریوں کے نظارہ سے لطف اندوز ہوں۔ ضلع کو مغرب میں پوتر گنگا نے اپنی فیض رساں روانی سے آبیار کیا ہے اور اس کے مشرق میں رام گنگا بہتی ہے۔ قدرت نے اس کے باشندوں کے لیے ایسی سازگار آب و ہوا فراہم کی ہے کہ جس میں وہ امن و امان کے ساتھ سانس لے سکیں اور قدرت کے خزانوں سے فیضیاب ہو کر اپنی جنس، انسانیت اور کل مخلوق خدا کی خدمت میں زندگی صرف کر سکیں۔

نگینہ، نجیب آباد میں سرد موسم میں درجہ حرارت صفر تک گر جاتا ہے اور گرمی ان دونوں جگہوں میں ۴۰ درجہ سے کم ہی رہتی ہے۔ بارش اس قدر کافی ہوتی ہے کہ ضلع کی پیداوار میں چاول کی کاشت اچھی مقدار میں ہے۔ زمین کی رخیزی گندم، چاول اور خاص کر گنے کی اچھی پیداوار سے ثابت ہے۔ شکر کی پیداوار میں صوبہ اتر پردیش کے ضلعوں میں یہ صفحہ اول میں ہے۔ چینی کی اس وقت ۹ ملیں ہیں اور کم از کم ۲ اور قائم ہونے والی ہیں۔ کریشروں کی تعداد ۴۰ سے زیادہ رہ چکی ہے۔ نگینہ کی تحصیل میں جو چاول پیدا ہوتا ہے اس کی اعلیٰ قسم، ہنس راج نہایت خوشبودار اور لمبا ہے اور باسمتی سے ٹکر لیتا ہے اور شہروں کے بازاروں میں باسمتی کے نام سے بکتا ہے۔ قصبہ نگینہ اور

بڑھاپور کے درمیان، بڑھاپور کے دکنی کنارے پر ایک دریا بہتا ہے جس کا نام سونا ندی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے آغوش سے ریت اٹھا کر چھان لیں تو اس میں سے سونے کے ذرات ملتے ہیں جو بلاشبہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ پہاڑ کی طرف سے جس سمت سے دریا بہتا آرہا ہے وہاں سونے کی کان موجود ہو۔ متعلقہ محکمہ اس کی تحقیقات کرے تو یہ ملک کی بڑی خدمت ہوگی۔

جس سرزمین کا یہ رنگ ہو، وہاں کے باشندے جس قدر بھی زیرک، ہوشیار اور فنکار ہوں تو کیا تعجب کا مقام ہے۔ چنانچہ ضلع صنعت کاروں کی مہارت کا یہ عالم رہا ہے کہ نگینہ میں آبنوس کی لکڑی پر نقش و نگار کی صنعت نے یہ صورت اختیار کی کہ میزیں، کرسیاں، سنگاردان، طرح طرح کے ڈبے اور ہاتھ میں لینے کی چھڑیاں اور دیگر مصنوعات ایسی تیار کیں کہ ملکہ وکٹوریہ نے بذاتِ خود ان کی فرمائش کی اور وہ پیلس کی زینت بن گئیں۔ یہی صنعت آبنوس کے بجائے آج روز وڈ اور شیشم میں بدل گئی ہے۔ ڈبے، عورتوں کے کڑے، بندے اور زیور اور میزیں وغیرہ اس قدر تعداد میں بنتے ہیں کہ مستقل ان کا ایکسپورٹ امریکہ، افریقہ، یورپ اور مڈل ایسٹ کو ہوتا ہے، اس وقت کئی کروڑ سالانہ کی ایکسپورٹ ہے اور نگینہ سے نکل کر یہ تجارت نجیب آباد، دھام پور اور دوسرے قصبوں تک پہنچ گئی ہے۔

انسان کی زینت کا سب سے پہلا سامان لباس ہے۔ اس کی رنگینی اور خوبصورتی پر یہاں کے باشندوں کی کافی توجہ رہی ہے۔ انصاریوں نے اپنے کرگھوں پر نگینہ، نہٹور اور آس پاس کے گاؤں میں ایسے کپڑے بنے کے جس کا استعمال فرانس، امریکہ، برطانیہ اور تمام ممالک میں ہے۔ پہننے کے کپڑے، گدوں کی ٹیپسٹری اور پردوں کا کپڑا لاجواب بنا جانے لگا، جو ادھر مدت سے سوت کی قلت اور مہنگائی کے سبب رو بہ زوال رہا، مگر صنعت اپنی جگہ موجود ہے۔ چھپائی، رنگائی اور ڈیزائن کا کام بھی اعلیٰ سے اعلیٰ پیمانے پر رہا ہے۔

نگینہ کے لوہار ایسے دستکار رہے ہیں کہ ایک شخص عبداللہ نامی ریوالور اور بندوق سب بنا سکتا تھا۔ کمشنروں کی بندوقوں اور ریوالوروں کی ایسی مرمت کی کہ کبھی مالک یہ نہ پہچان سکا کہ مرمت کہاں ہوئی ہے۔ موجودہ عہد صنعتی ترقی میں یہاں کے باشندے ترقی کی راہ پر گامزن ہیں

اور ضلع میں پیپر ملیں، سیڈ ملیں، اسٹیل ملیں جگہ جگہ قائم ہو رہی ہیں۔ نجیب آباد میں پلائی وڈ کی فیکٹری بھی ہے، انڈین آئل کا ڈپو بھی اور آل انڈیا ریڈیو بھی ہے۔

اہالیانِ بجنور اگر اپنی لامثال جدوجہد سے انگریزوں کی غلامی سے آزاد نہ ہوتے تو اس کے باشندے ہرگز قابلِ ذکر نہ ہوتے۔ چنانچہ آج اگر ضلع کے لوگ آزادی سے سرشار زندگی بسر کر رہے ہیں تو اس کا سہرا ہمارے مجاہدین آزادی کے سر ہے۔ جن میں سب سے اول تین نام ہمارے لئے زندہ جاوید ہیں۔ دونور پور کے رہنے والے پروین سنگھ اور رکھی سنگھ.... اور تیسرے باشٹہ کے امام الدین انصاری ہیں۔ ان تینوں ملک کی آزادی کے متوالوں کو انگریزی حکومت نے گولیوں سے چھلنی کرادیا۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا نام تاریخ میں آب زر سے لکھا رہے گا کہ وطن کی آزای کے لئے ۷ سال جیل میں گزارے اور 48۔1947 میں دہلی میں انسانی زندگی قائم رکھنے کے لئے ایسی جدوجہد کی کہ انسانیت ان کی ہمیشہ ممنون احسان رہے گی۔ ہندوستان کا دستور اساسی بنانے میں ان کا حصہ ہے۔ وہ مرکزی دستور ساز اسمبلی کے ممبر تھے اور تین ٹرم پارلیمینٹ کے ممبر رہے۔ اور جمعیت العلمائے ہند کے جنرل سکریٹری رہے۔ مولوی عبداللطیف بجنوری پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ دہرہ دون جیل میں رہے۔ حافظ محمد ابراہیم اور ان کے صاحب زادے عتیق الرحمٰن مرحوم نے فتح گڑھ، مرادآباد اور بجنور کی جیلوں میں قید کاٹی۔

آصف علی بیرسٹر جو سیوہارہ کے رہنے والے تھے جواہر لال نہرو کے ساتھ احمد نگر جیل میں تھے۔ نیمی سرن، رتن لال جین، بہاری لال، گووند سہائے اور سینکڑوں ہزاروں ان کے ساتھیوں نے وطن کے لئے قربانیاں دیں اور وطن کو آزاد کرایا۔ آزاد کرانے کے بعد دوسرا کام وطن کو سنوارنا، آزادی کو قائم رکھنا اور قوم کی تعمیر تھی۔ تعمیر کے بغیر تو کوئی بھی سرزمین جنگل ہی نظر آتی ہے۔

حافظ محمد ابراہیم مرحوم نہایت لائق وکیل تھے، جنھوں نے ۱۴ سال یوپی میں اور پانچ سال مرکزی حکومت میں وزارت کی اور دو سال پنجاب کے گورنر رہے۔ انھوں نے اپنی اعلیٰ لیاقت اور بے لوث خدمت کے ذریعہ ضلع بجنور کو گل وگلزار اور چمنستان جنت نشاں بنادیا کہ

بجنور آج سچ مچ ارمانوں کی خلدِ بریں بنا ہوا ہے۔ انسان کی بنیادی ضرورت ہوا، پانی، روشنی اور صاف ستھری سڑکیں ہیں۔ حافظ صاحب نے پورے ضلع میں ٹیوب ویل لگوائے اور سڑکوں سے چپہ چپہ کو آراستہ کیا۔ کالا گڑھ کا ڈیم بنوایا جواب اترانچل میں ہے۔ گاؤں گاؤں بجلی پہنچوائی اور پورے پردیش میں خاص طور پر مشرقی اضلاع میں اس پر کافی رشک رہا۔ موصوف کو پدم بھوشن کا خطاب ملا۔

بجنور ضلع کے دوسرے سپوت راجہ جوالہ پرساد تھے جن کو انگریزوں نے پہلا آبپاشی کا چیف انجینئر بنایا۔ انھوں نے بھی ضلع کی بڑی خدمت کی۔ ان کے بیٹے شری دھرم ویر آئی سی ایس تھے مرکزی حکومت میں کیبنیٹ سکریٹری رہے۔ انھوں نے بنگلہ دیش سے آئے شرنارتھیوں کی آباد کاری میں بڑا کام کیا دھرم ویر صاحب نے بجنور میں ایک گرلس کالج اور ایک لڑکوں کا کالج قائم کیا۔ ان کے بھائی ستیہ ویر نے ایک انجیئر کالج قائم کیا۔

بجنور کی ترقی میں جین خاندان کا بھی نمایاں حصہ ہے۔ نجیب آباد کے شریانس پرساد جین اور شانتی پرساد جین دونوں بھائی ہندوستان کے بڑے صنعت کار تھے۔ ان کے کتنے ہی ملکوں میں صنعت کارخانے اور سیمنٹ فیکٹریاں ہیں۔ بینٹ کول مین کی کمپنی انہی دو بھائیوں نے خریدی اور ٹائمز آف انڈیا اور نوبھارت ٹائمز کے یہی لوگ مالک ہیں۔ شانتی پرساد جین ڈالمیا کے داماد تھے انھوں نے نجیب آباد میں دو ڈگری کالج قائم کئے اور پدم شری کا ایوارڈ پایا۔ راجیندر کمار جین بجنور کے ایک متمول گھرانے کے فرزند تھے۔ انھوں نے بھارت بینک کی بنیاد ڈالی۔ وہ دہلی میں فلورل کے مالک تھے۔ ۱۹۶۰ء میں انھوں نے وردھمان ڈگری کالج قائم کیا۔ شانتی پرساد جین کے بیٹے اشوک کمار جین انڈین چیمبر آف کامرس کے پرسیڈینٹ تھے انھوں نے ہسپتال کھلوائے اور ٹائم ریسرچ فاؤنڈیشن اور نیشنل ہارٹ انسٹی ٹیوٹ اور نیشنل سوشل سائنس ریسرچ اینڈ ایجوکیشن سینٹر قائم کئے۔

فتح چند شرما ساہتیہ سمیلن کے سکریٹری اور نوبھارت ٹائمز کے ایڈیٹر تھے۔ ڈاکٹر آتمارام چاند پور کے رہنے والے نیشنل فیزیکل لیبارٹری کے ڈائریکٹر رہے اور سی ایس آئی آر کے

ڈائریکٹر جنرل رہے۔ سید آل عمران آئی۔سی۔ایس جنگ بلقان میں ڈاکٹر انصاری کے ہمراہ طبی مشن لے کر ترکی گئے تھے۔ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری بہت بڑے ادیب تھے۔اور بھوپال میں ڈائریکٹر تعلیمات تھے۔ غالب پر ان کی کتاب لازوال ہے۔قرۃ العین حیدر بھی جو اردو کی اعلیٰ ادیب اور ناول نگار ہیں۔ ناول "آگ کا دریا" ان کا شاہکار ناول ہے۔صدیقہ بیگم سیوہاروی افسانہ نویس، دشینت کمار نوادہ تحصیل بجنور کے ڈرامہ نگار، ناول نگار اور شاعر تھے۔قاضی سجاد حسین کرت پوری نے مثنوی اور دیوان حافظ کا ترجمہ کیا۔شمس العلماڈپٹی نذیر احمد اردو کے بڑے نثر نگار تسلیم کیے گئے ہیں وہ ریہڑ کے رہنے والے تھے۔ڈاکٹر وحید الدین ملک جو دو یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر بھی رہے، محمد قاسم صدیقی سیوہاروی سابق وائس چانسلر جامعہ اردو علی گڑھ جو اردو ادب کے بڑے ادیب بھی ہیں، پروفیسر گیان چند اور پروفیسر خورشید الاسلام جو دونوں غالب کے نقاد، سب ضلع بجنور کے رہنے والے ہیں۔اگر ضلع بجنور ایک گلشن پُر بہار تھا تو میر تقی میر کے وقت میں قائم چاند پوری اس کے زمزمہ سنج تھے۔نہال سیوہاروی اردو کے ایک بڑے شاعر تھے۔جگر مرادآبادی کے بارے میں یہ بات کم لوگ جانتے ہیں کہ انھوں نے شاعری نگینہ میں ہی رہ کر سیکھی جب وہ جوان تھے اور میونسپلٹی نگینہ میں ملازم تھے۔ پرکاش چند مونس سیوہارہ کے رہنے والے تھے۔داغ دہلوی کے شاگرد رہے نہایت عمدہ شاعر رہے۔موجودہ عہد میں ضلع میں کم ازکم بیس خوش کلام شاعر ہیں جن میں رفعت سروش اور ہلال سیوہاروی تمام بیرون ممالک میں شریک ہوئے رفعت سروش نے قریب قریب ہر ادارے سے انعام حاصل کیا ہے۔نگینہ کے محمد عرفان رومانی بڑے ادیب، غالب کے نقاد اور اعلیٰ شاعر ہیں۔ان کے علاوہ اطہر شکیل نگینوی، شجاع الدین قمر سیوہاروی، ابرار حسین کرت پوری، افسر بجنوری، فاخر ادیب، معین شاداب، شکیل جمالی، عبدالغفار دانش، اسد رضا، بینا نہٹوری اور، ڈاکٹر احتشام، تشنہ نگینوی، ڈاکٹر داؤد ملتانی اور ڈاکٹر عمران ساغر کے نغموں سے فضائیں گونجتی ہیں۔

معاشرہ میں بیماری کے علاج کا انتظام نہ ہو تو سماج کا برا حال ہو جائے۔ضلع بجنور میں اچھے سے اچھے حکیم اور ڈاکٹر رہے۔بجنور کے حکیم رحیم اللہ بڑے حاذق طبیب تھے۔حکیم

اجمل خاں دہلی والے اپنے مریض ان کے پاس بھیجتے تھے۔ سیوہارہ کے حکیم صلاح الدین مرحوم بھی بہت ماہر طبیب تھے۔ حکیم عبداللہ مرحوم نگینوی حکیم اجمل خاں کے سکریٹری بھی رہے۔ نندن وید مشہور وید تھے ڈاکٹر حنیف بیگ ہارٹ سرجن منڈاور کے، ڈاکٹر انل وج، نگینہ کے، ڈاکٹر محسن ولی صدر جمہوریہ کے فزیشین بجنور کے تھے اور ڈاکٹر راج ویر سنگھ ہارٹ اسپیشلسٹ نہٹور کے تھے۔

فلم کے دائرہ میں بجنور کے مشہور ہندوستانی فلم ڈائریکٹر پرکاش مہرا کا نام کون نہیں جانتا۔ پر ان کے ساتھ نگینہ کے این. کے. سنگھ فلم ڈائریکٹر رہے۔ چمن لال شرما ہاکی کے نامور کھلاڑی تھے۔

نوجوان طبقہ سے بھی کچھ نام زبان پر آنے ضروری ہیں۔ جن میں ڈاکٹر محمد اطہر نگینوی کو یونیسکو کا ''ینگ سائنٹسٹ'' کا ایوارڈ ملا، وہ کولمبیا یونیورسٹی میں کینسر ریسرچ کر رہے ہیں۔ نہٹور کے سلمان سمیع امریکہ میں تجارت کرتے ہیں بلینیر ہیں۔ ڈاکٹر انیس عالم سرائے حبیب چاند پور کے کیلیفورنیہ یونیورسٹی میں کینسر ریسرچ کر رہے ہیں۔ نگینہ کے حفیظ الرحمٰن ابراہیم ٹہری کے ایسوی ایسٹ ڈائریکٹر، انرجی ایکسپرٹ ہیں اور مشہور عالم بوسٹن یونیورسٹی امریکہ سے ۶ جلدوں میں مطبوعہ انرجی انسائکلو پیڈیا میں ہندوستان کی انرجی پر ان کا مقالہ شامل کیا گیا ہے۔

معاشرے کے حقوق کی حفاظت ایک طرف، اور عدالتوں کی رہنمائی ایک طرف از بس ضروری ہے اور یہ خدمت کسی سوسائٹی کے وکلاء ہی انجام دے سکتے ہیں۔ سرتیج بہادر سپرو، آصف علی بیرسٹر، حافظ محمد ابراہیم، وشوامتر، شانتی بھوشن ضلع بجنور کے بہت ممتاز اور لائق وکیل تھے۔ سید ضرار حیدر نہٹوری لائق وکیل تھے ہائی کورٹ کے جج بنے۔

کسی قوم کی حفاظت ایک حد تک فوج کے ذمہ بھی ہے کرنل ظفر علی وارثی آرمی ہیڈ کوارٹر دہلی میں آرڈیننس برانچ کے ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن تھے ان کی بہادری پر ان کو سینا میڈل سے نوازا گیا تھا۔ یہ بجنور کے رہنے والے تھے۔

''باشندگان ضلع بجنور زندہ باد، پائندہ باد''

0931345307

ادبی انجمن - اقبال احمد صدیقی

جب کوئی چراغ روشن ہوتا ہے تو اس کی روشنی کی جانب سب کی توجہ ہوتی ہے اور اس روشنی سے اس محفل کی تاریکی دور ہو جاتی ہے۔ لوگ چراغ اور اس کی روشنی کو دیکھتے ہیں لیکن اس چراغ کو کس نے روشن کیا؟ چراغ کی روشنی میں تیل اور روئی کی بتی کی کیا اہمیت اور قربانی ہے؟ اس جانب کم ہی لوگ دیکھتے ہیں۔ گزشتہ چالیس برس میں اردو شعر و ادب کی محفل میں ضلع بجنور کے جو چراغ اپنی روشنی سے فیض پہنچا رہے ہیں ان میں بہت سے چراغوں کو روشنی عطا کرنے، ان کی حوصلہ افزائی کرنے اور ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے کا کام اقبال احمد صدیقی نے بے لوث کیا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام سکریٹری رہ چکے اقبال احمد صدیقی نے ہمیشہ اردو کے فروغ کے لئے کام کیا۔ خاص طور پر نئے قلمکاروں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی کی بلکہ ان کے پروگرام ریڈیو پر نشر کرا کر خود اعتمادی بھی پیدا کی۔ اپٹا اور آل انڈیا ریڈیو کے بینر سے انہوں نے ڈرامہ نگاری کو بھی فروغ دیا۔ ادبی محفلیں سجانے اور انہیں رونق بخشنے کے لئے اقبال احمد صدیقی اب بھی سرگرم رہتے ہیں۔ کئی ادبی انجمنوں سے وابستہ اقبال احمد خود میں ایک انجمن ہیں۔ اقبال احمد کی پیدائش 1950 میں بجنور شہر کی معروف شخصیت کرم الٰہی صاحب کے یہاں ہوئی، ایم۔ اے۔ (معاشیات) بجنور سے کیا۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ملازمت کا سلسلہ شروع کر کے اپنے ضلع بجنور کے نجیب آباد ریڈیوں اسٹیشن سے وداع لی۔ ملازمت کے دوران اقبال احمد نے اپنا وقار قائم کیا۔ ساتھ ہی ادب کو پروان خود بھی چڑھایا اور اردو کی نئی نسل تیار کرنے میں معاون ثابت ہوئے اور یہ عمل اب بھی جاری ہے۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی

اُردو کی ترقّی میں ضلع بجنور کا کردار

اقبال احمد صدیقی

مغربی اتر پردیش کے اضلاع میں ضلع بجنور کی سرزمین ادب اور دوسرے علوم وفنون کے تعلق سے کافی زرخیز رہی ہے۔ پہاڑی (ہمالیائی) سلسلے سے ملحق اس ضلع کی نرم وسرد اور گرم آب وہوا اور یہاں کے خوشگوار موسموں اور دلکش نظاروں نے جہاں مہابھارت کے وِدُر جی کو اپنی طرف کھینچا وہیں قدیم تاریخی اور مذہبی کردار شکنتلا کی زندگی کا ایک اہم باب بھی نانگل قصبہ سے جُو کر تاریخ کا ایک اہم باب بن گیا۔ تاریخ اس بات کی بھی گواہ ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں سے قبل اور پھر انگریزوں کی غلامی سے لے کر آزاد ہندوستان کی تعمیر تک اہالیانِ بجنور نے اپنے جان ومال کی قربانیاں دیکر ہندوستان اور دیگر ممالک میں اپنے کارناموں سے ضلع کا نام روشن کیا ہے۔ ادب وآگہی اور فکر ودانش کی کئی بڑی بڑی ہستیاں اس سرزمین میں پیدا ہوئیں جن پر ضلع کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

آیئے حضرات نظر ڈالتے ہیں بجنور کی چند ایسی شخصیات پر جن کی ادبی کاوشوں اور خدمات کی نہ صرف ملک بھر میں پزیرائی ہوئی بلکہ تمام ادبی دنیا میں جنھوں نے کامیابی کے جھنڈے گاڑے اور بجنور کا نام روشن کیا۔ ضلع کے چاندپور جیسے چھوٹے سے قصبہ میں اردو ادب کی ایسی معیاری شخصیات پیدا ہوئی جن پر بجنور بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ قائم چاندپوری، حکیم کوثر چاندپوری، راہی حمیدی چاندپوری، اور دورِ حاضر میں شکیل جمالی چاندپوری، اطہر اعظمی، پرویز اختر

ایسے ہی ادبی نام ہیں جن کی ادبی خدمات سے دنیائے ادب اچھی طرح واقف ہے۔ سودا، میر اور درد کے زمانے کے قائم چاند پوری کی ادبی خدمات سے کون واقف نہیں ہے۔ حالانکہ آج بھی ان کے نام پر سمینار اور سمپوزیم ہوتے رہتے ہیں اور ان حضرات کی ادبی کاوشوں کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ مگر جتنی پزیرائی ہونی چاہئے تھی وہ نہیں ہوئی۔

اردو ادب کا ایک اور روشن ستارہ شمس العلما ڈپٹی نزیر احمد ریہڑ، ضلع بجنور میں ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۸۹۷ میں انھیں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ مگر یہ بھی کیا کم ہے کہ مولوی نذر احمد اردو کے پہلے ناول نگار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ انھوں نے اردو ناول کو نئے رنگ و آہنگ میں پیش کیا۔ ان کا ایک اور عظیم کارنامہ قرآن کریم کا ترجمہ ہے۔ تعلیم نسواں کے تعلق سے بھی ڈپٹی نزیر احمد نے نہایت سبق آموز اور دلچسپ کتابیں لکھیں۔

ضلع بجنور کے قصبہ سیوہارہ کی اگر بات کریں تو شمبھو سنگھ دانش، پرکاش چند جین، پروفیسر گیان چند، غالب کے نقادوں میں ایک بڑا نام پروفیسر خورشید الاسلام، طنز و مزاحیہ شاعری کا ایک درخشندہ ستارہ ہلال سیوہاروی جس نے ملک و بیرون ملک اپنی طنز و مزاح کی شاعری سے سیوہارہ اور ضلع کا نام روشن کیا۔ کہتے ہیں جب جب غالب کو یاد کیا جائیگا سیوہارہ کے ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری کو بھی یاد کیا جائیگا۔ ان حضرات کی علم شناسی اور ادبی کارناموں کی وجہ سے دنیائے ادب میں ان لوگوں کے نام روشن ہیں۔

ناول نگاری کو نقطۂ عروج پر پہنچانے والی ایک اور خاتون قرۃ العین حیدر کی پیدائش قصبہ نہٹور میں ہوئی تھی۔ جنھوں نے صرف ۲۲ سال کی عمر میں ۱۹۴۹ء میں اپنا پہلا ناول "میرے بھی صنم خانے" لکھ کر ناول نگاری میں اپنی برتری درج کروا دی تھی۔ سادات کے مشہور خاندان میں معروف ادیب افسانہ نگار اور شاعر سجاد حیدر یلدرم اور افسانہ نگار نذر سجاد کے گھر تولد ہوئیں۔ ادب کی اس عظیم ہستی نے اردو افسانہ نگاری میں اپنا منفرد مقام پیدا کیا۔ مزدوروں اور کسانوں کی زندگی کو موضوعات بنا کر ناول نگاری کا اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ ۱۹۸۹ میں ان کو ادبی خدمات کے اعتراف میں "گیان پیٹھ" ایوارڈ دیا گیا۔ یہ دوسرا موقع تھا جب کسی اردو ادیب کو اس کی ادبی خدمات کے

سلسلے میں گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا تھا ان کے فراق گورکھپوری کو اور بعد میں شہر یار کو بھی یہ ایوارڈ حاصل ہو چکا ہے۔ 'سفینۂ غمِ دل' کے بعد ۱۹۵۸ء میں اردو ادب کا وہ سب سے بڑا ناول بھی منظرِ عام پر آیا جس کو لوگ ''آگ کا دریا'' کے نام سے جانتے ہیں۔ ان کے علاوہ اسی خطّہ سے عزیز نہٹوری، بینا نہٹوری اور امیر نہٹوری بھی ہیں جنھوں نے اپنی ادبی و علمی خدمات کے ذریعہ دنیائے ادب میں نام کمایا اور ضلع کا نام روشن کیا ہے۔

قصبہ کرت پور کے قاضی سجّاد حسین کرت پوری، مراثی و نوحہ خوانی میں حیدر کرتپوری جاسوسی اور فکشن ادب کو فروغ دینے اور ایک ہزار سے زیادہ ناولوں کے مصنّف اظہار آثر کرت پوری اور عصرِ حاضر کے شاعروں میں شنا ور کرت پوری، واحد جمال کرت پوری کے علاوہ ابرار کرت پوری، عشرت کرت پوری، ارشد کرت پوری ایسے نام ہیں جن کا شمار ہندوستان کے نامور شعراء میں ہوتا ہے۔

اردو ادب کو پروان چڑھانے اور عصر حاضر میں اردو کے ارتقاء میں بھرپور تعاون کے لئے انجینئر سمیع الدّین کا نام آتا ہے۔ حبیب والا (دھام پور) کے رہنے والے اس انجینئر نے اپنی تصانیف سے اہلِ علم اور اہلِ ادب سے داد و تحسین حاصل کی ہے۔ آپ کی مختلف موضوعات پر کم و بیش ۲۰ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ پروفیسر عرفان صدیقی، ڈاکٹر وسیم اقبال، پرویز عادل، ڈاکٹر شیخ نگینوی اردو کے حوالے سے اہم خدمات انجام دے رہے ہیں، جن کے تذکرے علم و ادب کی محافل میں خوب ہو رہے ہیں یہ حضرات اردو زبان کو فروغ دینے میں دن رات مصروف رہتے ہیں۔

آیئے حضرات ایک نظر ڈالتے ہیں اس سرزمین پر جس کو لوگ نجیب آباد کے نام سے جانتے ہیں۔ ماضی کے شعری اور ادبی منظر نامے پر ایسے کئی نام روشن ہیں جن کی آب و تاب سے دنیائے اردو ادب مینارۂ نور بنی ہوئی ہے۔ علاّمہ تاجور نجیب آبادی، اکبر شاہ خاں نجیب آبادی، اختر الایمان جیسے دنیائے ادب کے آبگینے اسی سرزمین سے تعلّق رکھتے تھے۔

تاریخ اسلام کے مرتّب اکبر شاہ خان جن کی تصنیف تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور

یہ ان کا مستند کارنامہ ہے جوان کو محقق، مؤرخ اور اردو اسکالر کی حیثیت عطا کرتا ہے۔ اسی طرح رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہرؔ جو ہندوستان کی جنگِ آزادی کے عظیم مجاہد، عظیم مفکر وشاعر اور مشہور صحافی بھی سرزمین نجیب آباد میں پیدا ہوئے تھے۔

اختر الایمان، نجیب آباد کے قریب راہوکھیڑی میں ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ آپکا شمار ادبی دنیا کے عظیم نظم گوشعراء میں کیا جاتا ہے۔ ن۔م۔ راشد اور میراجی کے ساتھ اختر الایمان کا نام بھی ادبی دنیا میں احترام سے لیا جاتا ہے۔ یہ وہ نام ہے جس کی شاعری نے اردو شاعری کو بین الاقوامی شاعری کے مقابل کھڑے ہونے کی ہمت عطا کی ہے۔ ان کی ادبی خدمات پر ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ عطا کیا گیا ہے۔ ان شخصیات کے علاوہ جلیسؔ نجیب آبادی، مرغوب علی، طنز ومزاح کے مشہور شاعر عزیزؔ نجیب آبادی، سوزؔ نجیب آبادی عصرِ حاضر میں اپنی اردو نوازی اور ارتقائے اردو میں فعال ہیں۔

اردو زبان کی ترقی وفلاح ومعاونت میں اہالیانِ بجنور کی خدمات کا جائزہ لینا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ یہاں ان کی اردو سے متعلق کوششوں اور کاوشوں کا مختصراً جائزہ لیا جارہا ہے۔ عصر حاضر میں ادب وشاعری اور صحافت کی نگاہ سے اگر دیکھیں تو سہارا (اردو ڈیلی) اخبار کے ایڈیٹر سیّد اسد رضا نقوی، محترمہ ذہین فاطمہ گلؔ، شفقؔ بجنوری، انورؔ بجنوری، ولیؔ بجنوری، وقار عالم وقار، وطن پرستی کے گیتوں کے لئے مشہور شاعر فاروقؔ بجنوری، ظفر ایوبیؔ امیرؔ نہٹوری، اثرؔ ایوبی، مرغوبؔ رحمانی، امینؔ بجنوری، ڈاکٹر عتیق دانش، شاہ نواز عالم ٹی.وی. اینکر، فاخرؔ ادیب ایسی ادب شناس شخصیات ہیں، جو آج اردو زبان کی آبیاری میں مصروف ہیں۔ انھیں تذکروں میں ایک نام ایسا بھی جس کو دنیائے ادب شکیل احمد خاں شکیلؔ کے نام سے جانتی ہے۔ تاریخ اردو ادب ضلع بجنور کے مؤلف ہیں، مشہور شاعر اور ادب نواز ہیں۔ جنھوں نے ۱۰۰ سالہ اردو صحافت ضلع بجنور حال ہی میں مرتب کی ہے۔

ماضی پر نظر ڈالی جائے تو شاعری اور صحافت کے حوالے سے نشترؔ خانقاہی، مشہور اردو میگزین ''روبی'' کے ایڈیٹر رہے افسر جمشیدؔ، صوفی شاعر زم زم بجنوری، حکیم اخترؔ زیدی، مشہور و

معروف شاعر یامین خاں شوق بجنوری، پاکستان چلے جانے والے شاعر وادیب نور بجنوری اور اختر بجنوری کے علاوہ ڈاکٹر شرافت حسین مرزا، اردو ہندی روزناموں کے مالک و ایڈیٹر بابو سنگھ چوہان، عالمی شہرت یافتہ شاعر چندر پرکاش جوہر بجنوری، رام کمار ور ماغم بجنوری جیسے لوگ یہاں پیدا ہوئے اور اردو کی ترویج اور ارتقاء کے لئے زندگی بھر کوشاں رہے یہاں پر فرداً فرداً سب کی تفصیل میں جانا ممکن نہیں ہے۔ ہاں ایک نام ایسا ضرور میری نگاہ میں ہے جس کی ادبی و شعری خدمات کا میں معترف بھی ہوں اور یہاں میں ان کی تصانیف کا مفصل جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ اس شخص کو لوگ نشتر خانقاہی کے نام سے جانتے ہیں۔ اگر ان کے بارے میں اختصار سے کام لوں تو بے جا ہوگا جب تک ان کے فن اور شخصیت کا مختصر جائزہ نہ لیا جائے۔

دنیائے اردو ادب میں جہاں جہاں بھی یہ خوبصورت زبان بولی، پڑھی اور سمجھی جاتی ہے وہاں وہاں نشتر خانقاہی کا نامِ نامی بڑے احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ سیّد انوار حسین نام اور نشتر خانقاہی تخلص رکھنے والا یہ شخص ۱۹۳۰ء میں بجنور کے نزدیک جہان آباد میں سیّد محمد حسین کے گھر عالمِ وجود میں آیا۔ فارسی اپنی والدہ سے پڑھی باقی تعلیم بجنور میں مکمل کرنے کے بعد تلاش معاش میں دہلی چلے گئے۔ اپنی زمینداری کا گھرانہ ان کو کبھی راس نہ آیا۔ کچھ دن گزارنے کے بعد ممبئی چلے گئے پھر دوبارہ لوٹے تو دہلی میں مشہور ادبی رسالہ ''بیسویں صدی'' میں کام کیا۔ دہلی ہی سے ایک ادبی میگزین ''سو برس'' کی دارت کی۔ پھر بجنور کی طرف کوچ کیا تو بابو سنگھ چوہان جو خود اردو داں اور اردو دوست تھے، کے اخبار ''روزانہ خبر جدید'' کے ایڈیٹر بن گئے۔ بعد میں بجنور ٹائمز میں ہی آخر تک ادارت بھی کی۔

آپ کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا اس لیے کم عمری ہی سے شعر کہتے تھے۔ وہ شاعری کو اندرونی کیفیات کے اظہار کا وسیلہ سمجھتے تھے اور شاعری کے نئے رجحانات سے اچھی طرح واقف تھے اردو میں ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آ کر اردو علم وادب کی دنیا سے خراج حاصل کر چکے ہیں۔

آپ کا پہلا مجموعہ ''میرے لہوں کی آگ'' جو غالباً ۱۹۷۳ میں منظر عام پر آیا اور جس کی

بدولت یہ شاعر ملک کے صفِ اوّل کے شاعروں میں شمار کیا جانے لگا۔اس کے ذریعہ نشتؔر خانقاہی کے کلام کی خوب پزیرائی ہوئی۔ دانشوروں اور علم و ادب پر نظر رکھنے والوں نے ان کی شعری صلاحیت، اصلوب واظہار کی جدّت طرازی کا بھرپور اعتراف کیا۔ دنیائے اردوادب کے مشہور ناقد اور نشتؔر خانقاہی کے ہم عصر ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا :

''نشتر خانقاہی کے کلام کا نمایا پہلو یہی ہے کہ وہ اس آواز میں گفتگو کرتے ہیں جس کو ایلیٹؔ نے شاعری کی پہلی آواز کہا ہے اور جس کا مخاطب کوئی نہیں ہوتا صرف شاعر ہوتا ہے۔ نشتر خانقاہی کی شاعری خودکلامی نہیں جسے قاری اچانک کہیں سے..........''

نقادوں نے نشتؔر خانقاہی کی شاعری کو عالمی شاعری کے حوالوں میں رکھا ہے۔ کسی بھی ادبی تخلیق میں تین عناصر بنیادی حیثیت رکھتے ہیں یعنی شاعر یا ادیب کا ماحول اس کا ذہن اور زبان انہی تینوں عناصر کے زیر اثر شعری یا نثری ادب تخلیق ہوتا ہے۔ ایک بات یہاں میں بڑی مضبوطی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ شاعر وادیب عظیم تب ہی بنتا ہے جب وہ اپنے زمانے سے آگے کا ادب تخلیق کرتا ہے۔ اس میں غالبؔ کی مثال دی جاسکتی ہے کہ غالب نے بھی ایک دو صدی آگے کی شاعری کی تھی۔ نشتر خانقاہی کی شاعری کے بارے میں بھی دانشوروں اور نقادوں کی رائے ہے کہ انھوں نے آنے والی صدی کی شاعری کی ہے۔

کسی شاعر کو جدید کہنا بھی ایک روایت جیسی چیز ہوگئی ہے۔ لیکن نشتر خانقاہی کے ساتھ ایسا نہیں ہے ان کو صرف جدید کہہ دینے سے کام نہیں بنتا۔ ان کی اندرونی ذات میں جو اُتھل پُتھل ہوتی تھی۔ وہ ان کی شاعری میں نمایاں طور پر نظر آجاتی تھی۔ نشتؔر خانقاہی کی شاعری میں جتنا کرب، جتنا درد، جتنی تنہائی ملتی ہے۔ وہ سب انکا جھیلا ہوا ہوتا تھا، بھگتا ہوا ہوتا تھا۔ اور اسی کے سہارے وہ مستقبل کا پیشگی تجربہ کر کے شاعری کو ایک نئی سمت کی طرف لے جاتے تھے۔ ان کے شعر فکر انگیز بھی ہوتے ہیں اور دردناک بھی۔ مثال کے طور پر ان کے یہ اشعار

قہقہوں کے پسِ پردہ دیکھے کوئی مجھ میں شہرِ خموشاں تمناؤں کا

ہر وہ خواہش کہ جو تشنہ لب رہ گئی میرے سینے کا ناسور کردی گئی

یا

کٹی پھٹی سی زمیں اور جھکے جھکے سے شجر
قریب جا کے جو دیکھا جہان مجھ سا تھا

یا

انجانے حادثات کا کھٹکا لگا رہا
نیند آرہی تھی رات مگر جاگتا رہا

اور اسی طرح کے کئی اشعار، کئی نظمیں ان کے مختلف مجموعوں میں ملتے ہیں۔ تجربات نے ان کے ذہن کو شعری منظر نامہ تخلیق کرنے کا ک جو شعور عطا کیا ہے۔ وہ ان کے ہم عصر شاعروں اور ادیبوں میں کہیں کہیں ملتا ہے عموماً نہیں۔ میں نے نشتر صاحب کی شاعری میں گتھیاں بھی پائی ہیں اور شعروں میں فلسفہ بھی۔ نشتر صاحب کی شاعری کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں اظہار و بیان مقدم اور شعری موضوع یا خیال ثانوی حیثیت میں پایا جاتا ہے۔ ایسا میرا خیال ہے۔ پاکستان کے مشہور شاعر اور ادیب امجد اسلام امجدؔ نے ان کی شاعری کا جائزہ اس طرح لیا ہے :

''نشتر خانقاہی کا سفاکانہ حد تک حقیقت پسندانہ اندازِ فکر اردو غزل کے لئے بالکل نئی چیز ہے۔ انصاف سے دیکھئے تو نشتر خانقاہی نے زندگی، وقت، معاشرتی استحصال اور احساسِ محرومی کے مختلف رنگوں کو بڑے تواتر اور عام طور پر بڑی عمدگی سے استعمال کیا ہے.....''

نشتر خانقاہی کے اشعار ہمیں ان کی زندگی کے ایسے احوال و کوائف تک پہنچاتے ہیں جہاں سے شاعر اپنی شاعری کا مواد حاصل کرتا ہے۔ وہ اسی معنی میں اوروں سے مختلف شاعر ہیں کہ ان کی شاعری کسی خاص نظریہ کے تابع نہیں ہے۔ جدیدیت کے طوفان سے بھی انھوں نے خود کی حفاظت کی ہے۔ اپنی شاعری میں نیا اسلوب ضرور اختیار کیا مگر محمد علوی اور عادل منصور کی طرح افراط و تفریط کا شکار نہیں ہوئے اور ہر حال میں شاعری کی حرمت کا خیال رکھا۔

نشتر خانقاہی کے شروع کے دو تین مجموعے ''میرے لہو کی آگ'' سرائے میں شام''

''دسترس'' کی شاعری میں ایک نادیدہ خوف چھپا ہوا ملتا ہے۔ان کی شاعری پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ خیالات کے اظہار پر تو وہ پوری دسترس رکھتے ہیں۔ مارچ ۲۰۰۶ کو شام چھ بجے ایک چھوٹے سے آپریشن کیبعد آپکا انتقال ہوگیا۔ اور دنیائے شعروادب جدید لب ولہجے کے ایک اچھے شاعر سے محروم ہوگئی، انھیں کا ایک شعر۔

میں کہ سرجن کی ٹیبل پہ رکھا ہوا صرف اک جسم ہوں تجربہ گاہ میں
آج کی رات گزری تو یہ چارہ گر کل لگا دینگے فائل میں لکھکر مجھے

شاعری اور نثری تخلیقات کے علاوہ بجنور سے نکلنے والے اردو کے کئی اخبارات نے بھی اردو ادب کی ترقی میں اہم رول ادا کیا۔'مدینہ' جن میں سرفہرست ہے اس زمانے کے عالمی شہرت یافتہ صحافیوں نے مدینہ اخبار میں خدمات انجام دی ہیں۔خود مدینہ اخبار کے مالک مولوی مجید حسن بے باک صحافی وادیب تھے۔اس کے علاوہ بجنور میں اور بجنور سے ملحق تحصیلوں میں کئی فعال اردو انجمنیں موجود ہیں۔جو گاہے بگاہے شعری نشستیں، مشاعرے، سیمنار اور سمپوزیم کراتی رہتی ہیں جو ارتقائے اردو میں معاون ہوتے ہیں۔

اردو کے حوالے سے بجنور میں ایسی کئی فعال شخصیات پہلے بھی تھیں اور آج بھی موجود ہیں جو اپنی محنت اور لگن سے اردو کے نازک پودھے کی آبیاری میں لگے ہوئے ہیں جیسے چاند پور میں جناب الیاس انجم، سیوہارہ میں جناب قمر سیوہاروی، نگینہ میں حسن جاوید، ڈاکٹر شیخ نگینوی، پرویز عادل۔نجیب آباد میں شاداب ظفر شاداب، بجنور میں راقم الحروف کے علاوہ فاروق بجنوری، حسنین نقوی، مرزا طالب بیگ، ڈاکٹر عتیق دانش، مرغوب رحمانی وغیرہ وغیرہ۔

آخر میں اس مضمون کے حوالے سے میں ان سبھی محبانِ اردو اور عاشقان ادب کو سلام پیش کرتا ہوں اور اردو نوازی کے لیے تحسین پیش کرتا ہوں۔

رابطہ:09760512256

ماہر لسانیات و اقبالیات: عشرت جاوید

کسی بھی شخص کو بنانے میں مطالعہ کا اہم کردار ہوتا ہے۔ مطالعہ جس شخص کا جتنا وسیع ہوگا وہ شخص اتنا ہی دانشورانہ خصوصیات کا مالک ہوگا۔ آج انٹرنیٹ اور ٹی وی نے نئی نسل سے مطالعہ کا اہم شغل چھین لیا ہے۔ لیکن بیسوی صدی کے لوگ آج بھی کتب بینی کو قائم رکھے ہوئے ہیں اور اپنی تشنگی کو سیراب کرنے کا سلسلہ بنائے ہوئے ہیں ساتھ ہی انٹرنیٹ سے بھی بھرپور افادہ اٹھا رہے ہیں۔ میری مراد ماہرِ تعلیم ،ماہرِ تاریخ اور ماہرِ اقبالیات وعلم فلکیات کے زبردست جانکار عشرت جاوید سے ہے۔

عشرت حسین کی ولادت 23 جنوری 1945 کو نگینہ کے محلہ جتی میں اللہ دیا صاحب کے یہاں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم نگینہ کی درسگاہوں میں ہوئی۔ عشرت حسین کے بہت قریبی دوست سید جاوید علی جعفر شاہ کا نوعمری میں انتقال ہو گیا اور اس کا اثر عشرت حسین پر بھی پڑا۔ دوست کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے عشرت حسین نے اپنا قلمی نام بدل دیا۔ اور عشرت حسین ''جاوید'' ہو گئے۔ عشرت جاوید کو بچپن سے ہی مطالعہ کا شوق رہا۔ اور اس شوق کو پورا کرنے کے لیے ایک بڑی ذاتی لائبریری بھی قائم کر رکھی ہے۔ انھوں نے اقبال کا مطالعہ کیا۔ اقبال کے ساتھ اسلام و تاریخ ہند بھی ان کا شغل رہی۔ انھوں نے ایم اے اردو، ہندی، عربی، انگلش، سنسکرت، تاریخ مضمون میں کرنے کے ساتھ بی ایڈ کی ڈگری بھی حاصل کی۔ عشرت جاوید نے ذریعہ معاش درس و تدریس کو اپنایا اور کندرکی ضلع مرادآباد کے ایک جونیر ہائی اسکول میں ملازمت کے ساتھ اس اسکول کو اپنی صلاحیت سے انٹرمیڈیٹ کالج بنایا اور ریٹائرمینٹ تک پرنسپل کے عہدے پر بنے رہے۔

ملازمت کے دوران ان کے اندر بیٹھا ادیب اور قاری بھی زندہ رہا۔وسیع مطالعہ اور تخلیقی ذہن ہونے کی وجہ سے عشرت جاوید نے ''عشق رسول''،''بیباک صداقت'' دو کتابیں مرتب کر کے شائع کرائیں۔جن کو قارئین نے بیحد پسند کیا اور چند دنوں ہی میں دونوں کتابوں کے نسخے مارکیٹ سے ختم ہو گئے۔ہندوستانی سیاست میں دلتوں اور مسلمانوں کی حیثیت''، سلگتے سوالات''،''حضرت محمدؐ اور اسلام'' ان کی دیگر تصانیف ہیں۔جبکہ اللہ کے متقی بندوں کے سو سے زیادہ واقعات پر مشتمل کتاب ''اہل تقویٰ'' زیرِ طباعت ہے۔عشرت جاوید ان دنوں انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا سے جڑے ہیں اور وہ اپنے اور سرکل کے علم میں اضافہ کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی

اردو اور ضلع بجنور کا تاریخی پس منظر

عشرت جاوید

ہندوستان کے شمال مغرب میں واقع یو پی کا ضلع بجنور جہاں ایک طرف پرانی ہندو سنسکرتی کا علمبردار ہے وہیں گنگا جمنی تہذیب کا مرکز بھی ہے۔'ودر کٹی'' جہاں ''دروڑا چاریے'' سے ناراض ہو کر'' مہاتما ودر'' نے اپنا ٹھکانا بنایا تھا اور دوسری طرف کنور رشی مہاراج کا آشرم ہے جہاں ''شکنتلا'' سے شادی رچا کر ہستنا پور کا راجا دشینت کمار اس کو بھول گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بیٹے'' بھرت'' کے نام پر بھی ہندوستان کا نام بھارت ہے۔ اسی کی کہانی ''ابھگیان شکنتلم'' کالی داس کا شاہکار بنی۔ اسی کہانی نے کالی داس کو سنسکرت لٹریچر کی اتنی عظیم شخصیت بنایا۔ مہابھارت کی جنگ کی آنچ یقیناً بجنور تک ضرور پہنچی ہوگی۔

بھارت کی تاریخ کا متوسط دور مسلم حکمرانی کا زمانہ ہے۔ بجنور کی تاریخ کا یہ زمانہ بھی کم دلچسپ نہیں ہے۔ ایک طرف اس کو شیر شاہ سوری کی شکارگاہ ہونے کا شرف حاصل ہے تو دوسری طرف مغل شہزادی کی آخری خواب گاہ بننا بھی اسی کو نصیب ہے، بادشاہ شاجہاں کی بیگم کا علاج شاجہاں آباد موجودہ جہاں آباد بسانے کا سبب بنا۔ بجنور کے ایک افغان سردار کی رسائی اور اہمیت مغل دربار میں اتنی بڑھی کہ بادشاہ شاہ عالم ثانی نے اس کو نجیب الدولہ کا خطاب دے کر مدار المہام بنا دیا۔ روہیل کھنڈ کا ایک بہت بڑا حصہ ان کی ریاست میں دے دیا۔ اور بہت مدت تک نجیب آباد کو روہیل کھنڈ کے دارالخلافہ کی حیثیت حاصل رہی۔ 1857 کی جنگ آزادی کے زمانے میں ضلع کے تمام انگریز افسروں کو کھدیڑ کر نواب محمود خاں کے ذریعہ قومی حکومت قائم کر لی گئی۔ جس کی توثیق بہادر شاہ ظفر نے مظفر یار جنگ کے خطاب کے ساتھ کی۔ اردو ادب کی ایک اور مایہ ناز

شخصیت سیوہارہ ضلع بجنور نے پیدا کی، جو عالمگیر شہرت کی مالک بنی۔ یہ ہیں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ان کا علمی مضامین کا مجموعہ ''مقالات بجنوری'' کے نام سے شائع ہوا۔ جو انشاپردازی کا شاہکار ہے۔ اس کی تعریف اور پسندیدگی میں ہند اور بیرون ہند سے سیکڑوں خطوط موصول ہوئے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے 1940 میں ان کا ایک مجموعہ ''باقیات بجنوری'' کے عنوان سے شائع کرایا اور 1951 میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے راولپنڈی سے ''یادگار بجنوری شائع کی۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا اردو زبان اور ادب کے سب سے نایاب شاہکار ''محاسن کلامِ غالب'' ہے کہتے ہیں کہ غالب کو غالب کرنے کا کام دو تنقیدی کاموں کا ہے۔ ایک حالی کی ''حیات جاوید'' اور دوسری ڈاکٹر بجنوری کی ''محاسن مرزا غالب''۔ افسوس ڈاکٹر بجنوری کی عمر نے وفا نہیں کی اور 33 رسال کی عمر میں انتقال کر کے کیٹس، شیلی اور بائرن کی صف میں شامل ہو گئے۔

جدید اردو نثر کے عناصر خمسہ میں سے کم سے کم دو کی وابستگی ضلع بجنور سے رہی ہے۔ شمس العلماً مولوی نذیر احمد جو ڈپٹی نذیر احمد کے نام سے معروف ہیں، وہ ضلع بجنور کی تحصیل نگینہ کے ایک گاؤں ریہڑ کے رہنے والے تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ عرصہ دراز سے یہاں قیام پزیر تھے۔ یہ فروغ اسلام کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی خدمت بھی انجام دے رہے تھے۔

دوسرے سرسید احمد خاں ہیں جو، بسلسلہ ملازمت، کافی عرصے تک بجنور میں صدرامین کے عہدے پر فائز رہے۔ ان کے بہت سے علمی اور ادبی کارنامے ضلع بجنور سے وابستہ ہیں۔ ۱۸۵۷ کی تحریک آزادی کے وقت اردو جدید نثر کے یہ دونوں درخشندہ ستارے افق بجنور پر چمک رہے تھے۔ اس سے پہلے اردو نثر کا ایک روایتی اسلوب تھا جس میں مقفع اور مسجع نثر لکھنے کا ہی رواج تھا۔ سب سے پہلے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ بعدہ مولانا محمد حسین آزاد اور اس کے بعد مرزا غالب نے اس روایت سے بغاوت کی بعدہ ڈپٹی نذیر احمد اور سرسید احمد خاں نے اس کو اپنایا۔ انھوں نے نثر کو شاعری کے انداز سے ہٹا کر عام بول چال کے طرز پر ڈالا اور سادگی، سلاست اور عام فہم ہونے کی جانب توجہ مرکوز کی مولوی نذیر احمد کا قلم اردو کی جس صنف کی طرف بڑھا وہ نثر پر ہی مبنی ہے، یعنی ناول نگاری۔ ان کو اردو ناول کا باوا آدم ہونے کا فخر حاصل ہے۔

ابھی ''گودان'' کا خالق اور ''اپنیاس سمراٹ'' پیدا بھی نہیں ہوا تھا کہ مولوی نذیر احمد کے ناولوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی ''مراۃ العروس''، ''توبتہ النصوح''، ''نبات النعش''، ''ابن الوقت''، ''فسانہ مبتلا''، ''ایامیٰ'' وغیرہ ناول کے علاوہ ان کے دیگر ادبی کارنامے بھی قابلِ توجہ ہیں بچوں کے ادب پر بھی ان کا کام ہے۔ ترجمہ قرآن اور ترجمہ تعزیراتِ ہند بھی ان کا نہایت اہم کام ہے۔ ان کی تخلیقات میں اخلاقی پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ سر سید احمد خاں اچھے شاعر بھی تھے۔ مگر ان کے نثری کاموں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ بحثیت شاعر ان کی کوئی پہچان نہیں بن سکی۔ بجنور کے قیام کے دوران سر سید احمد خاں نے کئی کتابوں کی تالیف، تصحیح اور اشاعت کا کام کیا۔ اہلِ بجنور کی ۱۸۵۷ء کی جنگ میں نہایت فعال حصے داری رہی ہے۔ اس کو انھوں نے اپنے مزاج کے مطابق سرکشی قرار دیا۔ انھوں نے ''تاریخ سرکشی ضلع بجنور'' کے عنوان سے یہ کتاب شائع کرائی۔ اصل میں یہ ان کا روزنامچہ ہے۔ جو انھوں نے دوران آویزش مرتب کیا تھا، جو اب کمیاب ہے۔ یہیں رہتے ہوئے انھوں نے اپنی معرکتہ لآرا کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' کا مسودہ تیار کیا، جو بعد میں قیام مراد آباد کے دوران شائع کرایا۔ اس دوران انھوں نے بے حساب انشائیہ، مضامین بھی لکھے جو اردو کا نایاب سرمایہ ہے۔ جہاں تک کسی زبان کی ترقی اور فروغ کا سوال ہے، یہ عمل بہر صورت جاری رہتا ہے۔ اگر زبان کی کچھ اصناف اور اصطلاحات امن کے زمانے میں معرض وجود میں آتی ہیں۔ تو ان میں جذبات اور احساسات کی روح اور حقیقت پسندی کا مزاج جنگ کے زمانے میں پیدا ہوتا ہے۔ ضلع بجنور ان دونوں کیفیتوں میں ممتاز اہمیت کا حامل رہا ہے۔ جہاں یہ مرہٹوں، مغلوں اور اودھ کے نوابوں کی آماج گاہ رہا ہے، وہیں انگریزوں اور مرہٹوں کی حربی کشمکش کا مرکز بھی رہ چکا ہے۔ جس بادشاہ شاہ عالم ثانی نے روہیلہ سردار کو نجیب الدولہ اور مدار المہام جیسے اعزازات سے نوازا تھا۔ اسی بادشاہ کی فوج نے مرہٹوں کی مدد سے نجیب الدولہ کے بیٹے ضابطہ خاں پر حملہ کر کے اسے برباد کر کے نجیب آباد کو برباد کر ڈالا اور انجام کار اس کے پوتے غلام قادر خاں روہیلہ نے شاہ عالم کی آنکھیں نوکِ خنجر سے نکال کر اس کو اندھا بنا دیا۔ ڈاکٹر اقبال کے بقول

روہیلہ کس قدر ظالم، جفاجو، کینہ پرور تھا
نکالی شاہِ تیموری کی آنکھیں نوکِ خنجر سے

کسی جنگ آزادی میں روہیلہ سردار نواب محمود خاں کا کردار نمایاں نظر آتا ہے انھوں نے جو قومی حکومت قائم کی ۱۸۵۷ء تھی وہ تقریباً ایک سال چلی۔ اس کے تمام احکامات اردو میں جاری ہوتے تھے۔ بادشاہ دہلی اور نواب محمود کے مابین جو عسکری اہمیت کی خط وکتابت ہوتی تھی، وہ اردو میں ہی ہوتی تھی۔

جس طرح ناول کا باوا آدم پیدا کرنے کا سہرا ضلع بجنور کے سر ہے اسی طرح اردو افسانہ کی داغ بیل ڈالنے والوں میں بھی بجنور کا نام سرِ فہرست دکھائی دے گا۔ سجاد حیدر یلدرم بجنور کے مشہور قصبہ نہٹور میں پیدا ہوئے۔ جس کے باشندوں کے لیے سر سید احمد خاں نے دانشمندان نہٹور کہہ کر پکارا ہے۔ یہ سادات اور زمینداروں کی بستی رہا ہے۔ یہ کیسا حسین اتفاق ہے کہ اردو افسانے سے وابستہ ایک شخص سجاد حیدر یلدرم نے جب ۱۸۸۰ میں گنگا کنارے آباد ضلع بجنور کو زینت ولادت بخشی، تو ٹھیک اسی سال ہندوستانی کہانی کے پیامبر منشی پریم چند نے گنگا کے دوسرے کنارے پر ضلع بنارس میں جنم لے کر اس دار فانی کو اپنا مسکن بنایا۔ سجاد حیدر یلدرم نے اپنے افسانوں کی زبان کو لسانی بھول بھلیوں سے نکال کر سیدھے سادھے لہجے اور روزمرہ کی زبان کا عادی بنایا۔ ۱۹۱۰ میں یلدرم کا پہلا افسانوی مجموعہ ''خیالستان شائع ہوا۔ جس نے اردو ادب میں ایک نئی صنف کی بنیاد رکھی ڈاکٹر اقبال نے اس کو پنجاب اسٹیٹ کے نصاب تعلیم میں شامل کرادیا۔ یلدرم کے افسانوی مجموعہ کے بعد بہت سے افسانوی مجموعہ ''نگارستان''، ''جمالستان'' وغیرہ شائع ہوئے۔ لیکن سنگ میل کی حیثیت صرف یلدرم کے مجموعہ کو ہی حاصل ہے۔ (land mark) جہاں منشی پریم چند نے آسان ہندوستانی زبان اپنائی، وہیں سجاد حیدر یلدرم نے اپنے افسانوں سے عربی اور فارسی مشکل الفاظ خارج کردیے۔ موضوع کے اعتبار سے وہ افسانے کو ایک نئی سمت لے گئے۔ ان کے یہاں ایک طرف رومانس ہے اور دوسری طرف حقیقت پسندی۔ اور ان لوگوں کا امتزاج بھی خوب ہے۔

1927 میں اردو افسانے کے سرخیل سجاد حیدر یلدرم نہٹوری کے گھر ایک بیٹی کی ولادت ہوئی۔ جو قرۃ العین حیدر 'عینی آپا' کے نام سے مشہور ہیں۔ افسانوی ادب سے رغبت انھیں خون سے ملی تھی۔ انھوں نے بھی اس کو اپنا تخلیقی میدان بنایا۔ پھر اس دخترِ بجنور کو اردو ناول اور افسانہ نگاری کی وجہ سے عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ انھوں نے اردو ناول اور افسانے کو نئے مضامین سے روشناس کروایا۔ انھوں نے نئے، اچھوتے اور انوکھے پلاٹ تلاش کئے۔ خاص طور سے عصری مسائل کو اپنی تخلیقات میں جگہ دی۔ انھوں نے نئی نسل کے مسائل سے چشم پوشی اختیار نہیں کی بلکہ جدید لائف اسٹائل ان کا خاص موضوع رہا۔ جب ان کی عمر بیس برس تھی تو وطن عزیز کی آزادی کی خوشی کے ساتھ اس کی بربادی کا درد بھی جھیلا۔ جبکہ سماج کے ہر طبقے سے زیادہ اس عمر کی لڑکیاں اپنے کو زیادہ غیر محفوظ سمجھتی تھیں چنانچہ انھوں نے اس فیکٹ کو بھی اپنے فکشن کا موضوع بنایا۔ جب پیغام آفاقی ''مکان'' اور عبدالصمد کو ''دو گز زمین'' جیسے پلاٹس کی تلاش تھی تو قرۃ العین حیدر ''آگ کا دریا'' میں غوطہ زن تھیں۔ انھوں نے تقسیم وطن کے جس کرب کو اپنی نفسیات میں اتارا تھا۔ اب وہ درد ان کی تخالیق میں صاف نظر آتا ہے۔ انھوں نے سماج کے سلگتے ہوئے مسائل پر توجہ مبذول کی۔

علامہ تاجور نجیب آبادی نہایت نامور اور باکمال شخصیت کے مالک تھے۔ اور انڈو پاک شہرت کے حامل تھے۔ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف مولانا ظفر علی خاں، علامہ اقبال، تلوک چند محروم، خواجہ ولی محمد، جسٹس عبدالقادر اور حفیظ جالندھری جیسے عظیم المرتبت لوگوں نے کیا ہے۔ علامہ تاجور نجیب آبادی ایک جادو بیان شاعر تھے۔ اور فن عروض کے استاد تھے۔ کسی زبان کی خدمت میں صحافت کا بہت دخل ہوتا ہے۔

علامہ تاجور نجیب آبادی نہایت پر جوش صحافی بھی تھے۔ آپ نے لاہور جا کر صحافت کے میدان کی شہسواری کی۔ یہ وہاں جا کر ''مخزن'' کے مدیر بن گئے۔ پھر ''ہمایوں'' کے جوائنٹ ایڈیٹر ہو گئے۔ پھر انھوں نے اپنا اخبار ''پرچم'' جاری کیا۔ 1929 میں ایک دوسرا رسالہ ''ادبی دنیا'' جاری کیا۔ آپ نے لاہور میں ''اردو مرکز'' کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا۔ اور

خوداس کے نگراں بنے۔اس ادارے نے دو ہزار عمدہ ترین نظموں کو 36 جلدوں میں شائع کیا۔ان کی صحافت اور نثر نوازی ان کی زندگی پر اتنی حاوی رہی ، کہ باوجود اچھے اور استاد شاعر ہونے کے ان کی شاعری کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوسکا۔اس بارے میں وہ خود لکھتے ہیں ''میرا کلام وقتاً فوقتاً پنجاب کے رسالوں اور ماہ ناموں میں شائع ہوتا رہا ہے۔میرے پاس اس کی کوئی نقل بھی نہیں ہے نہ یاد کہ کس پرچے میں کیا چھپا ہے، حافظہ بھی اب کمزور ہو چکا ہے۔''

بجنور ضلع کی تحصیل نجیب آباد سے اردو زبان وادب کا ایک اور گوہر آبدار حاصل ہوا۔یہ ہیں اختر الایمان۔اردو کے لئے ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔انھوں نے جہاں اپنی شاعری کے لئے اردو نظم کو منتخب کیا وہیں قدرت نے ان کے سامنے ایک اور وسیع میدان کھول دیا یہ ہے فلمی مکالمہ اور فلموں کے اسکرپٹ رائٹنگ انھوں نے جن فلموں کے اسکرپٹ یا مکالمے لکھے ان میں اردو کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔اس طرح انھوں نے ایک طرف اردو زبان کی اہمیت تسلیم کرائی۔اور دوسری طرف ان فلموں کو شاندار کامیابی سے ہمکنار ہونے کی راہ ہموار کی۔ ان کی کچھ خاص فلمیں یہ ہیں ''گم کردہ راہ''، ''وقت''، ''داغ''، ''پتھر کے صنم'' ان کے علاوہ ایک بڑی تعداد ایسی فلموں کی ہے، جن کی اسکرپٹ یا ڈائلاگ لکھنے کا کام اختر الایمان نے کیا ہے۔ان میں بیشتر پر انھیں کوئی نہ کوئی ایوارڈ ضرور ملا ہے۔فلمی مکالموں اور اسکرپٹ کے علاوہ ان کا بنیادی رجحان اردو نظموں کی جانب رہا۔ان کی نظموں کے کچھ خاص خاص مجموعے یہ ہیں تاریخ سیارہ، گرداب، آبجو، یادیں بنت لمحات، نیا آہنگ، سروسامان وغیرہ۔

اردو کی کسی صنف کو جدت وندرت سے ہمکنار کرانے والے ضلع بجنور کے ادبا اور شعرا کا اگر ہم تذکرہ کریں گے تو نشتر خانقاہی کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ان کے یہاں ایک خاص قسم کی جدت طرازی ملتی ہے وہ غزل کی ساخت اور جذبات دونوں سے چھیڑ چھاڑ کے لئے جانے جاتے ہیں۔بقول پاکستانی شاعر امجد اسلام ''نشتر خانقاہی نے غزل کو نئے امکانات سے بے جھجک آشنا کیا ہے۔جنھیں ہمارے اکثر شاعر بھاری پتھروں کی طرح چوم کر چھوڑ دیتے ہیں۔حسن کے بارے میں ان کا جارحانہ رویہ ان کے معاملات عشق میں نظر آتا ہے۔ان کی محبوبہ غزل کی روایتی عورت

سے بہت مختلف ہے۔انصاف کی نظر سے دیکھئے تو نشتر خانقاہی نے بڑی جرأت مندی سے جن خطرناک مسائل پر قلم اٹھایا ہے ان میں زندگی، قوت، معاشرتی استحصال اوراحساس محرومی کے مختلف رنگوں کا امتزاج ہے۔نشتر صاحب نے بڑے تواتر اور عمدگی سے غزل کوان نئے زاویوں سے پیش کیا ہے۔

عشرت کرت پوری نے نظم کے میدان میں طبع آزمائی کی انھوں نے احسان دانش کو اپنا آئڈیل بنایا اور اسی طرح کے مضامین اپنی نظم کے لئے چنے جو احسان دانش کے تھے۔غریب، مزدور اور پسماندہ لوگوں کے مسائل اپنی نظم کے ذریعہ اٹھانے کی کوشش کی۔صبح بنارس، تذکرہ شعرائے بجنور اور احسان وغیرہ ان کی تالیفات ہیں۔

ہلال سیوہاروی نے بھی نظم کے ذریعہ ہی سماج کو انقلاب کا میسج دیا ان کی نظموں میں طنز کا عنصر غالب رہتا ہے''جوتا'' اسی عنصر کی وجہ سے پسند کی گئی۔

نہال سیوہاروی بھی برصغیر کے مشہور شعراَ میں شمار ہوتے ہیں۔ان کا کلام بعنوان''شباب وانقلاب'' شایع ہوا۔

گوہر علی سکندر جگر کا تعلق مرادآباد سے ہے۔لیکن ایک زمانہ ایسا تھا کہ ان کے شب وروز بجنور میں گزرتے تھے۔ان کی شاعری اصلی غزل کی شاعری تھی ان کی عشقیہ شاعری کا بجنور کے عصری شعراَ پر گہرا اثر تھا۔ضلع بھر کے غزل گو شاعر جگر صاحب کے چشمے سے بھی دیکھنے کے عادی تھے۔

نور بجنوری، حکیم نیر واسطی نہٹوری، مخفی کریمی، رام اوتار مضطر، تمنا بجنوری، جوہر سہسپوری، قائم چاندپوری، فرحت قمر شیرکوٹی وغیرہ بجنور ضلع سے وابستہ ایسے شعراَ اور ادیب ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی طور پر اردو زبان کی ترقی میں تعاون کیا ہے۔

بجنور کے ایک اور مایہ ناز شاعر، ادیب اور صحافی سید شوکت علی بھی ہیں۔انھوں نے تمام ادبی کارنامے رفعت سروش کے نام سے انجام دیے۔یہ چالیس سال تک آل انڈیا ریڈیو کی سروس سے وابستہ رہے۔ان کی پیدائش جنوری ۱۹۲۲ کو نگینہ ضلع بجنور میں ہوئی۔

نسبت ہے نگینہ سے یہ بولی ہے ہماری

کیا ناقدِفن ہم سے تو ارشاد کرے ہے

یہ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی میں بھی رونق افروز رہے۔اپنی ادبی اور لسانی خدمات کے لیے بہت سے انعامات اور اعزازات سے نوازے گئے سوویت یونین، سعودی عرب، عراق، انگلینڈاور پاکستان وغیرہ بیرون ممالک کے بہت سے سفر کئے جہاں ان کی اعلیٰ ادبی اور علمی خدمات کی خوب پذیرائی ہوئی۔انھوں نے اردو کو کسی ایک صنف تک محدود نہیں رکھا ان کی زنبیل سخن میں غزل اور اردو نئی نظم، منظوم ڈرامے، اوپیرا، افسانے، ڈرامے، خودنوشت، انشائیہ، مضامین اور تراجم وغیرہ سب کچھ ہی ہیں۔خوشی ہے کہ یہ سب چیزیں طباعت کے مراحل سے گزر چکی ہیں۔جن کی تعداد پچاس سے کم نہیں۔رفعت سروش اپنے اسلوب اور اپنے ملٹی ٹیلنٹ کی وجہ سے اردو زبان وادب میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔

رابطہ:09412138151

بچوں کا شاعر اور ادیب تہذیب ابرار

ضلع بجنور کے شہر اور قصبے اردو کا قافلہ آگے بڑھانے میں ہی نہیں لگے ہیں بلکہ ضلع کے دیہاتوں نے بھی اردو ادب کو نامور ادیب دیے ہیں۔ڈپٹی نذیر احمد (ریہڑ)، اختر الا ایمان (راہوکھیڑی)، نشتر خانقاہی (جہان آباد)، مولانا سراج الدین ندوی، (سرکڑہ)، محمد احمد دانش (روانہ شکار پور)، ایم اے کنول جعفری ،ڈاکٹر رفعت (نیندڑو)، نظر بجنوری، اقرار احمد ساحل قاسمی (میوانوادہ)، معین شاداب (روانہ)، یونس نوید (بڈیرن)، مرزا طالب بیگ (مبارک پور خوشہ)، انجینئر سمیع الدین (حبیب والا) وغیرہ کی پیدائش ضلع بجنور کے دیہاتوں میں ہی ہوئی۔ انہی ناموں میں ایک نام تہذیب ابرار کا بھی ہے۔

تہذیب ابرار کا اصل نام اسرار احمد ہے۔موضع میوانوادہ میں 3 مارچ 1980 کو حافظ عبدالمنان کے یہاں پیدا ہوئے۔تہذیب ابرار نے اردو سے ایم اے کیا۔وہ گزشتہ ڈیڑھ دہائی سے شعروادب سے وابستہ ہیں۔مختلف اخبارات ورسائل میں ان کی غزلیں، افسانے، بچوں کی کہانیاں ونظمیں، تحقیقی وتنقیدی مضامین، تبصرے شائع ہوتے رہتے ہیں۔تہذیب ابرار ملک میں ہونے والے مشاعروں، ادبی سیمناروں اور کانفرنس میں برابر شرکت کرتے رہتے ہیں۔تہذیب ابرار شاعر اور ادیب ہونے کے ساتھ ہی صحافی بھی ہیں۔مختلف اخبارات میں سیاسی وسماجی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ہفتہ روزہ ''آئینہء حالات'' سہسپور میں نیوز ایڈیٹر اور ماہنامہ اچھا ساتھی بجنور میں بحیثیت مدیر کام کر چکے ہیں۔ان دنوں ماہنامہ ''حجاب اسلامی'' دہلی کی مجلس ادارت میں شامل ہیں اور اردو ادب کے کاروان کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی

سرزمین فکروفن...... ضلع بجنور

تہذیب ابرار

گنگا کی اٹھلاتی، بل کھاتی لہروں کا گواہ، اترانچل کی سرحدوں کو چھوتا ہوا مشرقی اترپردیش میں واقع ضلع بجنور...... جس کی تاریخی انفرادیت یہاں کی مٹی کے ذرے ذرے سے عیاں ہوتی ہے، راجہ وجے سنگھ کا بسایا شہر بجنور، گنگا و مالن ندی کے سنگم پر واقع مجسمہ حسن شکنتلا کی پیدائش کے لئے مشہور موضع راؤلی، مہابھارت کے وقت سے آباد دارانگر، عالم گیر ثانی کے دورحکومت میں امیر الامرائی کا منصب جلیل اور نجیب الدولہ کا خطاب حاصل کرنے والے روہیلہ پٹھانوں کے ایک ہونہار فرد نجیب خان احمد شاہ کا بسایا ہوا نجیب آباد، شیر شاہ سوری کا بسایا اور سن 1700 عیسوی میں امیر خاں پنڈاری کے ہاتھوں لٹا قصبہ شیر کوٹ، مغلوں کے زمانے کی ریاست ساہن پور، شاہجہاں کا بسایا شجاع علی خاں اور اس کی بیوی کے مقبرے و قدیم ترین مسجد کے لئے مشہور جہان آباد، جلال الدین خلجی کا بسایا ہوا جلال آباد، پارس ناتھ کے قلعے کے لئے مشہور قصبہ بڑھاپور، اکبر بادشادہ کا بسایا ہوا اکبر آباد، راجہ ہلدور سنگھ کے نام سے منسوب قدیم ترین ریاست قصبہ ہلدور، سردار غلام قادر خاں روہیلہ کا بسایا ہوا کوٹ قادر، ودرجی کے آشرم (ودرکٹی) کے لئے مشہور دارانگر اور خطۂ یونان کا لقب حاصل کرنے والا موضع حبیب والا۔

اس ضلع کا ہر شہر، ہر قصبہ، ہر دیہات خود میں ایسی معنویت رکھتا ہے جس کی تہوں میں اترنے کے معانی ہیں ایک اور معنویت کی تلاش میں گم ہو جانا،

علم و ادب، ثقافت و سیاست، تاریخ و فلسفہ، طب و صحت، تصوف، صحافت، سائنس وٹکنالوجی جس نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے یہاں کی ذہانتوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے

ہیں، اس ضلع نے ہر عہد میں وہ شعراء، ناول نویس، افسانہ نگار، محقق، مفکر، معلم، نقاد، صحافی، تذکرہ نگار، انشاپرداز پیدا کئے جو اپنے اپنے شعبہ میں انمٹ نقوش مرتب کرتے رہے۔

صرف اردو کی ترویج و اشاعت کے حوالے سے گفتگو کی جائے تو اس ضلع نے وہ عظیم شخصیتیں پیدا کی ہیں جن کی عظمتوں کا اعتراف کئے بنا شعر و ادب کی تاریخ مکمل نہیں کی جاسکتی۔

بات شاعری سے شروع کی جائے تو یہاں اٹھارویں صدی میں میر کے ہم عصر وہ عظیم شاعر پیدا ہوئے جن کی شعری اہمیت کے تعین میں محمد حسین آزاد کا ایک جملہ آج بھی نقادوں کے لئے خضر راہ ثابت ہوتا ہے، محمد حسین آزاد نے کہا تھا ''ہم قائم کے دیوان کو ہرگز میر و غالب کے دیوان کے نیچے نہیں رکھ سکتے'' ''مخزن نکات'' قائم چاندپوری کا تحریر کردہ وہ تذکرہ ہے جسے صف اول کے تذکروں میں شامل کیا جاتا ہے۔

احمد شاہ ابدالی اور عہد عالم گیر ثانی کے شاعر ثاقب سیوہاروی جو شاہ مبارک آبرو کے شاگرد تھے، لالہ سری رام نے پانچ جلدوں پر مشتمل اپنی تحقیق ''خمخانہ جاوید'' میں ثاقب سیوہاروی کو لازوال بنادیا ہے۔

جن کی علمیت کو ہر اہم پارکھ نے تسلیم کیا وہ شاعر قصبہ شیر کوٹ میں پیدا ہوئے مولانا ارشق شیر کوٹی، لاہور سے طبع ان کی مغلیہ دور کی منظوم تاریخ تو اپنی مثال آپ ہے ہی، علاوہ ازیں عربی فارسی کی صرف و نحو پر تحریر کردہ ان کی تصنیف نے بھی اس فن کی افہام و تفہیم میں قابل ذکر تعاون کیا ہے۔

علامہ اقبال جن کی علمی ذکاوت کی وجہ سے بہت احترام کرتے تھے وہ شخصیت تھی علامہ تاجور نجیب آبادی ''بلیغ الملک'' کا خطاب پانے والے تاجور نجیب آبادی دیال سنگھ کالج لاہور میں پروفیسر رہے ''شاہکار'' اور ''ادبی دنیا'' جیسے رسائل نکالے، ان کی تالیف کردہ کتاب ''روح انتخاب'' اہمیت کی حامل ہے۔

فیض، مخدوم، سردار جعفری، ساحر، مجاز، مجروح، میراجی، ن۔م۔راشد اور نیاز حیدر کے ہم عصر شاعر اختر الایمان کا تعلق بھی نجیب آباد سے ہے، سو سے زیادہ فلمیں تحریر کیں، بہترین

مکالموں کے لئے فلم فیئر ایوارڈ حاصل کیے، مختلف اکیڈمیوں، تنظیموں نے انھیں اعزازات سے نوازا، ''گرداب''،''آبِ جو''،''جنت لمحات''،''نیا آہنگ''،''سب رنگ''،''یادیں''،''سروسامان'' اور ''زمین زمین'' جیسی تخلیقی کتب سے شعروادب کو مالا مال کیا، فلمی شاعری سے ان کے معیار اور مرتبے پر حرف نہ آئے اس لئے فلمی گیت کبھی نہیں لکھے۔

آل انڈیا ریڈیو ممبئی و دہلی میں سینئر اردو پروڈیوسر کے عہدے پر فائز رہے رفعت سروش (نگینہ) کی تخلیقی توانائی کے اعتراف میں ''فکرو آگہی'' نے رفعت سروش نمبر شائع کیا تو ان کے مشترک اوصاف ایک سلسلے میں مربوط ہوکر سامنے آگئے، سات شعری مجموعے، منظوم ڈراموں کے چھ مجموعے اور تین نثری کتب سے رفعت سروش کے احساس اور ادراک وشعور کا اندازہ ہوتا ہے، بہت سے قومی اور بین الاقوامی اعزاز یافتہ یہ ہمہ رنگ شخصیت ممتاز فنکار کی حیثیت سے اردو ادب میں زندہ ہے۔

برصغیر کے علاوہ یورپ اور متحدہ عرب امارات میں طنزومزاح کی شاعری کے حوالے سے ایک آواز برسوں گونجتی رہی، ہلال سیوہاروی کے نام سے کون واقف نہیں ہے زندگی کی تلخ حقیقتوں سے گذرنے والے اس شاعر نے عالمی سطح پر اپنی شناخت قائم کی۔

اردو شعروادب اور صحافت کا ایک بڑا نام نشتر خانقاہی ہے۔ بحیثیت صحافی ''شاہراہ'' ''بیسویں صدی''،''بجنور ٹائمس'' کی مجلس ادارت میں شامل بحیثیت شاعر ''پت جھڑ میں تنہا پیڑ'' میرے لہو کی آگ''،''شہرمن'' اور ''دسترس'' جیسے شعری مجموعوں کے خالق بحیثیت محقق اردو ریسرچ اسکالرس کے معاون و مددگار نشتر خانقاہی جنھوں نے شعری موضوعات میں وسعت، پختگی اور گہرائی پیدا کر کے آنے والی نسلوں، کے لئے یہ آسانی فراہم کی کہ وہ کسی ایک ڈگر کے پابند ہونے کے بجائے اپنے مخصوص مزاج کے مطابق اپنے فن کے جوہر دکھا سکیں۔

مشاعروں میں مقبولیت حاصل کرنا، ادبی رسائل میں قارئین کا اعتماد جیتنا، نعت وغزل دونوں اصنافِ سخن میں کہیں بھی شعری لوازمات کو مجروح نہ ہونے دینا یہ مشکل کام آسان کر دکھایا، ابرار کرت پوری نے۔ ابرار کرت پوری کی شعریات انھیں سرخروئی بخشے ہوئے ہیں، ان کے غزلیہ

ونعتیہ مجموعے اس بات کا غماز ہیں کہ انھوں نے روایتی وعصری شعور کو ہم آہنگی عطا کی ہے۔

صحافت وشاعری کے فرق کو سمجھ کر دونوں کا حق ادا کر دینے والے عبدالشکور جمال بھارتی قصبہ سہسپور کے دانش ور تھے، اپنے وقت کے مشہور رسائل نگار (لکھنؤ) اور ادبی دنیا (لاہور) میں جمال بھارتی کے مقالے شائع ہوتے تھے، انہوں نے ہندوستان کے مشہور روزناموں میں کام کیا، مشہور محقق اور تنقید نگار ڈاکٹر خلیق انجم نے ان کے بارے میں لکھا ''جمال بھارتی نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور سبھی کا حق ادا کیا ہے'' آئینۂ جمال'''' آگ راگ'' ''دفیعات'' اور ''تلاشِ سحر'' ان کی تخلیق کتب ہیں۔

ذکر ناول نگاری کا ہو تو یہ شرف بھی اسی ضلع کو حاصل ہے، کہ اردو کا پہلا ناول نگار یہیں پر پیدا ہوا، ڈپٹی نذیر احمد (ریہڑ) محض اول ناول نگار ہی نہیں ایک جید عالم، قرآن کے بہترین شارح، قانونی کتابوں کے مترجم'' قواعد زبان کے مرتب بھی ہیں، ڈپٹی انسپکٹر مدارس الہ آباد کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد بھی ان کی تخلیقی صلاحیت ماند نہیں پڑی، ضرورت اس بات کی ہے کہ لافانی کردار ''مرزا ظاہر دار بیگ'' کے خالق نذیر احمد کے ناولوں ''مراۃ العروس'''' بنات النعش'''''توبۃ النصوح'' اور ''ابن الوقت'' کا ازسرنو مختلف زاویے سے مطالعہ کیا جائے۔

پہلا سائنسی ناول نگار بھی سرزمین بجنور پر پیدا ہوا۔ ایک ہزار ناولوں کے مصنف اظہار اثر (کرت پور) کے بارے میں نصرت ظہیر لکھتے ہیں'' اردو زبان کے ادیبوں، نقادوں، صحافیوں، افسانہ نگاروں کے اژدہام میں وہ اکیلے جی ہاں اکیلے، سائنس کے آدمی تھے'''' اظہار اثر اردو کے پہلے'' مکرر کہوں گا پہلے سائنسی فکشن نگار تھے'' اظہار اثر نے ایک ہزار ناولوں کے علاوہ تین سو سے زائد کہانیاں، دوسو زائد سائنسی مضامین لکھے ''اظہار ڈائجسٹ'' اور ''رات کا رپورٹر'' نام سے اپنے رسالے نکالے، شعری مجموعہ'' لاشریک'' میں زیادہ تر نظمیں سائنسی موضوعات پر ہیں، انھیں سائنسی ادب ایوارڈ کے علاوہ کئی اعزازات سے نوازا گیا۔

ہندوستان کے علاوہ پاکستان، بنگلہ دیش، عرب ممالک اور انگلینڈ کے اردو داں طبقے کو متاثر کرنے والے ناول نگار ڈاکٹر ذکاء الرب رباب کا تعلق شیر کوٹ سے ہے، نرسری سے

ڈاکٹریٹ تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں رہے، کچھ عرصہ ممبئی اور انگلینڈ میں گذارا، ڈاکٹر رباب کے 14 ناول 7 افسانوی مجموعہ، تراجم کل 23 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

افسانہ نگاری میں بھی یہ ضلع اپنی مستند شناخت رکھتا ہے، یہیں کے قصبہ چاند پور سے اس ہمہ رنگ شخصیت کا تعلق ہے، جس نے مختلف موضوعات پر ڈیڑھ سو سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں، جن میں ناول، افسانے، تنقید وتبصرے، تاریخ، طب اور بچوں کا ادب شامل ہے، اس کے باوجود افسانوی طرز نگارش اس کا حوالہ بن جاتی ہے، کوثر چاند پوری کو ایک کامیاب افسانہ نگار تسلیم کیا گیا ہے۔

نہٹور کی بیٹی قرۃ العین حیدر وہ ادیبہ ہے جس نے افسانہ نگاری اور ناول نگاری میں یکساں طور پر عالمی شہرت حاصل کی، ان کے افسانوی مجموعے افسانوی ادب میں قابل قدر اضافہ ہیں، دوسری طرف ان کی پہچان ان کے ناول ہیں ''آگ کا دریا'' یہ ناول انھوں نے پاکستان میں لکھا جس نے دو قومی نظریے کے کھوکھلے پن کو واضح کر دیا، نتیجتاً انھیں پاکستان چھوڑنا پڑا، انہوں نے اردو بلکہ ہندوستانی زبانوں میں پہلی مرتبہ ایسے ناولوں کی تخلیق کی جو کسی بھی ترقی یافتہ زبان کے لئے قابل فخر ہو سکتے ہیں۔

ایک ایسی افسانہ نگار جن کے شوہر اطہر پرویز (جو خود بھی ایک کامیاب قلم کار ہیں) ہندوستان کی جنگ آزادی، ٹریڈ یونین تحریک اور مزدوروں کے حقوق کے لئے کئی بار جیل میں ہوتے اور ان کی بیگم صدیقہ بیگم سیوہاروی ریڈیو کے لئے کہانیاں لکھ کر گذارا کرتی، دہلی، علی گڑھ میں قیام رہا، مختلف رسائل کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے، صدیقہ بیگم کے پانچ شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔

تحقیق وتنقید کے شعبہ میں بجنور نے جو نقد کیا وہ اردو ادب میں ایک مثال بن گیا اگر غالب اور ان کی شاعری لافانی ہے تو ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اور ''محاسن کلام غالب'' بھی زندہ جاوید ہیں، سیوہارہ میں پیدا ہونے والے ڈاکٹر بجنوری کی عظمت کا لوہا آج بھی پوری ادب برادری مانتی ہے، ''ہندوستان میں الہامی کتابیں دو ہیں ایک مقدس وید دوسری دیوان غالب''

ڈاکٹر بجنوری کے اس شہرہ آفاقی جملہ کی معنویت میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے، جرمنی سے ڈاکٹریٹ اور انگلینڈ سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کرنے والے ڈاکٹر بجنوری تحقیق وتنقید کا ایک روشن باب ہیں۔

جموں یونیورسٹی اور حیدرآباد یونیورسٹی میں پروفیسر رہے پروفیسر گیان چند جین (سیوہارہ) کی علمی افادیت تاریخ کے صفحوں پر جابجا نظر آتی ہے، کم وبیش 25 کتابوں کے مصنف گیان چند مذہباً جین ہیں ان کے پردادا نے ہرات میں طب کا علم حاصل کیا تھا اور کابل میں حکمت کا درس دیا تھا مگر گیان چند نے روایت سے ہٹ کر تحقیق وتنقید کی راہ اپنائی اور اردو ادب کا تابندہ ستارہ بن گئے۔

مرزا ہادی رسوا کے ناول ''امراؤ جان ادا'' کو لافانی بنانے والے پروفیسر خورشید الاسلام سیوہاروی وہ عظیم شخصیت ہے جن کی تعریف مولانا آزاد بھی کیا کرتے تھے، اپنی جگہ پر نامور شخصیات ڈاکٹر راہی معصوم رضا، شہریار، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، فلم امراؤ جان کے پروڈیوسر ڈائریکٹر مظفر علی، کبیر احمد جائسی خورشید صاحب کے شاگردوں میں ہیں، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ اردو کے صدر رہے، خورشید الاسلام کئی کتابوں کے مصنف ومؤلف ہیں، ''شبلی خطوط کے آئینے میں''، شبلی پر ان کی معرکۃ الآرا تحریر ہے۔

جمالیات کے موضوع پر دو منفرد کتابیں'' جمالیات اور ادب'' اور ''جمالیات مشرق و غرب'' پروفیسر ثریا حسین (نہٹور) کی کاوشیں ہیں، یہ بھی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ اردو کی صدر رہیں، ثریا حسین اپنی دیگر تصنیفات کے آئینہ میں بھی ایک کامیاب محققہ نظر آتی ہیں۔

شعبۂ تاریخ میں اس ضلع نے وہ افراد پیدا کئے جن کے کارنامے آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں، پروفیسر ریاض الاسلام سرزمین سیوہارہ کے فرزند ہیں، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور کیمبرج یونیورسٹی انگلینڈ سے پی ایچ ڈی کیا، کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر ہوئے، بین الاقوامی تاریخ کی کانفرنسوں میں شرکت کی، ان کی مشہور کتاب ''تہذیب کی کہانی'' پانچ جلدوں میں ہے، ہندوپاک اور ایران کے ثقافتی اور تاریخی تعلقات پر ان کا بے مثال کام ہے۔

اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کو کون نظر انداز کر سکتا ہے، تین ضخیم حصوں پر مشتمل ''تاریخ اسلام'' کو اسلامیات کے علماء نے ایک مستند اور اہم تاریخ مانا ہے، ان کی دیگر کتب ''مسلمان اور اندلس''، ''مذہب اور تلوار'' کی بھی تاریخی افادیت آج تک قائم ہے۔

اردو صحافت میں بھی یہ ضلع کبھی پیچھے نہیں رہا، صرف ''مدینہ'' اخبار پر تحقیق کے لئے ایک ادارے کی ضرورت ہے، مولوی مجید حسن نے نامساعد حالات میں ''مدینہ'' اخبار شروع کیا، جس نے ناقابل فراموش تاریخ رقم کی، ہندوستان کے علاوہ افغانستان، ایران، برما، سری لنکا اور جنوبی افریقہ کے کونے کونے میں جانے والا یہ اخبار ہندوستان کی جنگ آزادی میں آزادی کی راہ ہموار کر رہا تھا۔

مولوی مظہر الدین شیر کوٹی نے دہلی سے ''الامان''، ''وحدت'' نکالا، شیر کوٹ سے ''دستور'' نکالا پھر ''مدینہ'' سے وابستہ ہو گئے۔

اقبال راجا سہس پوری کی ناگہانی موت نے اس ضلع کو ایک مصلح، نڈر، بے باک صحافی سے محروم کر دیا، ان کے اخبار ''آئینۂ حالات'' نے کم وقت میں صحافت کی ایک صحت مند تاریخ رقم کی۔ مولانا سراج الدین ندوی بیس سالوں سے ''اچھا ساتھی'' نہایت کامیابی سے نکال رہے ہیں۔

اس ضلع میں ایسے افراد کی طویل ترین فہرست ہے جنھوں نے دوسرے محاذوں پر سرگرم رہتے ہوئے بھی اردو تصنیف و تالیف میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے جس موضوع پر بھی لکھا وہ کتاب اپنے موضوع کی یکتا اور حرف اخیر سمجھی جاتی ہے، قاضی سجاد حسین کرت پوری کی کتابیں بین الاقوامی شہرت کی حامل ہیں، پروفیسر عبد الصمد صارم (سیوہارہ) کی تصنیفات کی تعداد سو سے اوپر ہے، ڈاکٹر عثمان اطہر پرویز (سیوہارہ) کی کتب کم و بیش پچاس ہیں، پروفیسر مفتی عبد اللطیف رحمانی (افضل گڑھ) نے مختلف علم و فنون پر متعدد کتابیں لکھیں، محمد قاسم صدیقی (سیوہارہ) اور مولوی مقبول احمد (سیوہارہ) بہت سی کتابوں کے مصنف و مؤلف ہیں، مولانا سراج الدین ندوی (سرکڑہ) کی کتابوں کی خاص تعداد ہے۔

اس ضلع کے قلم کاروں نے ضلع کی علمی و ادبی شخصیتوں کے تعارف پر مبنی کئی کتب بھی

ترتیب دی ہیں، جن میں شکیل بجنوری کی ''تاریخ ادب ضلع بجنور''، شکیل رحمانی کی ''بام ہنر''، شجاع الدین قمر (سیوہارہ) کی ''یادگارِ سیوہارہ'' فرقان احمد صدیقی کی ''ضلع بجنور کے جواہر''، اسرار احمد نجیب آبادی کی ''حیاتِ شیخ عبدالرحیمؒ''، اقرار ساحل قاسمی کی منظوم کتاب ''معرکۂ حق و باطل'' اپنی مثال آپ ہیں۔

ضلع بجنور کی بے شمار ذہانتیں دیارِ غیر میں فروغ اردو کے حوالے سے ضلع بجنور کا نام روشن کئے ہوئے ہیں، جن میں پروفیسر خالد علوی، سالک دھامپوری، اسد رضا ایڈیٹر (راشٹریہ سہارا) شمشاد حسین فلاحی مدیر ''ماہنامہ حجاب اسلامی'' راشد عارفی، معین شاداب (عالمی سہارا)، اسلم کرت پوری، غیاث الدین دھام پوری، ڈاکٹر شمیم قریشی، مدیر ''قریشی ایکسپریس'' ڈاکٹر شیخ نگینوی مدیر ''میڈیا پوسٹ''، جاوید ندیم، نظر بجنوری، شکیل جمالی، شعیب مرزا، قابل ستائش ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

یہاں پر سینکڑوں شعراء، ادباء، صحافی صاحب کتاب ہیں، جن کا مفصل تو کیا اجمالاً تذکرہ کا بھی یہ مختصر مضمون ہرگز متحمل نہیں ہوسکتا۔

رابطہ:09758773130

دبستانِ ضلع بجنور کی خواتین قلم کار

ڈاکٹر شیخ نگینوی

ضلع بجنور کی زرخیز سرزمین میں اردو شعروادب کی فصل کئی صدیوں سے سرسبز و شاداب ہے۔ ضلع بجنور میں اردو کو دیگر ریاستوں اور شہروں کی طرح نوابوں، حکمرانوں کی سرپرستی میں پلنے اور بڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ بلکہ یہاں صحیح معنوں میں یہ عوام کی زبان بنی۔ اردو کو ضلع بجنور کے ان لوگوں نے ترقی کی منازل پر پہنچایا جو خود مفلوک الحال تھے اور ان کے سامنے پیٹ بھرنا اور زندگی کو گزارنا ایک مسئلہ تھا۔ زیادہ تر ایسے لوگوں نے ہجرت کی اور نصرت پائی۔

کوئی زبان ہو یا تحریک جب تک اس کو بھی طبقوں کا تعاون نہیں ملتا وہ کامیابی اور ترقی نہیں پاسکتی۔ اسی طرح ضلع بجنور میں اردو کی ترقی میں بھی سبھی طبقوں کا تعاون اور کردار رہا ہے۔ ہر شخص کا پہلا مکتب ماں کی گود ہوتی ہے۔ ضلع بجنور کے تمام ادیبوں اور شاعروں کی ہم جب سوانح حیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان کی پرورش کے ساتھ ادبی وشعری صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں ماؤں نے اپنے فرائض بخوبی انجام دیے ہیں۔ اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ضلع بجنور کی تعلیم وتربیت معیاری درجہ کی تھی۔ دنیا کے شعروادب میں خواتین کا حصہ مردوں کے مقابلے میں کم ہے، لیکن ضلع بجنور میں بالغ نظر ادیباؤں اور شاعرات کا فقدان نہیں ہے۔ شاعری، افسانہ، ناول، ترجمہ، تحقیق، صحافت، اسکرپٹ وغیرہ یعنی نثر اور نظم دونوں میں ضلع بجنور کی خواتین نے اپنی صلاحیتوں کے پرچم لہرائے ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ نذر سجاد، صدیقہ بیگم، قرۃ العین حیدر، نجمہ عزیز، ڈاکٹر عابدہ سمیع، عائشہ خواجہ، پروفیسر ثریا حسین، ڈاکٹر شمع افروز زیدی، ڈاکٹر فرزانہ خلیل، شہناز کنول، عطیہ قاضی، ڈاکٹر شبانہ نذیر، عذرا جمال، ذہین گل، پنہاں انصاری، شافعہ شاد، تسنیم احسن، صائمہ فہیم، عظیمہ نشاط، ڈاکٹر سیدہ بسطین، ڈاکٹر شیریں گل، تاج سلطانہ، پروفیسر خورشیدہ حمرہ، نسرین حامد، نینی کاظمی، ڈاکٹر ماجدہ اسد، سیدہ معراج، ممتاز

جہاں، ناہید، صابرہ نکہت وغیرہ ضلع بجنور کی خواتین کے وہ نام ہیں جنھوں نے اردو کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

دنیا کی کسی بھی زبان میں ایسی مثال نہیں ملتی جہاں نو سگی بہنوں میں پانچ سگی بہنیں شاعری کرتی، ہوں ان کے باقاعدہ مجموعۂ کلام بھی ہوں اور اپنے ملک سے باہر جا کر بھی ان کے کلام نے دادو تحسین حاصل کی ہو۔ دنیا کے ادب میں یہ ریکارڈ بھی ضلع بجنور کی بیٹیوں کے نام ہے۔ بس اندراج باقی ہے۔ بجنور ضلع کے نگینہ شہر کے محلہ سرائے میر ساکن التجا زیدی کی پانچ بیٹیاں شاعری کر رہی ہیں۔ جن کے نام ادب کے جانکاروں کے درمیان تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ بھوپال میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے سے ریٹائر شمیم زہرہ، منیر زہرہ، ''ڈاکٹر مینا نقوی'' (اغوان پور، مرادآباد) نزہت زہرہ (پاکستان) نصرت مہدی (بھوپال)، علینا عترت رضوی (نوئیڈا) اردو شاعری کر رہی ہیں۔ جن کا کلام سوشل، پرنٹ، الیکٹرانک میڈیا میں خوب پڑھنے کو ملتا ہے اور مشاعروں کے اسٹیج سے سننے کو ملتا ہے۔

شمیم زہرہ سب بہنوں میں سب سے بڑی ہیں، نگینہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کر کے انھوں نے ڈبل ایم، اے اور پی ایس سی مدھیہ پردیش سے کیا اور مدھیہ پردیش حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہیں۔ مضامین، ریڈیو ٹاک، ٹیلی ویژن پر ٹاک بحث و مباحثہ میں شرکت کی اور شاعری کے ساتھ ادبی خدمت کرتی رہی۔ شمیم زہرہ کی پسندیدہ صنف نظم ہے دوسری بہن منیر زہرہ ہیں۔ جو روہیل کھنڈ کی معروف ادبی شخصیت ہیں۔ مینا نقوی کے نام سے ادب میں ان کی پہچان ہے سائبان، بادبان، درد پت جھڑ کا، کرچیاں درد کی، جاگتی آنکھیں وغیرہ تخلیقات ڈاکٹر مینا نقوی کی ہیں۔ جنھیں کئی اکادمیوں کے ذریعے اعزاز سے سرفراز کیا جا چکا ہے۔ تیسری بہن نزہت زہرہ کی بھی ابتدائی تعلیم نگینہ ضلع بجنور سے ہوئی۔ اس کے بعد شادی ہو کر پاکستان کراچی میں مقیم ہیں۔ ہندوستان میں بچپن سے ہی مختلف رسائل و جرائد میں اپنے مضامین اور کلام سے انھوں نے اپنی پہچان بنانی شروع کر دی تھی۔ آکاش وانی نجیب آباد سے ان کا کلام، کہانی اور بات چیت اسی عمر سے نشر ہونے لگے تھے شادی کے بعد رجحان مذہبی ہو گیا اور انھوں نے کراچی سے ایم اے ان

اسلامک اسٹڈیز کیا۔ نزہت زہرہ آج پاکستان کی بہترین مقرر، قابلِ احترام ذاکرہ، شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔ چوتھی بہن علینا عترت رضوی ان دنوں مشاعروں اور سوشل میڈیا پر خوب سرگرم ہیں۔ ''سورج تم جاؤ'' نام سے علینا عترت رضوی کا شعری مجموعہ حال ہی میں منظر عام پر آیا اور اردو اکادمی سے ایوارڈ بھی حاصل کرلیا بقول جمیل جوہری علیگ "علینا ہندوستان کی پروین شاکر ہیں"۔ شمیم زہرہ اور نزہت زہرہ کا کلام مختلف رسائل و جرائد اور کتابوں میں محفوظ ہے۔ پانچویں بہن ڈاکٹر نصرت مہدی بھوپال کے ساہتیہ اکاڈمی کی ڈپٹی ڈائریکٹر، اردو اکاڈمی مدھیہ پردیش کی سکریٹری اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کی منتظمہ کمیٹی کی رکن ہیں۔

ڈاکٹر نصرت مہدی کی پیدائش 1965 میں نگینہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم نگینہ میں اور مزید تعلیم بھوپال سے حاصل کر کے نصرت مہدی نے کلاس دوئم افسر کے طور پر مدھیہ پردیش حکومت کی ملازمت شروع کی۔ نصرت مہدی کے مضمون، شاعری، ڈرامہ، اسکرپٹ اردو، ہندی، انگریزی رسائل اور جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ عالمی اور کل ہند مشاعروں، سیمناروں، اردو کانفرنسوں میں اکثر شرکت کرتی ہیں۔ سایہ سایہ دھوپ، آبلہ پا، میں بھی تو ہوں، گھر آنے کو ہے، نصرت مہدی کے شعری مجموعے ہیں۔

خاتونِ اودھ لکھنؤ، نشور ایوارڈ کانپور، امر شہید اشفاق اللہ خاں ایوارڈ، مظہر سعید خاں ایوارڈ، بھارت رتن مدر ٹریسہ گولڈ میڈل ایوارڈ اب تک مل چکے ہیں۔ ایشکر وفٹ یونیورسٹی لندن نے انھیں ''ڈاکٹر آف لٹریچر'' ایوارڈ کی ہے۔ اردو کی ترقی و ترویج کے لئے ذاتی طور پر مصروف رہنے والی بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر، ڈرامہ نگار، اسکرپٹ رائٹر، کہانی کار اور مقالہ نگار نصرت مہدی نے امریکہ، خلیجی ممالک اور پاکستان وغیرہ بہت سے ملکوں میں مشاعرہ اور سیمناروں میں شرکت کرتی ہیں۔

خواتین دبستانِ ضلع بجنور کی یہ چند مثالیں ہیں مکمل تفصیل کے لئے ایک لمبی تحقیق کی ضرورت ہے۔

رابطہ:09412326875

معروف نعت گو شاعر۔ ابرار کرتپوری

اردو زبان میں نعت گوئی کا سلسلہ اس زبان کی پیدائش کے زمانہ سے ہی جاری ہے یہ عرصہ تقریباً سات سو سال پر محیط ہے۔ ملاوجہی، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، قلی قطب شاہ ولی دکنی سے میر غالب اور داغ تک شعراء نے بارگاہِ رسالت میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اردو شاعری کا تاریخ میں کم حضرات نے ان پاکیزہ اصناف حمد و نعت کو خصوصی طور پر اپنی فکر سخن کا موضوع بنایا۔ محسن کاکوروی، امیر مینائی، علامہ اقبال، الطاف حسین حالی اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے نعت کو خصوصی طور پر اپنی فکر کا موضوع بنایا۔

14 ر جنوری 1939 کو کرتپور ضلع بجنور میں قاضی ریاست حسین کے یہاں پیدا ہوئے ابرار حسین نے ۱۹۸۵ میں پاکستان کے نامور نعت گو شاعر مظفر وارثی کا کلام سن کر نعت گوئی کا سلسلہ شروع کیا۔ ابرار کرتپوری نے شاہد نوحی مظفر نگری سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ ابرار کرتپوری کی اب تک مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی تعداد 35 ہے۔ جن میں 9 حمد یہ کلام، 12 نعتیہ کلام، 3 بچوں کا ادب، 4 غزلیات کے مجموعے، 1 مفتاح سخن و دیگر ہیں۔ ابرار کرتپوری کو ادب و شاعری کی گراں قدر خدمات انجام دینے پر دہلی اردو اکیڈمی ایوارڈ مولانا محمد علی جوہر ایوارڈ، میر تقی میر کلچر سوسائٹی ایوارڈ، احباب رامپور انٹرنیشنل ایوارڈ، عشرت اکیڈمی کرتپوری ایوارڈ کل 15 ایوارڈ مل چکے ہیں۔ 2004 میں جون ایلیا کی یاد میں منعقد بین القوامی مشاعرہ کراچی میں شرکت کی اور ملک میں ہونے والے بہت سے مشاعروں میں اکثر شرکت کرتے ہیں۔ ضلع بجنور کے چھوٹے سے قصبے کی تنگنائے ادب سے نکل کر ابرار کرتپوری مطلع ادب پر اخترِ درخشاں کی طرح فروزاں ہوئے

ڈاکٹر شیخ نگینوی

ضلع بجنور کے نعت گو شعرأ

ابرار کرتپوری

پاکیزہ اصنافِ سخن کی روایت بہت پرانی ہے۔ جہاں تک نعتِ رسولِ کریم کا تعلق ہے یہ حضور سرکارِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ہی شروع ہوگئی تھی اس زمانے کے عربی شعرأ اور صحابہ کرام نے نعتِ رسول کہتے ہوئے تمام عالم کو نعت گوئی کا سبق عطا کیا۔ چنانچہ عربی زبان سے نعت گوئی کا آغاز ہوا۔ صحابہ کرام میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ اور شعرأ میں حضرت عبداللہؓ بن رواحہ، کعبؓ بن زبیر، کعبؓ بن مالک اور شاعرِ رسول حضرت حسان بن ثابت انصاریؓ کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حضرت حسانؓ کو یہ سبقت حاصل تھی کہ وہ شعرأ میں رسولِ کریمؐ کے پسندیدہ شاعر تھے۔ انھیں نعتیہ کلام پیش کرنے کے لیے خاص طور پر منبر رکھوایا جاتا تھا کہ حضرت حسانؓ تعمیلِ حکم رسول کریمؐ میں اپنا کلام پیش فرماتے تھے۔

عربی زبان سے یہ سلسلہ فارسی زبان میں در آیا۔ فارسی شعرا کرام نے فارسی زبان پر خوب خوب مدحِ رسولِ کریم کی اور ایک خاص امتیاز حاصل کیا۔ چنانچہ مولانا جامیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، قطب الدین بختیار کاکیؒ، خواجہ نظام الدین اولیاؒ، امیر خسروؔ، بوعلی شاہ قلندرؒ اور دیگر شعرأ نے مدحِ رسولِ کریمؐ کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔

ہندوستان میں اردو شعرأ ملا وجہی، قلی قطب شاہ، ولی دکنی سے میرؔ، غالبؔ و داغؔ کے

وقت کے شعرا نے نعتیں کہیں اور دواوین میں برکتاً سب سے پہلے ان اصناف کو جگہ دی۔ نعت گو شعرا میں محسن کاکوروی، امیر مینائی، اقبال، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، الطاف حسین حالی اور بہزاد لکھنوی وغیرہ نے خاص طور پر اس صنف سخن کو اپنایا اور امتیاز حاصل کیا۔ ان حضرات کے بعد یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔ دورِ حاضر کے شعرا نے بھی نعت گوئی کے میدان میں اپنی فکر کے جوہر دکھائے ہیں۔ یہ بھی ہوا ہے کہ پورے برصغیر میں نعت گوئی میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اسلوب میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ روایتی شاعروں کے بعد شعرا نے جدید لہجہ اختیار کیا ہے۔ روایت اور جدید لہجے کے امتزاج سے بھی ایک لہجہ اور اسلوب وجود میں آیا ہے جو سماعتوں کو بھی اچھا لگا اور بصارتوں کو بھی۔

آج بھی حمد وثنائے رسولِ کریم کا لامتناہی سلسلہ نہایت عقیدت واحترام سے تمام عالم میں جاری وساری ہے۔ شعرا کرام بارگاہِ رسالت مآب میں خراجِ عقیدت نعت پیش کر کے نعتیہ ادب میں اضافہ کر رہے ہیں۔ تاہم ایسے شعرا کی تعداد بہت کم ہے جنھوں نے صرف نعت کو ہی اپنا فکرِ سخن کا موضوع بنایا ہو یا جن کے دواوین یا مجموعے بھی شائع ہوئے ہوں۔

ضلع بجنور اتر پردیش کے روہیل کھنڈ کے سات اضلاع (اور اب نو ضلع: چونکہ امروہہ اور سنبھل بھی ضلع ہو گئے ہیں) میں اپنے ادبی وشعری تخلیق کاروں کی وجہ سے خاص طور پر جانا جاتا ہے۔ پاکیزہ اصنافِ سخن میں یہاں کئی شعرا کو امتیاز حاصل ہوا۔ سیرتِ مقدمہ کی تین جلدیں، تاریخ اسلام، اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے وہ کارنامہ عظیم انجام دیا جس نے انھیں زندہ جاوید کر دیا۔ حضرت قائم چاند پوری نے نگارِ شاعری کے گیسو اس طرح سنوارے کہ دنیائے شعر وسخن میں قایم ودائم ہو گئے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے اردو ادب کے غالب کے دیوان کا مقدمہ لکھ کر بیکراں شہرت حاصل کی۔ علامہ تاجور نجیب آبادی کا اسم گرامی برِ صغیر میں اردو کے حوالے سے نہایت احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اختر الایمان جدید شاعری کے آسمان پر ضوافگن ہوئے۔ اردو شاعری کے حوالے سے نشتر خانقاہی، طالب کرت پوری، ہری چند اسیر کرتپوری، عشرت کرتپوری، انعام کرت پوری، اظہار اثر، شوق بجنوری، ولی بجنوری، رفعت سروش، فرخ نگینوی، بیخود نگینوی،

نہال سیوہاروی، ہلال سیوہاروی، اختر نجیب آبادی، اجمل خاں نجیب آبادی، بینا بجنوری، عزیز نہٹوری، سجاد حیدر یلدرم، قرۃ العین حیدر، شوق مانوی، مظہر چاند پوری حضرات کے نام قابلِ ذکر ہیں۔علاوہ ازیں ادبا وشعرا کی ایک طویل فہرست ہے جو آج نگارِ اردو کے گیسو سنوارنے میں پیش پیش ہیں۔

کئی سال پیشتر احقر ضلع بجنور کے مختلف قصبات، مشہور مقامات پر اس غرض سے حاضر ہوا کہ نعت گو شعرا کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔ چنانچہ میں نے یہ معلومات حاصل کیں کہ ہمارے ضلع میں ماشاءاللہ شعرا کی تعداد تو کثیر ہے۔ لیکن جہاں تک نعت گوئی کا تعلق ہے کم شعرا ایسے ہیں جنھوں نے نعت گوئی کو اپنا شعار بنایا ہو اور اس مضمون پر مختصر معلومات پیش ہیں۔

تاثرات اور خلاصۂ معلومات

نعت گو شعرا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے مختلف قصبات اور مقامات پر حاضری ہوئی اور مختلف حضرات سے ملاقاتیں ہوئیں۔ کس طرح اور کس قسم کی معلومات حاصل ہوئیں۔ ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں تاثرات اور معلومات کا خلاصہ پیش کیا جائے:

نجیب آباد : ہم نے اپنا سفر نجیب آباد سے شروع کیا۔ یہاں جناب شکیل رحمانی نے معلومات بہم پہنچائی۔ پتہ چلا کہ نجیب آباد میں کوئی ایسا نعت گو شاعر نہیں گزرا جس کا ذکر کیا جائے۔ البتہ کرتپور کے شاعر اور صحافی جناب ارشد ندیم نے بتایا کہ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی شاعر بھی تھے اور ان کا غیر مطبوعہ مجموعۂ نعت لڈن خاں صاحب (مشہور شکاری) کی بیگم کے پاس موجود تھا اور جس کو ارشد ندیم صاحب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

موضع کلیڑی : جناب محمد حسین قریشی کا مجموعۂ نعت شائع ہوا۔ ان کے ایک عزیز نے بتایا کہ ایک کتاب رہ گئی ہے وہ کوئی صاحب لے گئے ہیں۔ اس کے بارے میں معلومات بہم کی جائیں گی۔ لیکن وہاں سے کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکی۔ شکیل رحمانی صاحب نے بتایا کہ نجیب آباد میں ایک شاعر شمیم القادری تھے جو فلمی گیتوں کی طرزوں پر نعتیں کہتے تھے۔ ان کو لوگ یہاں ہمدرد والے

حکیم جی کہتے تھے۔ ان کا کوئی نمونہ کلام حاصل نہ ہو سکا۔ ایک صاحب یہاں جناب عبدالحکیم حقی تھے جو نعت بھی کہتے تھے۔ غیر مسلم شعرأمیں جناب مہندر سنگھ اشک نعت گو بھی ہیں۔

ساہن پور : نجیب آباد کے نزدیک قصبہ ساہن پور ہے جسے بعض لوگ نجیب آباد کا محلہ تصور کرتے ہیں۔ اس قصبے سے تعلق رکھنے والے بزرگ شاعر جناب عبدالرحمٰن شوق مانوی نعت گو ہیں۔ ایک سو سے زائد نعت کہہ چکے ہیں۔ جو کتابی شکل میں جلد شائع ہوں گی۔ ان کے علاوہ اختر ملتانی، شاہد نجیب آبادی اور سوز نجیب آبادی کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

کرت پور : کرت پور ضلع بجنور تاریخی بستیوں میں سے ہے یہاں علم وادب کی شمعیں ہمیشہ روشن رہی ہیں۔ حضرت الحاج مولانا قاضی سجاد حسین مرحوم عربی فارسی کے مستند عالم اور مدرسہ عالیہ فتحپور دہلی کے پرنسپل اور شیخ الحدیث بھی تھے۔ شعرأمیں طالب کرت پوری، حکیم محمد ابراہیم خلیل، مفتی اقتدار حسین، مفتی افتخار حسین، عابد تسیم، ہری چند اسیر، انعام اللہ خاں انعام کرت پوری، عشرت کرت پوری، اظہار آثر، افضل کرت پوری اور نئی نسل کے نوجوان شعرا نگارِ سخن کے گیسو سنوارنے میں لگے ہوئے ہیں۔ کرت پور میں نعت گوئی کا سلسلہ جاری ہے۔ کرت پور کے تین شعرأ کو ہم نعت گو شاعر کہنے میں حق بہ جانب ہیں۔ ان میں ابرار کرت پوری، قاضی کرت پوری (مرحوم) اور جناب شاکر کرت پوری کا ذکر ضروری ہے۔ ان تینوں کے مجموعے موجود ہیں، شائع ہونے والے مجموعوں میں شاکر کرت پوری کا نعت کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ ان کی ایک کتاب بزرگ شعرأ کی نعتوں پر تضمین بھی کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔ قاضی کرت پوری کا مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ کوشش کی جائے گی کہ وہ چھپ جائے۔ یہاں ابرار کرت پوری کی نعتیہ کتب کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

نعتیہ کلام: وَرَفعنا لکَ ذکرک (نعتیہ کلام)، مدحت (نعتیہ کلام)، غزوات (مثنوی (نعتیہ کلام)، شہرِ علم (نعتیہ کلام)، حرف حرف ثنا (نعتیہ کلام)، عقیدت پارے (نعتیہ کلام)، خدا (نعتیہ کلام)، روشنی ہی روشنی (نعتیہ کلام)، نعت کہوں تو خوشبو آئے (نعتیہ کلام)، ان کے نام (نعتیہ کلام)، کوثرِ سخن (نعتیہ کلام)، ابزرگ توئی (نعتیہ کلام)، نعت (نعت سے متعلق مضامین)

حکیم ابراہیم خلیلؔ، عابد تسیم بھی نعت کہتے تھے۔ مولوی نظیر احمد محلّہ کوٹلہ میں رہتے تھے۔
دارالعلوم دیوبند میں استاد رہے نعت گو تھے۔ ان کی کئی کتب شائع ہوئیں لیکن کلام حاصل نہ ہو سکا، منشی توقیرؔ کرت پوری کا کلام بھی حاصل نہ ہو سکا یہ نعت و منقبت کہتے تھے۔

دھام پور : دھام پور میں حافظ دھام پوری نعت گو شاعر تھے۔ سیمابؔ اکبر آبادی کے شاگرد حافظ دھام پوری کا مجموعہ کلام شائع نہ ہو سکا۔ کاترے نے اس کی کتابت کی تھی۔ اسکا نام ''صبحِ روشن'' ان کا ذکر ''الحسنات'' رام پور کے سالنامہ 1972 میں موجود ہے۔

فدؔا دھام پوری: مشہور نعت گو شاعر تھے۔ ان کا نعتیہ کلام کا مجموعہ ''تحفۂ بہشتی'' شائع ہوا تھا۔ اب دستیاب نہیں۔ نسیم دھام پوری نے تقریباً اسّی نعتیں کہیں ہیں جو عنقریب کتابی شکل میں شائع ہونگی۔

نور پور : نور پور میں کئی شعرا ہوئے ہیں اور موجود بھی ہیں۔ ان میں جناب عبدالغفار صدیقی، دانشؔ نور پوری کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ''نورِ حرا'' شائع ہو کر مقبولِ خواص و عوام ہو چکا ہے۔ نور پور کے ایک اور شاعر جناب گوہرؔ نور پوری کا مختصر کتابچہ شائع ہوا تھا۔ ان کا کلام دستیاب نہ ہو سکا۔

بجنور : بجنور میں جناب شکیلؔ بجنوری اور منصورؔ بجنوری سے معلومات حاصل کیں۔ کسی نعت گو شاعر کا پتہ نہیں چلا جن کا کلام کتابی شکل میں چھپا ہو البتہ پاکستانی لٹریچر کے ذریعہ معلوم ہوا۔

۱۔ جناب اخترؔ بجنوری : ''مضرابِ جاں'' مجموعۂ نعت ۱۹۸۶ء کراچی میں شائع ہوا۔
۲۔ جناب ممتازؔ بجنوری : ''نگارِ حرم'' مجموعۂ نعت ۱۹۸۹ء کراچی میں شائع ہوا۔
۳۔ جناب سرورؔ بجنوری : ''حمد و نعت'' ۱۹۸۲ء کو پہلا ایڈیشن فیصل آباد پاکستان میں شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۲ء فیصل آباد پاکستان میں شائع ہوا۔

بجنور کے شعرائمیں جناب محمد یامین خاں شوقؔ بجنوروی، افسرؔ جمشید، چندر پرکاش جوہرؔ، سعیدؔ زیدی، ولیؔ بجنوری، سید اسد رضاؔ کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جنھوں نے نعتیہ کلام کہا۔

نگینہ : جناب حافظ رفیقؔ اور جناب عشرتؔ جاوید کے توسط سے نگینہ کے شعرائ کی نعت گوئی سے متعلق معلومات حاصل ہوئیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں فخر الدین محزوںؔ باکمال شاعر تھے اور

نعت بھی کہتے تھے۔ جناب محمود عندلیبؔ کے رشتہ دار تھے۔ دوسرے باکمال شاعر جناب بسملؔ نگینوی تھے۔ بسملؔ صاحب نے نعتیں کہیں لیکن ان کا کلام دستیاب نہیں ہے۔ انھوں نے ایک بزرگ شاعر کا نام فرخؔ نگینوی بتایا۔ مجھے ان کے بارے میں معلومات کرت پور میں جناب ڈاکٹر جنید کے ذریعہ ہوئی۔ فرخؔ نگینوی مرحوم کے بیٹے کرت پور میں رہتے ہیں۔ جنید صاحب سے ان کی قریبی رشتہ داری ہے۔ فرخؔ نگینوی کا کلام قابلِ قدر لائق تحسین ہے۔ ان کے غیر مطبوعہ کلام ہیں:

ا۔ نعتیہ قصائد : مطلع

بہار لاتی ہے کیا کیا بہارِ جدت خاص
اے ہلالِ عید تیری شانِ رویت کے نثار
اے تعالیٰ اللہ جاہ و عزتِ محبوبِ رب
اے بہارِ ہر دو عالم رحمت اللعالمین
لائی اس انداز سے بادِ صبا ابرِ بہار
سرِ باطل قلم ہے اور حق کی داستاں روشن

۲۔ منظوم سیرتِ نبیؐ ''بزمِ رؤف الرحیم''

بزمِ اوّل...............۳۷۴ صفحات

بزمِ دوم...............۳۸۷ صفحات

بزمِ سوئم...............۴۸۳ صفحات

بزمِ چہارم...............۵۶۷ صفحات

سرکارِ مدینہ حصہ اوّل.....۵۳۴ صفحات

اس کتاب میں حمد، نعت خصوصاً نعت کو مثلث، مربع، مخمس، مسدس، ترجیع بند، ترکیب بند سلام، مثنوی، قطعات، قصائد اور تضمین کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

۴۔ غزوۂ بدر کا انتخاب.....۵۴ صفحات

یہ ضمیمہ بھی بزمِ رؤف الرحیم (سیرتِ نبی کریم) منظوم کا حصہ ہے اس طرح بزمِ رؤف الرحیم کے

صفحات کی تعداد ۱۸۵۶ ہو جاتی ہے۔ یہ تمام کام مخطوطہ کی شکل میں موجود ہے۔ کسی ادارے کو اس تمام سرمایہ کی حفاظت کی خاطر شائع کر کے اس کارِ عظیم کو انجام دینا چاہیے۔ فرخ نگینوی کا یہ تمام کام ہمارے نعتیہ ادب کا عظیم سرمایہ ہے۔

چاند پور : قائم چاند پوری کے چاند پور کے بارے میں جناب شاہد مجاز نے بتایا کہ یہاں شعرأ نے بطور سعادت تو اکا دکا نعت کہہ لی ہیں۔ لیکن خاص طور پر اس صنف کو برتا ہو یا کتابی شکل میں شائع کیا ہو ایسی مثالیں نہیں ملتیں۔ البتہ یہاں ایک شاعر مسطیر چاند پوری کے بارے میں بتایا کہ وہ چہار بیت کہنے میں ماہر تھے اور انھوں نے حمد یہ نعتیہ چہار بیت کہی تھیں۔ میں نے نمونے کے طور پر چہار بیت کے اکھاڑے کے رکن جناب رئیس چاند پوری سے چہار بیت حاصل کیں۔ حافظ عبدالعزیز یاس چاند پوری کا نعتیہ کلام کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے جس کا نام ''کردار کی خوشبو'' ہے۔

سیوہارہ : ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے سیوہارے میں غریق، وحید، ترحی، ناظم، نہال سیوہاروی جیسے شعرأ نے غزل کو مالا مال کیا لیکن صاحب دیوان شاعر تھے جناب حکیم سید علی مظفر حکیم سیوہاروی جن کا نعتیہ مجموعہ ''لمعاتِ نور'' ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ حکیم صاحب سیوہاروی مشہور ادیب جناب کوثر چاند پوری کے والد تھے۔

کھاری جھالو : یہاں کے ایک شاعر استاد جناب محمد ظفر ہنر جھالوی نعت گو تھے لیکن ان کا کلام حاصل نہ ہو سکا۔

نہٹور : سجاد حیدر یلدرم اور ان کی بیٹی قرۃ العین حیدر کے نہٹور والوں کو دانشمندانِ نہٹور کہا جاتا ہے یہاں عزیز نہٹوری اور بینا بجنوری جیسے شعرأ موجود ہیں۔ یہاں معلومات کرنے پر پتہ چلا کہ جناب طلعت حسین صدیقی اور دوسرے شاعر جناب تنویر وصفی نے نعتیں کہیں۔ ان کا مسودہ بھی تیار تھا لیکن یہ پتہ نہیں چل پایا کہ وہ مجموعہ نعتیہ کلام شائع ہوا یا نہیں۔

شیر کوٹ : شیر کوٹ ضلع بجنور کا وہ قصبہ ہے جہاں ہمیشہ علم و ادب کی شمع روشن رہی ہے۔ مولانا مظہر الدین اور مولانا ارشق شیر کوٹی کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا ارشق کے تلامذہ میں محمد عمر دانش شیر کوٹی، محمد تحسین بیگ کلیم، جناب عاصی شیر کوٹی اور امیر شیر کوٹی خاص ہیں۔ انصار

جنگ خاں ناصر نے بھی نعتیہ کلام کہا ہے۔ غیر مسلم حضرات میں جناب انیرودھ شرما تسیم اردو، ہندی، عربی، فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے۔ انھوں نے ایک عربی قصیدہ اور سپاسنامہ شاہ فیصل مرحوم کو بھیجا تھا جس پر انھیں اکرام سے نوازا گیا تھا۔ پنڈت جی رحمت اللعالمین سے عقیدت رکھتے تھے اس لیے نعتیہ کلام کہتے تھے۔ ان کے شاگرد کلیم شیر کوٹی کے بیٹے جناب محمد شعیب مرزا نامور شاعر ہیں اور نعتیہ کلام بڑی عقیدت سے کہتے ہیں۔

میرے پاس جو معلومات تھیں ان میں سے خاص خاص حضرات کا ذکر مضمون ہذا میں کر دیا۔ طوالت نہ ہو اس لیے نظم کا حصہ اس مضمون میں پیش نہیں کیا گیا ہے۔ انشاء اللہ مزید تفصیلات کے ساتھ ''ضلع بجنور کے نعت گو شعرا'' کتابی شکل میں شائع ہو کر قارئین کرام کی خدمت میں پہنچے گا۔

رابطہ:09891542320

محبّ اردو۔علیم ہاشمی (مغربی بنگال)

ضلع بجنوراور اردو ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں۔جب اردو کی بات ہو اور ضلع بجنور کا ذکر نہ ہو اور گفتگو ضلع بجنور کے سلسلہ میں ہو رہی ہو اور اردو کا نام نہ آئے ایسا ممکن نہیں۔اسی وجہ سے جو اردو کے اسکالر ہیں، اردو کے شیدائی ہیں انہیں ضلع بجنور اور اردو دونوں سے محبت ہے۔ یہی محبت ان کو اردو پر مضمون اور مقالہ لکھنے کے لئے ضلع بجنور کی ادبی خدمات کی جانب لے آتی ہے۔اس موضوع اور اس کے ذیلی عنوانات پر لکھنے والے بڑی تعداد میں ہیں۔لیکن 2 مئی 1986 کو کانپور میں شمیم الدین اور نشاط آرا صاحبہ کے یہاں پیدا ہوئے علیم ہاشمی نے بھی اپنے مقالے کا موضوع ''ضلع بجنور کے غیر مسلم شعراء'' کو بنایا۔علیم ہاشمی آج کل ہگلی محسن کالج یونیورسٹی آف بردوان (مغربی بنگال) میں اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو ہیں۔علیم ہاشمی کی ابتدائی تعلیم مغربی بنگال میں اور ایم اے کی تعلیم علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہوئی۔ان کے تحقیقی وتنقیدی مقالے راشٹریہ سہارا، اخبار مشرق کولکاتہ، کتاب نوئی دہلی کے علاوہ ملک کے معتبر اخبار ورسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔فکرونظر کے علاوہ بنگال میں اردو فکشن کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ علیم ہاشمی کی تصانیف ہیں۔کئی قومی سیمنار میں شرکت کر چکے علیم ہاشمی کو اردو معلی سکریٹری انعام اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے اعزاز مل چکا ہے۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی

ضلع بجنور کے غیر مسلم شعرا

علیم ہاشمی

ہندوستان کی تاریخ میں ضلع بجنور تمام شعبہ ہائے زندگی میں اپنے فنکاروں کے نمایاں کارناموں کی بدولت درخشندہ وتابندہ باب ہے۔ سیاسی، سماجی، ادبی، مذہبی تمام ہی شعبوں میں یہاں کے فنکاروں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ سیاسی اعتبار سے روہیل کھنڈ میں بڑے بڑے راجاؤ اور بادشاہوں نے حکومت کی اور تہذیبی وثقافتی اعتبار سے اس سرزمین کو سرفراز کیا۔ صوفیوں اور سنتوں نے اس میں پر تصوف اور بھکتی تحریکوں کے ذریعے عوام وخواص میں روحانیت کی وہ آنچ بھردی جس نے آپسی اخوت ہمدردی اور پیار محبت کے دھاگے میں سبھی کو موتیوں کی طرح پرودیا۔

جہاں ایک طرف ضلع بجنور کی تاریخ سیاسی، مذہبی نقطۂ نظر سے اہم رہی ہے وہیں ادبی فضا ہموار اور خوشگوار بنانے کے لئے بھی یہاں ہر دور میں ایسے جیالے پیدا ہوئے جنھوں نے ادبی خدمات کے ذریعے روہیل کھنڈ کو تہذیب وثقافت کا گہوارہ بنادیا۔

ضلع بجنور کی ادبی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہاں علم وعرفان کی ترقی وترویج میں مسلم فنکاروں کے شانہ بہ شانہ غیر مسلم ادباء، شعرا اور علماء نے بھی برابر کا رول ادا کیا ہے۔ ان غیر مسلم مشاہیر کے کارناموں اور علمی وادبی خدمات کی بدولت یہاں کی تہذیبی وثقافتی اور علمی فضا کے پروان چڑھنے اور ترقی کرنے میں اہم کردار ہے۔ ضلع بجنور کی تاریخ

اور بالخصوص ادبی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ غیر مسلم مشاہیر بھی علمی وادبی خدمات میں مسلم فنکاروں کے ساتھ ساتھ رہے۔ ان غیر مسلم مشاہیر میں جو لوگ نمایاں ہیں ان پر میں یہاں ضلع بجنور کے چند مخصوص شاعروں اور ادیبوں پر اظہارِ خیال کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس سے اندازہ ہو سکے کہ ان کے ذریعے ادبی کام کس نوعیت کا انجام پذیر ہوا ہے۔

منشی کیول نین سرکش کا نام تذکرہ ''گلشن ہمیشہ بہار'' میں روشن حرفوں میں لکھا گیا ہے۔ منشی سرکش ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ آپ ایک خوش گفتار اور خوش فکر شاعر تھے موضوعی اور پُر اثر شاعری آپ کے فن کا نمایاں وصف ہے۔ تذکرہ نگاری سے آپ کے دیرینہ مراسم تھے اکثر مشاعروں میں آپ کو داد وتحسین کا بازار گرم کرتے اور لوٹتے دیکھا گیا جو آپ کی خواص وعوام میں مقبولیت کی ضمانت تھی۔ ایک شعر مشہور ہے جس میں عشق کی پیچیدگی پر انوکھا سوال اٹھایا گیا ہے۔

کس طرح یار قیس اور فرہاد
ہاتھ سے عشق کے ہوئے برباد

ضلع بجنور میں سنتو کھ رائے بیتاب کا نام روشن نظر آتا ہے۔ قائم چاند پوری اپنے تذکرہ مخزن نکات میں رقم طراز ہیں کہ

> ''جناب بیتاب کم دماغ اور خلوت دوست ہیں۔ رنگِ سخن اور ربطِ کلام خوب جانتے ہیں۔ ان کا کلام روز بروز ترقی پذیر ہے۔ ان کی فکر کی بہار جلد ہی دوسرا رنگ پیدا کرلے گی۔ فقیر کے دوست ہیں اور اپنے کلام پر مجھ سے اصلاح لیتے ہیں''

جناب بیتاب بجنوری صاحب تنہائی پسند آدمی واقع ہوئے تھے، لیکن شاعری میں ملکہ حاصل تھا۔ آپ کا تذکرہ قدرت اللہ شوق نے بھی اپنے تذکرہ طبقات الشعرا میں کیا ہے اور ان کے کلام کی تعریف کی ہے۔

نہ رہے باغِ جہاں میں کبھی آرام سے ہم
پھنس گئے قیدِ قفس میں جو چھپے دام سے

محبت اب تلک رکھتی ہے یہ تاثیر مجنوں کی
کہ بن لیلہ نہیں کھنچتی کہیں تصویر مجنوں کی

دل کو الفت ہے صدا ابروئے خمدار کے ساتھ
اس سپاہی کو عجب عشق ہے تلوار کے ساتھ

محبت تمام شب رہی اس ماہتاب سے
مطلب کی بات ہو نہ سکی پر حجاب سے

جناب بیتاب کے بعد لالہ خشونت رائے شاداب کا نام تذکروں میں ملتا ہے۔ شاداب کا ذکر بھی قائم چاندپوری نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے۔ شاداب کو نثر اور نظم میں یکساں مہارت حاصل تھی جس کی وجہ سے انہیں اپنے ہم عصروں مین امتیاز حاصل تھا۔ قائم چاندپوری نے ہی انہیں اردو میں شعر گوئی کے لئے راغب کیا۔ اس لئے قائم چاندپوری سے اصلاح لی۔ میر حسن جیسے باکمال فنکار نے بھی بعض جگہ بیتاب کے شعروں کی تعریف کی ہے۔ جس سے ان کی قادرالکلامی کا پتہ چلتا ہے۔

جب تلک ہو کام مژگاں سے تو ابرو مت چڑھا
تیر کے ہوتے بھی کھینچے ہے کوئی تلوار کو

کہتا ہمین نہ شیخ کہ پڑھ قبلہ رو نماز
گر دیکھتا اُس ابروئے خمدار کے تیئں

منشی راج بہادر لال بھی ضلع بجنور کے اہم شاعر گردانے جاتے ہیں۔ جنھونے اردو شاعری کی فضا کو خوشگوار بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ راج بہادر لال کی شاعری اپنے وقت کے شعرا کے مقابلے میں جدید لب ولہجہ کی آمیزش سے ممتاز مقام رکھتی ہے انھوں نے نئے انداز و بیان سے انفرادی حیثیت حاصل کی تھی۔

نمونہ کلام

دوست سمجھے جسکو انساں در حقیقت دوست ہے
اب تو قاتل بھی نظر آتا نہیں قاتل مجھے

منشی رام سروپ ''اثر'' بھی روایتی انداز و بیان کا اور بالخصوص ضلع بجنور کی ادبی دنیا کا ایک نمایاں نام ہے۔ اثر کی شاعری کا عاشق معشوق کے سامنے بے سروسامانی کا شکار نظر آتا ہے کہا جاسکتا ہے کہ یہاں غالب کی حیثیت مغلوب میں تبدیل ہو چکی ہے۔

عشق میں ہم نے جان بھی دے دی
وہ ابھی ابتدا سمجھتے ہیں
حال کیا عرض کرے محوِ تمنا کوئی
مثلِ تصویر وہ خاموش بنا دیتے ہیں

رام سروپ اثر کے بعد منشی مدن بہاری شوق کا نام آتا ہے۔ پڑھے لکھے آدمی تھے شاعری میں روایتی لب ولہجہ اختیار کیا لیکن کوئی تسلی بخش کارنامہ انجام نہیں دے پائے تاہم ضلع بجنور کے غیر مسلم اردوداں طبقے میں اپنا نام درج کرانے میں کسی حد تک کامیابی حاصل کرلی۔

نمونہ کلام

زاہد خدا کے واسطے اتنا نہ جھوٹ بول
نسبت ہے کیا بہشت میں اور کوئے یار میں

ان سب کے علاوہ چندر پرکاش جوہر بجنوری، پرکاش چند مونس سیوہاروی، پروفیسر گیان چند جین، مہیندر سنگھ ''اشک''، رام کمار ورما ''غم بجنوری''، رام اوتار ''مضطر''، کرشن کمار ''کرش بجنوری''، راما شنکر ''راز بجنوری''، ویریندر پرتاپ ''بیتاب'' دھام پوری، راجیند ر چھولی، رام اوتار جمال کرت پوری، سنیل کمار ساحل نگینوی، شمبھو سنگھ ''دانش''، ویریندر ''شِک''، سدھیر تیاگی ''تنہا''، بلراج سنگھ ''حیرت''، کنج بہاری لعل ''شفق'' وغیرہ اور بھی بہت سے غیر مسلم مشاہیر شعرا و ادبا ایسے ہیں جنھوں نے اردوزبان کی آبیاری کی اور اس تہذیبی وثقافتی روایت کو مضبوط کیا۔ مکند

مراری لال قلم، دیپک دھام پوری جیسے شعرا بھی قابل ذکر ہیں۔

لہٰذا مندرجہ بالا سطور روہیل کھنڈ میں ضلع بجنور کے جن غیر مسلم شعرا اور ادبا کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے اس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ضلع بجنور گنگا جمنی تہذیب کی ایک نمایاں مثال ہے اور اسی لئے ان ادیبوں کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔

رابطہ:07044612422

اردو کا اسکالر۔ پرویز عادل

پرویز عادل کی پیدائش علم وادب کی بستی نگینہ کے محلہ قاضی سرائے میں شاہد حسین صاحب کے یہاں ۱۹۷۲ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ فیض القران نگینہ سے شروع کی اور تیرہ برس کی عمر میں حفظ قران کیا۔ پرویز عادل نے مالی طور پر نامساعد حالات کے باوجود تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور آگرہ یونیورسٹی سے ایم۔اے (اردو) کیا۔ حصولِ علم ان کا شوق ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ان کے ماڈل ہیں۔ ان کو یوپی کابینہ وزیر رہ چکے عزیز الرحمٰن کی شخصیت نے بے حد متاثر کیا اور ان سے تربیت بھی پائی۔ ۱۹۹۳ء سے ہفتہ روزہ نئی دنیا سے صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ قومی آواز، راشٹریہ سہارا اور عالمی سہارا سے وابستہ رہے، پرویز عادل مولانا آزاد ایجوکیشن کانگریس اور قومی اتحاد ٹرسٹ کے بانی ہیں۔ انھوں نے نگینہ کے وسیع النظر اور پختہ کلام شاعر یوسف اقبال کی غزلوں اور نظموں کی کتاب "سوزِ آرزو" کو ترتیب دیا۔ جنگ آزادی میں نمایاں کردار ادا کرنے والے، عالمی شہرت یافتہ، بجنور سے شائع "مدینہ" اخبار پر پرویز عادل کا تحقیقی کام ہے۔ تعلیم کے میدان میں سرگرم پرویز عادل کو کئی مقامی تنظیموں نے اعزاز سے سرفراز کیا ہے۔ ادبی اور تعلیمی محفلیں سجانا پرویز عادل کا شوق ہے۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی

اردو صحافت اور ضلع بجنور

پرویز عادل

سرزمین ہندوستان کا ہر ایک ذرہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمالیہ کی برفیلی چوٹیوں سے اتر کر آنے والی مقدس گنگا کی لہریں آج بھی اس کے ہرے بھرے گلشن کی آبیاری کر رہی ہیں۔ جتنے خطہ ہائے سرزمین ہیں وہ سب کے سب اس مالک حقیقی کے آگے سرنگوں ہیں کہ جس نے ان کو نمو اور روئیدگی بخشی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس مالک حقیقی کے آگے سرنگوں خطہ نے کبھی بھی دنیوی فرعونوں کے آگے سپر نہیں ڈالی۔ گزرے ہوئے زمانے میں کیسی کیسی نامور ہستیوں کو وقت نے کھنڈرات کے ڈھیروں تلے دبا کر فراموش کر دیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں پر ہر دور میں حق و انصاف اور انسانی زندگی کے لئے جدوجہد کرنے والوں کی فراوانی رہی۔

اسی گنگ و جمن کے میدانوں میں ایک سرسبز علاقہ مغربی اتر پردیش کے دامن میں بسا ضلع بجنور ہے۔ جو تاریخ ہندوستان میں نمایاں حیثیت اور منفرد مقام رکھتا ہے۔ فرنگی سامراج کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والوں میں یہ ضلع سب سے آگے رہا۔ چنانچہ تاریخ اور افسانوں میں وہ تاریخ بھی معروف زمانہ ہے کہ جس کو سرکشیء ضلع بجنور کہا جاتا ہے۔

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ سامراجی قہر و استبداد کے خلاف پہلی بغاوت اور پہلا پرچم بلند کرنے والوں میں اس ضلع کے لوگ صف اول میں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جو تاریخ 1858 میں نگینہ کے بائیں باغ میں تحریر ہوئی، اسی کو بیسویں صدی کے 1919 میں انگریزوں نے پنجاب کے جلیاں والا باغ میں دہرایا۔ جس طرح انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والوں میں یہ ضلع پیش پیش تھا اسی طرح بعد کی انقلابی تحریکات میں بھی اس نے قائدانہ رول ادا کیا۔

لبرل خیال کے لوگوں میں جو پیڑھی سردار پٹیل، لارڈ سنہا، مظہر الحق اور سی آر داس جیسے قابل وکلاء کی تھی انہیں میں ایک درخشاں ستارہ سر تیج بہادر سپرو بجنوری کی شخصیت تھی۔ جنھوں نے نہ صرف صحیح انقلابی طریقۂ کار سے بلکہ دستوری اور قانونی حدود کے اندر ہندوستانی وقار کو انگریزی تسلط کے مقابلے میں اجاگر کیا۔ بعد میں حافظ محمد ابراہیم نگینوی، مولانا حفظ الرحمٰن و بیرسٹر آصف علی سیوہاروی، عبداللطیف گاندھی، مولانا بشیر احمد بھٹہ اور رتن لال جین وغیرہ نے تحریک آزادی کو جلا بخشی۔

تحریک آزادی کی طرح اس ضلع کا نام ادبی سرگرمیوں کے اندر بھی نمایاں ہے۔ مولوی نذیر احمد نے اردو ادب میں ناول کی بنیاد رکھ کر زبان اردو کو ہمیشہ کے لئے اپنا مرہون منت بنالیا۔ تعذیرات ہند کا لفظ زبان اردو کو دیا اور خود کو ہمیشہ کے لئے زندہ و جاوید کر گئے۔ بعد میں یہ سلسلہ قائم چاند پوری، عبدالرحمٰن بجنوری، رفعت سروش، قرۃ العین حیدر، اظہار اثر، نشتر خانقاہی، عرفان رومانی اور ڈاکٹرز کاؤالرب رباب جیسے ادیبوں تک پہنچتا ہے۔ جبکہ تاریخ اسلام لکھ کر مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی نے بجنور ضلع کے سر پر علوم اسلامیہ کا تاج رکھ دیا۔

صحافت پیغمبروں کی سنت ہے اور ایک صحافی ہونے کا مطلب عوام الناس کو اچھائی کی طرف بلانا اور بری باتوں سے روکنا ہے۔ صحافت ایک دعویٰ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ صحافی کی ذات عامتہ الناس سے بلند درجہ پر فائز اور جہاں دیدہ ہے۔ کیوں کہ قصور واروں کو ان کا قصور جتانا بے قصور کو ہی زیب دیتا ہے یا پھر اس کو جو قصور جتانے کے وقت قصور واری کے زمرے سے باہر نکل چکا ہو۔

اکثر علماء مغرب اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ صحافت کی جزوی اور کلی ابتدا مغرب سے ہوئی۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے۔ اگر ہم صحافت کو جرنلزم یا گزٹ کا نام دیں لیکن صحافت اپنے عربی مصدر میں جن حروف سے مل کر بنا ہے وہ واحد میں صحیفہ اور جمع میں صحف کے نام سے عربی میں پہلے سے اور کلام پاک میں ہمیشہ سے موجود ہے۔ کلام پاک کی مقدس آیت کا ٹکڑا صحفِ ابراہیم و موسیٰ دراصل صحافت کا اصل منبع مخرج و ماخذ ہے۔

ضلع بجنور میں اردو صحافت کے امام اخبار مدینہ بجنور میں صحافت کی تعریف درج ذیل الفاظ میں پیش کی ہے۔ 'پریس کے معنی چھاپہ خانہ اور دبانے کے ہیں۔ یہ ایک جامع لفظ ہے۔ جس میں وہ سب رائیں اور خیالات شامل ہیں جو تحریراً اخبارات ورسائل وغیرہ کے ذریعہ رعایا، گورنمنٹ اور کل دنیا کے روبرو انکشاف حال رہبری پیش کئے جائیں۔ سرآ کلینڈ گیٹس کے خیال کے مطابق برطانوری پریس کا آغاز سولہویں صدی میں اس وقت ہوا جب قوم پر حیرت اور خوف کا غلبہ تھا۔ یعنی جب انگلستان پر اسپین کے مشہور جنگی جہازوں کے بیڑوں کے حملے کا نہایت بے چینی سے انتظار کیا جارہا تھا۔ حیرت اس وجہ سے تھی کہ خبریں معلوم کی جائیں۔ خوف اس وجہ سے تھا کہ دیکھئے نتیجہ کیا ہو۔ چنانچہ حیرت اور خوف کی مواصلت سے پریس پیدا ہوا۔ جسے جنگ کا بچہ بھی کہہ سکتے ہیں۔' (اخبار مدینہ 17 فروری 1920)

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ یہاں پر ہر دور میں حق وانصاف اور انسانی زندگی کے لئے جدو جہد کرنے والوں کی فراوانی رہی۔ اس لئے صحافت کا میدان عمل بھی فرزندان بجنور سے چھوٹا نہیں رہا۔ اردو صحافت کی ابتدا برصغیر ہندوستان میں 21 مارچ 1822 کو عمل میں آئی تو یہ ضلع اردو کے پہلے اخبار جام جہاں نما کی پکار کو نظر انداز نہیں کرسکا اور جام جہاں نما کی آواز پر لبیک کہنے والوں میں دیگر اضلاع پر فوقیت لے گیا۔ چنانچہ 62 برس بعد سرزمین ضلع بجنور سے اردو کا پہلا اخبار 'انجمن زراعت' 1884 میں شائع ہوا۔ یہ اخبار بجنور ضلع کی سونا اگلنے والی زمینوں سے متعلق تھا۔ یہ مکمل طور پر زرعتی صحافت کا ترجمان تھا۔ انجمن زراعت کب، کہاں سے اور کس کے ذریعہ جاری کیا گیا اس کی تفصیل بیان کرنے سے تاریخ صحافت قاصر ہے۔ البتہ مشہور مصنف مولانا امداد صابری نے اپنی کتاب 'روح صحافت' میں انجمن زراعت کا ذکر کیا ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اخبار انجمن زراعت سرزمین ضلع بجنور سے شائع ہونے والا اردو کا پہلا اخبار تھا۔

'مہر نیم روز' 1893 میں بجنور سے شائع ہونے والا زبان اردو کا دوسرا اخبار تھا۔ یہ اخبار حافظ عبدالکریم کے ذریعہ شائع کیا گیا تھا۔ اردو کے معروف ادیب شکیل احمد خاں شکیل بجنوری نے اپنی تصنیف صد سالہ صحافت ضلع بجنور میں صفحہ نمبر 80 پر مہر نیم روز کی نادر و نایاب

تصویر شائع کی ہے جو خود میں بڑی تلاش اور تحقیق ہے۔

مہر نیم روز کی بہت سی کاپیاں مولانا امداد صابری کی لائبریری میں بھی محفوظ ہیں۔ جس میں 1896 کے بیشتر شمارے شامل ہیں۔ اس اخبار کی قیمت دو پیسے تھی اور تعداد اشاعت تقریباً 300 تھی۔

'صحیفہ' یہ اخبار 1898 میں سرزمین ضلع بجنور سے ہفت روزہ کی شکل میں جاری ہوا۔ یہ مذہبی، ادبی، سماجی اور سیاسی خبروں کا ترجمان تھا۔ اس کو اخبار مدینہ کے مالک و مہتمم مولوی مجید حسن کے حقیقی پھوپا فیض الحسن بیزار نکالتے تھے۔ اس کی کتابت مولوی مجید حسن کے ذمہ تھی۔ گزیٹیر ضلع بجنور میں اخبار صحیفہ کا ذکر بڑے اہتمام سے ملتا ہے۔ صحیفہ کی تعداد اشاعت تقریباً 400 تھی۔

'صحن چمن' نگینہ کی سرزمین سے شائع ہونے والا اردو کا پہلا جریدہ تھا۔ مگر صحن چمن سے متعلق کوئی معلومات صحافت اردو پر تحریر ہوئی کتابوں میں دستیاب نہیں ہے۔ اس کا تذکرہ نگینہ کے بزرگ سینہ بہ سینہ کرتے اور سنتے چلے آرہے ہیں۔ روایت ہے کہ صحن چمن کے 1912 میں شائع ہوئے کسی شمارے میں مولانا آزاد کی ایک طویل نظم شائع ہوئی تھی۔ جس کا ایک مصرعہ درج ذیل تھا۔

ہے عکس روئے یار دل داغ دار میں
کچھ تیرگی نہیں ہے ہمارے دیار میں

'فخر الحسن' یہ اردو ہفت روزہ اخبار 1909 میں بجنور سے شائع ہوا تھا۔ اس کے مالک و مہتمم فیض الحسن بیزار تھے۔ جیسا کہ اخبار کے نام سے ہی ایک فرد کی تصویر ابھر آتی ہے، یہ اخبار فیض الحسن بیزار نے اپنے فرزند فخر الحسن کے نام پر جاری کیا تھا۔ اخبار فخر الحسن کا تذکرہ گزیٹیر ضلع بجنور میں بڑے اہتمام کے ساتھ ملتا ہے۔ تاہم شکیل احمد بجنوری نے اپنی تصنیف صد سالہ صحافت میں اخبار فخر الحسن کی تصویر شائع کی ہے۔ ساتھ ہی اخبار کی تاریخی اشاعت سے متعلق کتبہ بھی تحریر کیا ہے۔

سال طبع او بگفتم برملا۔ مطلع امید من فخر الحسن (1323ھ)

فخرالحسن کی کتابت اخبار مدینہ بجنور کے مالک و مہتمم مولوی مجید حسن کرتے تھے۔اس متعلق خود مولوی مجید حسن نے ایک قطعہ تحریر کیا ہے۔

کتابت میں نے کی تھی۔چوں کہ اس اقدس رسالہ کی

لکھوں تاریخ میں بھی بیٹھے بیٹھے یہ امنگ آئی۔

کیا خاموش نے جب ذکر تاریخ اس رسالہ کا

یہ ہے مرغوب دلہا اسر ہمت ندا آئی۔(1323ھ)

معین الاسلام۔یہ اخبار ہفت روزہ کی شکل میں بجنور سے جاری ہوا تھا۔اس مالک سجاد حسین ہوا کرتے تھے۔اخبار میں مسلم مسائل اور اصلاحی مضامین کثرت سے شائع کئے جاتے تھے۔معین الاسلام کی تفصیلی تواریخ پیش کرنے سے کتب ہائے صحافت خود کو مجبور پاتی ہے۔بجنور ضلع سے شائع ہوئے اخبار مدینہ نے اپنی اشاعت 28 اکتوبر 1919 میں ہفت روزہ معین الاسلام کا تعارف پیش کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔"یہ اخبار مسلمانوں کے خاص فائدہ کے لئے جاری کیا گیا ہے اور اس میں مضامین بھی اسی قسم کے شائع ہوتے ہیں۔اگر آپ کو علمی، تمدنی اور سیاسی اخبار دیکھنا ہو تو اس اخبار کو پتہ ذیل سے طلب فرمائیں۔اس اخبار کی ہفتہ وار قیمت مع محصول ڈاک صرف تین روپیہ مقرر ہے۔

مدینہ - اردو صحافت میں اخبار مدینہ بجنور کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔اخبار مدینہ یکم مئی 1912 کو مولوی مجید حسن بجنوری نے مدینہ پریس بجنور سے شائع کیا تھا۔اخبار مدینہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اخبار آخری وقت تک نیشنلسٹ اور قوم پرور رہا اور ہزار دقتوں کے باوجود اس اخبار نے طویل عمر پائی۔اخبار مدینہ کی اشاعت کا سلسلہ شروع کرنے کے بعد مولوی مجید حسن کا قافلہء صحافت محض ایک اخبار تک ہی محدود نہیں رہا۔بلکہ انہوں نے مدینہ پریس بجنور سے اخبار مدینہ، اخبار یثرب، ماہنامہ فاران اور بچوں کے لئے مخصوص رسالہ غنچہ شائع کیا۔اخبار مدینہ نے تحریک خلافت، تحریک آزادی اور آزادی ہندوستان کے بعد ملک کی تعمیر و تشکیل میں نمایاں رول ادا کیا۔یہ تحریک آزادی کا ہراول دستہ تھا۔یہ اخبار تقریباً 65 برس تک جاری رہا اور اس نے

ہندوستان سے باہر تقریباً 40 ممالک میں اپنے قارئین پیدا کئے۔ انگریزی قہر و استبداد کا سینہ چاک کرنے کے مبینہ جرم میں اخبار مدینہ کو متعدد مرتبہ زر ضمانت ضبط کرانی پڑی۔ انگریزوں نے قوم پرور اخبار مدینہ کو بے بال و پر کرنے کے مقصد سے اخبار کا داخلہ متعدد صوبوں میں بند کر دیا تھا۔ لیکن اخبار مدینہ کو جو نسبت آقاء نامدار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے تھی اخبار مدینہ نے اس کا ہمیشہ لحاظ رکھا اور صحافت کی پیغمبرانہ سنت کو اپنے ہاتھوں سے کبھی جانے نہیں دیا۔

عزیز لکھنوی کا شعر۔

معجزہ شق القمر کا ہے مدینہ سے عیاں
مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

اخبار مدینہ کے ماتھے کا جھومر تھا۔ ہم اخبار مدینہ بجنور کو ضلع بجنور کی اردو صحافت کا امام بھی کہہ سکتے ہیں۔

الخلیل۔ یہ ہفت روزہ اخبار بجنور سے مولوی محمد خلیل نے 1913 میں جاری کیا۔ الخلیل اپنے زمانے کا مشہور اخبار تھا کہ جس نے سرزمین ضلع بجنور سے ذمہ دارنہ صحافت کا علم بلند کیا تھا۔ جلیاں والا باغ میں ہوئے کشت و خون کے بعد انگریزوں نے جن اخباروں کا داخلہ صوبہء پنجاب میں بند کر دیا تھا اس میں ہفت روزہ الخلیل بھی شامل تھا۔

درج بالا چند ناقص سطور میں راقم الحروف نے چند اخبارات و رسائل کا مختصر تعارف پیش کیا ہے جبکہ سرزمین ضلع بجنور سے اردو صحافت کے تقریباً پانچ درجن سے زائد اخبارات و رسائل نے اردو زبان کے فروغ اور اشاعت میں کلیدی کردار نبھایا ہے۔ ہر چند کے اردو صحافت ضلع بجنور کے اوپر لکھی گئی ایک کتاب صحافت اردو کا پورا منظر نامہ پیش کرنے سے قاصر ہے لیکن یہ بات وثوق اور ذمہ داری سے کہی جاسکتی ہے کہ اردو صحافت ضلع بجنور پر ایک، دو، تین نہیں بلکہ متعدد کتابوں کو شائع کیا جاسکتا ہے اور ان سب کی اشاعت کا مواد سرزمین ضلع بجنور کی ذرخیز زمین میں موجود ہے۔

ضلع بجنور سے شائع ہوئے تمام اردو اخبارات بالخصوص اخبار مدینہ ضلع بجنور ان

نمایاں اخبارات میں ایک ہے کہ جس نے اردو کو نئے قلم سے روشناس کرایا۔ اخبار مدینہ کے ایڈیٹر اپنے زمانے کے مشہور مصنف، مورخ، صحافی اور نامور انشاء پرداز تھے۔ ادب عالیہ کہ جس کو مولانا ابوالکلام آزاد کے زمانے میں نئی پرواز حاصل ہوئی وہ اخبار مدینہ کا ہمیشہ سے خاصہ تھی۔ اخبار مدینہ نے نہ صرف صحیح طریقہء کار سے آئینی حدود میں رہ کر ہندوستانیوں کا موقف انگریزی سرکاروں کے سامنے رکھا بلکہ اردو ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ عظیم مجاہد آزادی مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کو مجاہد ملت کے لقب سے پکارا تو مشہور شاعر شفیع الدین نیر کو شاعر اطفال قرار دیا۔

امید ہے کہ شیخ نگینوی نے اردو کی ترقی میں ضلع بجنور کا کردار کے عنوان سے جس چشمے کی تلاش سرزمین ضلع بجنور میں کی ہے اس کے سوتے بجنور ضلع کے دوسرے حصوں میں بھی پھوٹیں گے اور اردو ادب کو سرسبز و شاداب کر دینے والی ایک نئی گنگا کا آغاز ہوگا۔

رابطہ: 09412568028

بجنور ضلع کا معتبر قلم کار-- محمد احمد دانش روانوی

آکاش وانی رامپور کے سامعین آواز سن کر بتا سکتے ہیں کہ یہ ادبی چاشنی سے مزین آواز محمد احمد دانش روانوی کی ہے۔ کیوں کہ آل انڈیا ریڈیو رامپور سے دانش روانوی کی اکثر غزلیں، کہانیاں اور مضامین نشر ہوتے رہتے ہیں۔ محمد احمد دانش روانوی کی ولادت ضلع بجنور کی دھامپور تحصیل کے موضع روانہ شکار پور میں 15 مارچ 1966 کو منشی تصدق حسین کے یہاں ہوئی۔ 1988 میں بی اے، معلم اردو کرنے کے بعد دانش روانوی نے تعلیم کا سلسلہ پھر شروع کیا اور 2003 میں ایم اے اردو اور 2004 میں نیٹ کوالیفائی کیا۔

دانش نے شاعری میں غزل، پابند و آزاد نظموں کے علاوہ قطعہ، رباعی، ماہیے میں طبع آزمائی کی جو مقتدر ادبی رسائل و جرائد میں زیور طباعت کے مراحل سے گزر کر قارئین سے داد و تحسین حاصل کرتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ اردو پروگرام کے تحت آل انڈیا ریڈیو پر تقاریر و مباحثے قومی ادبی سیمناروں، جلسوں اور مذاکروں میں شرکت کرتے ہیں۔ شاعری کے علاوہ افسانہ نگاری، مضمون نگاری بھی کرتے ہیں۔ دانش نے جوش بدایونی کے کلام آتشِ خاموش کا ہندی ترجمہ کیا۔ ''نقوشِ دانش'' کے نام سے دانش روانوی کی کتاب بہت جلد منظر عام پر آنے والی ہے۔ ہندوستان کا کوئی ایسا معیاری اخبار یا جریدہ نہیں جس میں محمد احمد دانش کی ادبی تخلیق شائع نہ ہوئی ہو۔ درس و تدریس کے شعبے سے تعلق رکھنے والے دانش کی ادبی سرگرمیاں ضلع بجنور کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی رہتی ہیں۔ آج کل بچوں کے ادب پر بہت کم لوگ کام کر رہے ہیں لیکن محمد احمد دانش روانوی بچوں کے لئے کہانیاں، نظمیں تخلیق کرتے ہیں۔ جو ماہنامہ نور رامپور، ماہنامہ ادب اطفال بہار، ماہنامہ بچوں کی نرالی دنیا دہلی، ماہنامہ امنگ دہلی وغیرہ میں اکثر پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔ دانش نے ماہنامہ اچھا ساتھی بجنور کی دو سال تک ادارت بھی کی۔ صحت کی خرابی اور تمام ذاتی مصروفیتوں کے باوجود محمد احمد دانش روانوی اردو کی ترقی میں معاون بنے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی

ضلع بجنور میں اُردو افسانہ

محمد احمد دانش روانوی

ضلع بجنور کو صرف اُردو ناول نگاری میں ہی پیش قدمی کا شرف حاصل نہیں کہ اُردو ناول کے موجد ڈپٹی ندیر احمد کا تعلق ضلع بجنور سے رہا ہے بلکہ بجنور کو افسانہ نگاری میں بھی پیش قدمی اور اوّلیت کا شرف حاصل رہا ہے اگر چہ محققین اور ناقدین ادب پریم چندر کو افسانہ نگاری کا پیش رو مانتے ہیں مگر بعض محققین نے تاریخی اور تحقیقی شواہد کی بناء پر سید سجاد حیدر یلدرم ولادت 1880 قصبہ کانڈیر ضلع جھانسی وطن مالوف ضلع بجنور کو اُردو افسانے کا بانی قرار دیا ہے اور افسانہ نگاری میں اوّلیت کا سہرا یلدرم کے ہی سر باندھا ہے۔ جن کے ''مطالعہ یلدرم'' کے صفحہ ۳۸ پر مطبوعہ دو بیانوں سے بخوبی توثیق ہوتی ہے، پہلے بیان میں وہ رقم طراز ہیں۔

''مجھے یلدرم کے ایک قدیم افسانے'' ''نشہ کی پہلی ترنگ'' کا سُراغ ملا ہے۔ جو پہلی بار معارف علی گڑھ ایڈیٹر مولوی وحیدالدین سلیم پانی پتی شمارہ اکتوبر 1900 صفحہ ۱۲ پر شائع ہوا ہے جو پریم چند کے افسانوں پر فوقیت رکھتا ہے، پریم چند کے پہلے افسانے'' دنیا کا سب سے انمول رتن'' سے بطور قدامت موازنہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں ''منشی پریم چند کی کہانی'' دنیا کا سب سے انمول رتن'' جو 1908 میں رسالہ'' زمانہ'' کانپور میں چھپی ہے کو اپنا پہلا افسانہ بتاتے ہیں جو 1908 میں شائع ہوا تھا'' جس کے متعلق وہ خود رقم طراز ہیں'' میری پہلی کہانی کا نام تھا دنیا کا سب سے انمول رتن'' جو 1908 میں'' زمانہ'' کانپور میں چھپی اس کے بعد'' زمانہ'' میں چار پانچ اور کہانیاں لکھیں، بحوالہ مطالعہ یلدرم از معین الرحمٰن صفحہ ۳۸۔ سید سجاد حیدر یلدرم بحیثیت افسانہ

نگار کے پیش روئی اور تقدم کی توثیق شمس الرحمٰن فاروقی کے درج ذیل بیان سے بھی ہوتی ہے۔
یلدرم کی تاریخی اہمیت کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ اُنہوں نے کئی میدانوں میں اپنے نقوش چھوڑے،
افسانے میں وہ پریم چند سے پہلے ادب لطیف کہی جانے والی نثر میں وہ نیاز فتح پوری سے مقدم ہیں
اور مزاح میں اُن کا اثر پطرس بخاری کے ہاں جا بجا نظر آتا ہے"۔

"افسانے کی حمایت میں" از شمس الرحمٰن فاروقی صفحہ 185 مطبوعہ 1981 سجاد حیدر یلدرم کے مطبوعہ افسانوں کی زمانی ترتیب اشاعت پر اگر نظر ڈالی جائے تو بھی اُن کا اُردو افسانے کا موجد ہونا محقق ہو جاتا ہے ابتداء میں اگرچہ انہوں نے 1900 "میں نشہ کی پہلی ترنگ" کے علاوہ جو افسانہ تحریر کیا ہے وہ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" ہے جو اگست 1900 کی تخلیق ہے اور انگریزی مضمون کا چربہ ہے" اس کے علاوہ انہوں نے فروری 1906 میں "صحبت ناجنس" اور اکتوبر 1906 میں "خارستان وگلستاں" ترکی زبان سے اُردو میں ترجمہ کئے، اُن کے افسانوی ترجموں کی یہ خوبی ہے کہ وہ ترجمہ ہوتے ہوئے بھی طبع زاد معلوم ہوتے ہیں اور یہ خوبی ان کے ان ترجمہ شدہ افسانوں کو فنی تخلیق سے متصف کر دیتی ہے، ترجمہ شدہ افسانوں کے علاوہ اُنہوں نے جو طبع زاد افسانے تحریر کئے اُن میں "غربت وطن" اکتوبر 1906 "دوست کا خط" 1906 "اور حضرت دل کی سوانح عمری" جو سوانحی افسانہ ہے دسمبر 1906 میں شائع ہو چکے ہیں اور منشی پریم چند کی پہلی مطبوعہ کہانی "دنیا کا سب سے انمول رتن"، "زمانہ" کانپور 1908 سے قبل ہی تخلیق و طباعت کے عمل سے گذر چکی ہے اس طرح سید سجاد حیدر یلدرم اُردو کے پہلے افسانہ نگار ثابت ہو جاتے ہیں۔

خیالستان "یلدرم کے ۱۳، افسانوں کا مجموعہ ہے جسے ڈاکٹر معین الرحمٰن نے ترتیب دیا ہے۔ جس میں بقول یلدرم "صحبت ناجنس" "خارستان وگلستاں" "نکاح ثانی" "سوادِ رنگین" چاروں افسانے ترکی زبان سے لئے گئے ہیں افسانہ "خارستان وگلستاں" انشائیہ نگاری اور نزاکت کا مکمل نمونہ ہے یلدرم نے اپنے زورِ قلم اور بے پناہ تخیل سے کام لے کر ایک ایسی تخلیق پیش کی ہے، جو ماخوذ ترجمہ ہوتے ہوئے بھی طبع زاد (خود ساختہ معلوم ہوتی ہے) افسانہ تین حصوں

میں منقسم ہے جس کے عنوانات ''گلستاں'' ''خارستاں'' اور ''شیرازہ'' ہے افسانہ میں عورت کی نفسیات اور سیرت کی گرہ کشائی کی گئی ہے۔

''صحبت ناجنس'' افسانہ کا موضوع بے میل شادی، مزاج کی ناموافقت جنسی بے راہ روی، کردار کی پاکیزگی وخود سپردگی کے ذریعہ شوہر کو دوسری عورت کے دام فریب سے چھڑانا ہے، افسانہ کا موضوع یاس والم بھی ہے، یلدرم کے افسانوں میں اسالیب کی بوقلمونی وتازہ کاری رعنائی و تخیل کی کارفرمائی ہے۔

''حکایت احتسابات'' دوسرا افسانوی مجموعہ ہے جس کے افسانوں میں ''گم نام خطوط'' ''افسانہائے عشق'' بزم رفتگاں'' ''سلطان مادر'' ''ویران صنم خانے'' ''ترکی کی عدیم المثال مصنفہ'' اور وطن پرست ''خالدہ'' ''ادیب خانم'' سحر آفریں تخیل کا نتیجہ ہیں ''آئینے کے سامنے'' ''تیتری'' ''ایک مغنیہ سے التجاء'' ''عورت کا انتقام'' ''داماد کا انتخاب'' ترکی کے مصنفین سے بہ تصرف لئے گئے ہیں جو اسلوب کی رنگینی ورعنائی کا بہترین نمونہ ہیں، ہندوستان کی ''رقاصہ'' ''مصر قدیم کے محبوب ہائے عاشق نواز'' ''بخت نصر کا قیدی'' ''تلاش حق'' وغیرہ عشقیہ قصوں میں دلچسپی کا مظہر ہیں جن کا موضوع تاریخی ہے۔ ضلع بجنور میں اُردو افسانہ کا سفر بابائے افسانہ سجاد حیدر یلدرم متولد 1880 متوفی 1943 سے ہوتا ہوا سلسلہ بسلسلہ نذر سجاد حیدر ولادت 1892 کوثر چاندپوری ولادت ۸، اگست 1908 صدیقہ بیگم سیوہاروی 1925 رفعت سروش ولادت ۲ جنوری 1926 وفات ۳۰ نومبر 2008 ، محترمہ قرۃ العین حیدر ولادت ۲۰ جنوری 1927 وفات ۲۱، اگست 2007 ذکاء الرب رباب پیدائش ۴ نومبر 1929 اظہار اثر پیدائش ۱۵ جون 1929 صبغت اللہ خاں شور صحرائی پیدائش ۲۷ جولائی 1930 وفات ۴ نومبر 2008 عشرت کرتپوری پیدائش یکم جنوری 1934 ، یہاں انصاری کوائف پیدائش نامعلوم نعیم کوثر ۱۵ دسمبر 1936 شہناز کنول تولد 1947 ہنوز جاری ہے کے علاوہ چند نئی نسل کے افسانہ نگار بھی اپنی افسانوی صلاحیتوں کے جوہر دکھا رہے ہیں جن میں اسلم صدیقی، نہٹور (بجنور) ڈاکٹر مناظر احسن مرادابادی مسکون حال نینڈڑو (بجنور) شمشاد ندیم دھام پور (بجنور) قابل ذکر ہیں۔

ضلع بجنور کے افسانہ نگاروں نے عہد بعہد افسانوی رجحانات اور تحریک وافکار کی نمائندگی کی ہے، یہاں کلاسیکل اسالیب وطرز کے افسانے بھی لکھے گئے جن میں عشق ورومان کی مٹھاس کے ساتھ ساتھ خواہش وصل کی لذتیں بھی محسوس کی جاسکتی ہیں تو ہجر وفراق کا کرب بھی ترقی پسندانہ رجحانات وافکار کی نمائندگی بھی افسانوں میں ہوئی ہے تو جدیدیت کے زیر اثر یہاں کے افسانوں میں تمثیل وتجریدیت، رموز وعلائم بھی دیکھنے کو ملتے رہے ہیں، یہاں کے چند افسانہ نگاروں نے بحیثیت شہرت ومقبولیت، اسالیب وفکر کے ملکی سرحدوں کو بھی عبور کیا ہے وہیں چند افسانہ نگار پردۂ گمنامی میں ہی دفن ہوکر رہ گئے لیکن ان گمنام فنکاروں کے فن میں بھی کہیں معنوں میں فنی امتیاز ضرور دیکھنے کو ملتا ہے چند افسانہ نگاروں نے بطور اکتساب فن وتاثیر پیش رؤوں اور معاصر قلم کاروں کا رنگ قبول کرنے کے باوصف اپنی انفرادی شناخت بھی قائم کی ہے، بحیثیت موضوع واسالیب پیش رووں اور معاصرین کے رنگ میں خود کو دُہراتے ہوئے پلاٹ اور بیانیہ لہجے میں انفرادیت دکھلائی، مثلاً ''منٹو کا افسانہ کھول دو'' میں افسانہ کی ہیروئن تقسیم ہند کی یورش ویلغار کے نتیجے میں درندہ صفت بلوائیوں کی جنسی ہوس کا شکار بنتی ہے تو وہیں عشرت کرتپوری کے افسانہ ''بانٹ لو'' میں ہندوستان کی ایک ایسی بیٹی کی کہانی ہے جس کی عصمت آزادی ملنے کی خوشی میں اُس کے ہندو اور مسلم بھائیوں نے لوٹ لی تھی، دونوں افسانوں میں موضوع ومسائل کی یکسانیت کے باوجود پلاٹ اور بیانیہ متضاد ہیں بحیثیت اسالیب وتکنیک بھی یہاں ہر طرح کے افسانے تحریر ہوئے ہیں، کچھ افسانہ نگاروں کے یہاں زبان کی رنگینی وشاعرانہ بیانیہ کے باوصف افسانوں میں انشاء پردازی کا حُسن دیکھا جاسکتا ہے بعض کے یہاں لہجے کا سپاٹ پن کھٹکتا ہے بعض نے پلاٹ کے تانے بانے میں کہانی کو کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے کہ کرداروں کی سیرت نگاری نے ان افسانوں کو محض سوانح بنادیا ہے۔

چند افسانوں کے عنوانات کسی شعر کے مصرعۂ اولیٰ یا مصرعۂ دوم سے مستعار لے کر پلاٹ میں بیان ہوئے نفس مضمون کے درمیان میں مکمل شعر کو بخوبی چسپاں کردیا ہے۔ جس مثال میں ڈاکٹر ذکاءالرب رباب کے افسانہ ''اپنے رہبر کو ہم نے لوٹ لیا'' کو دیکھا جاسکتا ہے۔ جس کے

پلاٹ میں کہانی کے مضمون اور کرداروں کی سیرت میں انہوں نے شعر

رہزنوں سے جب ہو گئے محفوظ اپنے رہبر کو ہم نے لوٹ لیا

کی معنوی تفسیر کو سمو دیا ہے، کچھ افسانہ نگاروں نے خطیبانہ انداز اپنایا ہے تو کچھ افسانوں کے پلاٹ میں معاصر عہد کی تاریخی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں اور بیشتر افسانے معاصر عہد کے تہذیبی مرقع ہیں، کچھ میں رو بہ زوال قدروں کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں تو کچھ میں دم توڑتی کہنہ تہذیب کی آہٹ محسوس ہوتی ہے، سطور ذیل میں ہم نے زمانی ترتیب کے لحاظ سے اجمال واختصار کے ساتھ ضلع کے افسانہ نگاروں کا فنی تجزیہ کیا ہے۔

نذر سجاد حیدر:۔ چودہ سال کی عمر میں افسانہ لکھنے شروع کئے۔اس دور میں نیاز فتحپوری، مجنون گورکھوری اور پریم چند اپنی تحریروں سے افسانوی ادب کو مال مال کر رہے تھے، پہلا افسانہ ''اختر وزہرہ'' اگست 1937 میں ''نیرنگ خیال'' میں شائع ہوا،مسلم معاشرہ کے رسم ورواج کے علاوہ خودغرضی، ایثار قربانی، ہمدردی وغیرہ جذبات کو افسانوں کا موضوع بنایا ہندوستانی رسم ورواج پر بھر پور طنز کرتی ہیں، کرداروں کی سیرت میں مطلب پرست رشتہ داروں کی ریشہ دوانیوں کو بخوبی نبھایا ہے''افسانہ بی مغلانی'' نمائندہ افسانے ہیں،افسانہ ''حُسن انتظام'' میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی کے کردار کی بخوبی کی عکاسی کی گئی ہے جو اپنی صلاحیت اور حُسنِ اخلاق سے نوکری پا کر خود کفیل بن گئی ہے،''ایام عروسی'' خطوط کے انداز میں تحریر دو سہیلیوں کی کہانی ہے یہ بغیر پلاٹ کا افسانہ ہے،جس میں نہ کوئی افسانوی خوبی ہے کردار نگاری اور نہ مکالمہ صرف دو کرداروں سے کہانی شروع ہو کر اُنہیں پر ختم ہو جاتی ہے،''تقدیر کا پھیر'' مرکب پلاٹ والا افسانہ ہے،جس میں کئی ضمنی کہانیوں کو جوڑے جانے کے سبب پلاٹ میں جھول محسوس ہوتا ہے''کرشمہء الفت'' طویل پلاٹ کے افسانہ پر ناولٹ کا شائبہ ہوتا ہے رواں دواں شستہ اور بیگماتی زبان میں سماجی موضوعات اور رومان پرور جذبات کو برتا ہے۔جس کے بارے میں حجاب امتیاز علی لکھتی ہیں''ان کی تحریروں میں بلبل کی حلاوت اور کوئل کی کوک جیسی اُداسیاں ہوتی ہیں''۔

کوثر چاندپوری:۔ ولادت ۸/اگست 1908 وفات ۱۲/جون 1990 افسانوی مجموعہ شعلہ

سنگ مطبوعہ 1962 ''آوازوں کی صلیب'' میں شامل افسانے ''ید بیضاء'' ''عالم بالا'' ''اللہ بخشے'' ''نرگس کے پھول'' ''جوئے شیر'' ''ابر کا ٹکرا'' ''بے زبان قاتل'' ''لذت سنگ'' اور ''آوازوں کی صلیب وغیرہ نمائندہ افسانے ہیں جس کا دوسرا ایڈیشن مارچ ۱۹۷۹ء میں حلقہ فکروشعور دہلی سے شائع ہوا ہے، سماج میں نت نئی تبدیلیوں اور اُن کے محرکات، مختلف علوم رفتار ترقی سے باخبر رہتے ہوئے تخلیقات میں بدلتے ہوئے زمانے کے ادبی رجحانات کو بخوبی برتا ہے مشاہدے کی گہرائی اور ذہن کی رنگارنگی تخلیقات میں دیکھنے کو ملتی ہیں، موضوعات کے انتخاب اور پیش کش میں ماہر ہیں جس کی تصدیق نعیم کوثر کے بیان سے بخوبی ہو جاتی ہے تحریر کرتے ہیں ''کوثر چاندپوری کو تجزیہ کار اور دیدہ ور فنکار کہنا صحیح ہے، اُن کے شعور میں فرسودگی اور پُرانا پن نہیں پایا جاتا وہ پُرانے ہو کر بھی نئے ہیں قدامت میں جدت کو سمو کر وہ اپنے فن میں بلندی اور تازگی پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ افسانوی آرٹ کو برتنے کا سلیقہ خوب جانتے ہیں زبان اور بیان پر قابل رشک قدرت رکھتے ہیں مجھے یقین ہے کہ ''آوازوں کی صلیب'' کا پُر جوش خیر مقدم کیا جائے گا اور یہ مجموعہ ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل کرے گا'' پیش لفظ آوازوں کی صلیب از نعیم کوثر آوزوں کی صلیب مصنف نعیم کوثر چاندپوری، ناشر حلقہ فکروشعور اوکھلا جامعہ نگر دہلی 1979۔

صدیقہ بیگم سیوہاروی:۔ پیدائش 1925 لکھنؤ تصانیف ''ہچکیاں'' ''پلکوں میں آنسو'' ''ٹھیکرے کی مانگ'' اور ''رقص بسمل'' وغیرہ افسانوی مجموعے پہلا افسانوی مجموعہ شائع ہوا تو آپ حجاب امتیاز علی، نذر سجاد حیدر، ہاجرہ نازلی عصمت چغتائی اور ڈاکٹر رشید جہاں کی صف میں آن کھڑی ہوئیں، صدیقہ بیگم سیوہاروی کے افسانوی رنگ اور اسلوب فن پر اُن کے مجموعے ''پلکوں میں آنسو'' پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے مشہور صحافی اور افسانہ نگار خواجہ احمد عباس رقم طراز ہیں ''چلئے صاحب وہ صدیقہ بیگم بھی اُن بدنام افسانہ نگاروں کے گروہ میں شامل ہو گئیں'' جو'' آرٹ برائے آرٹ'' کا مذہب چھوڑ کر'' آرٹ برائے زندگی'' کی بدعتوں کو اختیار کر چکے ہیں، اب بھلا اس شریف لڑکی سے کون پوچھے کہ پردے دار اصلاحی افسانے یا ڈرائنگ روم میں پڑھنے کے قابل تحت الشعوری کہانیاں لکھنے کے بجائے تم کیوں زندگی اور اُس کی اقتصادی کشمکش میں

اُلجھتی ہو؟ کم سے کم افسانہ نگار عورتوں کو تو اپنی نسوانی نزاکت اور نفاست کو برقرار رکھنا چاہئے اگر سماج کے ناسوروں سے پیپ بہتی ہوئی نظر آتی ہے تو منہ پھیر لو، اپنے گول کمرے کے فرانسیسی دریچوں کو بند کر کے بیٹھے رہو تمہیں طبقاتی جنگ کے بھنور میں کود پڑنے کو کس نے کہا ہے؟ ....

.......اور یہ جنسی مسائل! ایسی باتیں تو بیسوا جانیں.................توبہ! توبہ!

تعلیم کا باقاعدہ نظم نہ ہو سکا درسی کتب کے علاوہ نذیر احمد اور علامہ راشد الخیری کے اصلاحی و سماجی ناولوں تک محدود تھا مگر بعد میں اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر اخلاق وارثی سے بہت کچھ پڑھا "بجنور کے جواہر" کے مصنف فرقان احمد صدیقی اُن کے متعلق "بجنور کے جواہر" کے صفحہ ۸۷ ناشر مجلس اشاعت ادب ذاکر نگر دہلی ۱۹۹۱ء میں ایک بیان صدیقہ بیگم سیوہاروی سے نقل کرتے ہیں "گھر کا ماحول زمیندارانہ، راشد الخیری کی تصانیف مولوی نذیر احمد کے ناول اور اسی قبیل کی اخلاقی کتابیں اور اس کے علاوہ فارسی کی ابتدائی تعلیم اور قرآن پاک کی تلاوت بس یہ گھر تھا میرا۔ مدرسہ اور یہ کتابیں میرا بستہ تھیں جنہیں میں بار بار پڑھتی تھی جیسے کلام پاک کی تلاوت ہوتی ہے، میرے بڑے بھائی تھے "ڈاکٹر اخلاق احمد وارثی" سائنس کے طالب علم، پُرانی قدروں کے سخت مخالف اُنہوں نے میرے لئے زندگی آسان کر دی، میں نے جو کچھ پڑھا اُنہیں کی مدد سے پڑھا" زمیندارانہ گھریلو ماحول کی پروردہ اِس خاتون کے یہاں ترقی پسندانہ افسانوی رنگ اُن کے بڑے بھائی اخلاق وارثی کی ذہنی تربیت کا ہی رہین منت ہے جس کے نتیجے میں اُن کے یہاں گھریلو ماحول کے برعکس فکری تضاد جس کی نمائندگی اُن کی کہانیوں میں ہوتی ہے دیکھا جا سکتا ہے اور یہ فکر و فن کا رنگ شاید اُن کی ذہنی تربیت کے علاوہ اُن کے شوہر معروف ادیب و ناقد اطہر پرویز جو کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رُکن تھے ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۷ء کمیونسٹ پارٹی کا دور عروج اور اسی دور میں اُن کی تخلیقات معرض وجود میں آئیں کا فکری امتزاج بھی کہا جا سکتا ہے"

رفعت سروش:۔ ولادت ۲/ جنوری ۱۹۲۶ء وفات ۳۰/ نومبر ۲۰۰۸ء وطن نگینہ ضلع بجنور افسانوی مجموعہ "دھند لکے کی زنجیر" جس کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے م م راجندر نے اس افسانوی مجموعے کو اُس کی خوبیوں کے سبب تین حصوں میں تقسیم کیا ہے (۱) بلند پایہ معیاری

افسانے (۲) اعلیٰ سطحی تمثیلی یا تجریدی افسانے (۳) وہ افسانے جن میں جذبات اور ڈرامائی عناصر غالب ہوگئے ہیں، دیباچہ دھند لکے کی زنجیر از م م راجندر۔ افسانوی پلاٹ میں شہری زندگی کی گھٹن، دیہی زندگی کی پُر کیف فضا، دو کرداروں کی محبت میں حائل امیری اور غریبی کی خلیج، خود احتسابی جیسے موضوعات کو بخوبی ڈھالا گیا ہے، کرداروں کی سیرت کو فنی چابکدستی کے ساتھ سادہ اور سلیس نثر میں بخوبی بیان کیا ہے نفسیات کے نباض ہیں نفسیاتی پہلوؤں کی عکاسی فنکارانہ مہارت کے ساتھ کی ہے۔

محترمہ قرۃ العین حیدر:۔ فکشن کے میدان میں عالمی شہرت کی حامل مصنفہ کی پیدائش ۲۰ر جنوری ۱۹۲۷ء بمقام علی گڑھ ہوئی وطن مالوف نہٹور ضلع بجنور، وفات ۲۱ راگست ۲۰۰۷ء نوئیڈا دہلی، اعلیٰ تعلیم یافتہ زمیندار گھرانے کی پروردہ رہیں، ابتداء میں اپنے والد سجاد حیدر یلدرم سے فیض اُٹھایا بعدہٗ حجاب امتیاز علی، مجنوں گورکھپوری اور کرشن چندر کے رُومانی رنگ کا اثر اُن کے فن میں در آیا لیکن یہ اثر رفتہ رفتہ زائل ہوگیا جس کی جگہ اُن کے منفرد نئے رومانی اسٹائل نے لے لی جسے اُن کے افسانوں ''جب طوفان گذر چکا'' ''سر راہ'' ''رقص شرر'' ''آسمان بھی ہے ستم ایجاد کیا'' ''میں نے لاکھوں کے بول سہے'' ''دَجلہ بہ دَجلہ'' ''یم بہ یم'' ''مونالیزا'' ''برف باری سے پہلے'' اور ''جہاں پھول کھلتے ہیں'' میں دیکھا جا سکتا ہے، اُن پر ترقی پسند افسانہ نگاروں کا کوئی اثر نہیں ہوا جن کی تنقید کا وہ اکثر و بیشتر ہدف بنیں لیکن وہ بھی اُن کے فن کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے، عصمت چغتائی اُن پر لکھے مزاحیہ خاکے ''پوم پوم ڈارلنگ'' میں اپنے تمام تر اعتراضات کے باوجود اعتراف کرتی ہیں کہ ''قرۃ العین کا مضمون دیکھ کر چھینا چھپٹی شروع ہوجاتی ہے'' واہ واہ کیا کہنا'' کرشن چندر جیسی ٹھوس رومانیت، حجاب اسماعیل جیسی طلسمی فضائیں اور عصمت جیسے چٹختے ہوئے مکالمے ....جی نہیں خاص قرۃ العین کی اپنی تراش خراش............رنگینی اور لوچ............ جو کسی خدشے کا محتاج نہیں، ''پوم پوم ڈارلنگ'' مشمولہ ''چھوئی موئی'' از عصمت چغتائی صفحہ ۱۳۶۔

قرۃ العین حیدر نے مغربی فنکاروں کا اثر قبول کیا جس کے نتیجے میں ٹی ایس ایلیٹ جیمس جوائس اور ورجینا وولف کے ہلکے پھلکے مگر پُر تاثیر پلاٹ جن میں چھوٹی چھوٹی تفصیل کی سمائی

بھی بخوبی ہوتی ہے زمان و مکان سے آزاد تکنیک، توازن واتحاد، زبان وادب پر مضبوط گرفت شعور کی گہرائیوں جیسے اوصاف قرۃ العین کے یہاں سحر کی سی تاثیر پیدا کر دیتے ہیں، قرۃ العین حیدر کے کردار ورجینا وولف کے کرداروں سے گہری مناسبت رکھتے ہیں ''رخشندہ''،''خوشونت سنگھ''،'' فاروق'' اور'' ساجدہ'' وغیرہ کردار ورجینا وولف کے The portrait of a lady کے کرداروں سے مماثلت رکھتے ہیں علامت نگاری اور اسطور سازی کے وقت قرۃ العین حیدر کا قلم ہزاروں سال پُرانی تاریخ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے قرۃ العین حیدر آپ بیتی کو اس طرح بیان کرتی ہیں کہ جگ بیتی محسوس ہوتی ہے، ہندوپاک میں خواتین کے مسائل اور تقسیم کے المیے کو ناولوں کے علاوہ افسانوں میں بھی بیان کیا ہے تاریخی وتہذیبی عمل کی امیجری اُن کے افسانوں میں دیکھی جاسکتی ہے علاوہ ازیں اُن کے یہاں انفرادی حوالے بھی اجتماعی حوالے بن جاتے ہیں۔

ڈاکٹر زکاء الرب رباب:۔ پیدائش ۴/نومبر ۱۹۲۹ء بقید حیات نہ صرف ہندوستان بلکہ ملک سے باہر پاکستان میں بھی انتہائی مقبول فکشن نگار کی حیثیت رکھتے ہیں، اُن کے ناول اور افسانوں کی زیادہ تر کتابیں پاکستان سے ہی چھپی ہیں جن میں ''پھولوں کی شہزادی'' افسانوی مجموعہ ہے۔ مذکورہ افسانوی مجموعے میں نائیلون کی گڑیا''،'' پرچھائیں''،'' اپنے رہبر کو ہم نے لوٹ لیا'' اور'' پھولوں کی شہزادی'' وغیرہ قابل ذکر افسانے ہیں۔ افسانوں میں زیادہ تر فلیش بیک تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ ان کے افسانوی پلاٹ میں حالات کا جبر کرداروں کی سیرت میں انقلاب برپا کر دیتا ہے اُن کا رنگ اسلوب درج ذیل اقتباس میں دیکھا جاسکتا ہے۔

'' یہ دنیا کتنی عجیب ہے اور اس کے رہنے والے جواب نہیں'' مال و دولت تو چھوڑیئے وہ تو آدمی آدمی سے چھینتا ہی ہے لیکن ہم تو شاخوں پر جھومتے، مسکراتے شاداب غنچے بھی نوچ لیتے ہیں ادھ کھلی کلیوں کو توڑ کر کسی کے حضور بہت پیارا ساتحفہ پیش کرتے ہیں سہرا بناتے ہیں، قبر پر چڑھاتے ہیں یہاں تک کہ ان پھولوں کی روح بھی کھینچ لیتے ہیں۔'' اپنے رہبر کو ہم نے لوٹ لیا'' مشمولہ '' پھولوں کی شہزادی'' صفحہ ۱۲۵ ناشر رابعہ بک ہاؤس لاہور 1947 افسانہ'' پھولوں کی شہزادی'' بچوں کی نفسیات پر لکھا گیا عمدہ افسانہ ہے جس میں مصنف نے مزاح کا پہلو بھی اختیار کیا ہے۔

اظہار اثر:۔ پیدائش ۱۵ر جون ۱۹۲۹ء شعری حسیت سے معمور رومانی سماجی اور سائنسی ہر طرح کی کہانیاں لکھتے ہیں جن کا تانا بانا محض تخیل کی بنیاد پر نہیں بُنتے بلکہ حقیقت کو کہانیوں کی شکل میں ڈھال کر پیش کرنے میں ماہر ہیں۔ کرداروں میں جھوٹے فریبی عاشق جن کی محبت کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں بس جنسی ہوس کا شکار ہیں، کی ہوس کاری کو بخوبی پیش کیا ہے۔ افسانوں میں کرداروں کی نمائندگی ہوتی ہے احساس محرومی کو بھی کرداروں کی نفسیات کے ساتھ اُن کی سیرت میں فنی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر شمع افرز زیدی اظہار اثر کی کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔اُن کے افسانے زندگی کے مسائل سے گہرے طور پر جڑے ہوئے ہیں۔ زندگی کی کشمکش، معاشرے میں پھیلی ہوئی بدعنوانیاں اور موجودہ نظام کی کج روی پر اُن کا قلم طنز کا تیر چھوڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے، جس کے ذریعہ افسانے کی فضا کو مؤثر بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اُن کے یہاں نہ ابہام ہے اور نہ روایتی انداز اور نہ اُن کا قاری اُلجھن کا شکار ہوتا ہے۔ یہ انسانی رشتوں کی ایسی کہانیاں ہیں جن میں جواں دلوں کی دھڑکنیں بھی ہیں بوڑھوں کی معصومیت اور بچوں کا کھلنڈرا پن بھی، ''میرے افسانے'' تبصرہ نگار شمع افروز زیدی سہ ماہی ''استعارہ'' صفحہ ۲۶۳ ء شمارہ ۱۰ر تا ۱۱ر اکتوبر تا مارچ دریا گنج نئی دہلی۔

صبغت اللہ خاں شور صحرائی:۔ پیدائش ۲۷ر جولائی ۱۹۳۰ء وفات ۴ر نومبر ۲۰۰۸ء سے موضوعات عام سماجی، گھریلو، اور عشق و رومان پر مبنی ہوتے ہیں اس کے علاوہ جہیز کی لعنت اور اس سے پیدا شدہ مسائل کو بھی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے، تشبیہ، واستعارہ اور پیچیدہ تراکیب سے گریز کرتے ہوئے سادہ سہل اور با محاورہ زبان کا استعمال کیا ہے۔ کہانیوں میں حقیقت کو خیالی رنگ میں پیش کیا ہے علاوہ ازیں بطور راوی کہیں خود اپنا بھی کردار پیش کیا ہے۔ سماجی سروکار کو بھی بحیثیت موضوع خوب خوب برتا ہے بیشتر افسانوں کا تانا بانا خود اپنے گھریلو مسائل اور ماحول کے گرد بھی بُنا ہے۔

''اشکوں کی نمی''، ''دو تیر''، ''خوابوں کا شہر''، ''تیر و ترکش''، ''پیوند''، ''ایک جوڑا اساس کا'' قابل ذکر

افسانے ہیں۔افسانوں میں منظر نگاری کم ملتی ہےاور اگر ملتی ہے تو بہت اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے۔اُن کے زیادہ تر افسانوں میں خود اپنی زندگی جھلکتی ہے جس کے باوصف اِن کہانیوں کو افسانے کے بجائے بطور سوانح دیکھا جاسکتا ہے۔طبقاتی سماجی نفسیات کی بھی بخوبی عکاسی کی ہے۔اُن کے افسانے ''پیوند'' سے ذیل کے اقتباس ملاحظہ کریں۔''معاملہ ہے ایک غیر مسلم لڑکی کا، اچھی طرح سے سوچ لو! پہلے تو یہی دیکھنا ہے کہ اُس کے والدین بھی رضامند ہیں یا نہیں کیونکہ وہ بھی ایک غیور قوم کے فرد ہیں قومی اقدار کی پاسداری اُنہیں بھی ملحوظ رکھنی ہوگی۔مان لو اُس کے والدین رضامند بھی ہیں تو پھر عزیز واقرباء اور دیگر متعلقین کا متفق الرائے ہونا بھی ضروری ہے۔کسی بھی بہتان کو لے کر رنگ کھڑا کر کے معاملے کو طول دیا جاسکتا ہے۔ہر طرح سے سمجھ لو معاملہ نے طول پکڑ لیا تو............؟میرے خیال میں شعلے بھڑکنے کا اندیشہ ہے''۔''پیوند''از صبغت اللہ خاں شور صحرائی، ماہ نامہ نئی سوسائٹی مراداباد، صفحہ (۴۳) جولائی۔اگست ۱۹۹۰ء

پنہاں انصاری:۔ پیدائش کرتپور ضلع بجنور افسانوی مجموعہ ''حرف نارسا'' لکھنے کی تحریک بھائی کی اچانک موت کے اتفاقی حادثے سے ملی۔گھر کا ماحول قدامت پسند، خود آگہی، خودشناسی سے مملو، اسلوب بیان جس میں زندگی اپنی تمام رعنایوں کے ساتھ رواں دواں نظر آتی ہے، میں معاشرے کی مبہوت کُن تصویر کشی کرتی ہیں۔شاعرانہ طرز تحریر میں جگہ جگہ اشعار ٹانکتی جاتی ہیں افسانوں میں انشائیہ کا رنگ دیکھنے کو ملتا ہے جس کے سبب نثر میں بھی نظم کا مزہ پیدا کر دیتی ہیں ترقی پسند اور صاحب طرز ادیبہ جن کی صداقت افسانوں میں جابجا دیکھنے کو ملتی ہے افسانوں میں حقیقی زندگی کی ترجمانی کے ساتھ معاشرے کو غلط رسم ورواج سے آزاد کرنے کی متمنی اور انانیت کو بام عروج تک پہنچانے کی خواہشمند رہی ہیں۔افسانہ'' داغ داغ اُجالہ'' میں وہ جمہوریہ اسلام پاکستان کے لوگوں کے اخلاق وکردار پر طنز کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔''اب ہم دونوں اندرون شہر سے گذر رہی تھیں کہ یکا یک کہیں سے ایک معمر بزعم خود اندھا فقیر صدا لگاتے ہوئے ہمارے بہت قریب سے گذرا اور آہستگی سے شانت کے سڈول بازوؤں میں کہنی سے ایک ٹھوکہ لگاتے ہوئے بے پروائی سے آگے بڑھ گیا۔اندھا ہوں، معذور ہوں اندھے کو مولیٰ کے نام پر دو! کا ورد

کرتا ہوا آگے بڑھ گیا اور وہ چونکہ زخمی ہرن کی مانند پہلی بار چلائی اندھے ہو کیا؟ دیکھ کر نہیں چلتے؟ وہ اندھا ہے مائی، کئی لوگ اُس کی حمایت میں بول اُٹھے۔ دوسرے بازاری تماشائی ہماری جانب شرارت آمیز نظروں سے رکیک اشارے کرنے لگے"۔ "داغ داغ اجالا" مشمولہ "حرف نارسا" صفحہ ۲۰ / راز پنہاں انصاری ناشر استعارہ اسلام آباد ۱۹۹۷ء

نعیم کوثر:۔ پیدائش 15 / دسمبر 1936، چھ سو پچاس افسانوں کے خالق ۲۰ / افسانوں پر مشتمل افسانوی مجموعہ "خوابوں کے مسیحا" مکتبہ جامعہ لیمیٹیڈ دہلی سے ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔ رومانیت سے بھرپور افسانے جن میں علامت واشاریت کا پردہ نہیں ہوتا میں سماجی سروکار کی عکاسی بخوبی ہوتی ہے۔ سماجی تانے بانے کے ٹوٹنے اور بننے کے اثرات اُن کے یہاں مختلف شکلوں میں نمایاں ہوتے ہیں۔ دو متضاد فرقوں کے افراد کے کرداروں کی نمائندگی، دکھی انسانیت کی مسیحائی، فرقہ دارانہ فسادات میں معصوموں کی ہلاکت، جیو اور جینے دو کی عملی تصویر اُن کے کرداروں کی سیرت میں دیکھی جا سکتی ہے۔ منٹو، کرشن چندر اور خود ان کے والد کوثر چاند پوری کا فنی اثر اُن کے فن میں پختگی پیدا کر دیتا ہے طویل منظر نامے تخلیق کرتے ہیں نثر میں شاعری کرنے کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ فکر و فن کا ارتقا جاری ہے۔ نعیم کوثر کا فن ترقی یافتہ اور فکر احساس تعمیر سے روشن ہے نظریۂ رجائیت زندگی کو بسر کرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ پہلی تخلیق "یتیم بچہ کی عید" "نونہال" دہلی میں ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی۔ علاوہ ازیں آپ کے افسانے "بیسویں صدی" ماہنامہ "شاعر"، "شمع"، "سب رنگ"، "کائنات"، "جمالستان"، "روزنامہ تیج"، "آریہ ورت" وغیرہ رسائل وجرائد کی زینت بنتے رہے ہیں۔

شہناز کنول:۔ پیدائش 1947 سوانحی، یادداشتی اور مراسلاتی اسلوب میں افسانے لکھتی ہیں سیکڑوں افسانوں کی خالق ہیں جن میں "غیبی آواز" اور "داستان گو" قابل ذکر افسانے ہیں "غیبی آواز" میں افسانے کا کردار بیجا خود اعتمادی کے سبب خدا کا منکر ہے جو اچانک ہوائی حادثے کا شکار ہونے کے سبب راہ راست پر آجاتا ہے۔ اُن کے یہاں زندگی کے سرد و گرم جیسے حالات کا ہنسی خوشی مقابلہ کرتے ہوئے خود بناوٹی قصوں سے دوسروں کا دل بہلانے والے داستان گو

کردار بھی ہیں جن کی سیرت کا مطالعہ افسانہ ''داستان گو'' میں کیا جا سکتا ہے۔ تخلیقی سفر جاری ہے۔ افسانہ ''غیبی آواز'' سے ذیل میں اقتباس پیش ہے۔

''بات صرف تجربہ کی نہیں ہوتی، بات قاعدہ، قانون اور اصول ضوابط پر چلنے کی ہے زندگی کے ہر میدان میں یہی بات اہم ترین ہے کہ ہم زندگی کے کسی بھی قانون کا مذاق آڑا کر کامیاب نہیں ہو سکتے'' ''غیبی آواز'' از شہناز کنول ماہنامہ انشاء کلکتہ صفحہ 36 / ماہ اپریل 1991۔

رابطہ - 975941804

مفتی محمد اویس اکرم۔ ایک انجمن

"زبان کسی مذہب یا ملت کی میراث نہیں ہوتی ہے زبان ایک رواں دواں سمندر کی مثال ہے جس میں بہت سی ندیاں آکر ملتی ہیں۔ اردو زبان کا کمال یہ ہے کہ اس نے مذہب کی شعریات (شریعت) اور جمالیات (تصوف) دونوں کا مجموعہ ہونے کا ثبوت دیا۔ ضلع بجنور کے ناموران نے بھی دونوں میں اپنے علم کا ثبوت دیا۔ مولوی ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی، مفتی عزیز الرحمٰن، مولانا سراج الدین ندوی وغیرہ بہت سے نام اس فہرست میں ہیں ۔اور سبھی کی تعلیم تربیت مدارس میں ہوئی۔ اردو کو زندہ رکھنے میں مدارس کا اہم کردار ہے۔

ضلع بجنور کی سرکردہ شخصیت مفتی محمد اویس اکرم قاسمی سے ضلع بجنور اردو اور مدارس کے حوالہ سے ایک مضمون کی درخواست کی گئی، انہوں نے اپنے مصروف ترین اوقات میں مضمون تیار کیا۔ مفتی محمد اویس اکرم کی پیدائش 20 اپریل 1960 کو قصبہ کرتپور میں شیخ الحدیث مولانا جمیل احمد صاحب کے یہاں ہوئی۔ محمد اویس اکرم نے مدرسہ امداد الاسلام میرٹھ سے حفظ مدرسہ خادم الاسلام ہاپوڑ سے تجوید القران اور مشکوٰۃ شریف تک، درس نظامی سے فراغت اور افتاء دار العلوم دیوبند سے عالم، فاضل، فاضل طب، دینیات، عربی ادب، عربی فارسی بورڈ لکھنو سے کیا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مفتی محمد اویس اکرم کی تقرری جولائی 1987 میں نگینہ کے تاریخی مدرسہ قاسمیہ عربیہ میں ہوئی۔ جہاں صدر مدرس کے ساتھ ساتھ نگینہ کی جامع مسجد کے امام وخطیب کی ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔ مفتی محمد اویس اکرم کی تنظیمی اور انتظامی صلاحیت نے انہیں صوبائی نائب صدر جمعیۃ علماء ہند، صدر عدالت شرعیہ ضلع بجنور، صدر ضلع تعلیمی بورڈ بجنور، صدر انجمن فلاح

الحجاج نگینہ، ضلع صدر عربی فارسی مدرسہ ٹیچر ایسوسی ایشن بجنور، سرپرست سیرت کمیٹی نگینہ۔ اصلاح معاشرہ تحریک، تنظیم نیوز واچ کے علاوہ ضلع امن کمیٹی، ضلع یکجہتی سمیتی بجنور، ٹاسک فورس پلس پولیو مہم نگینہ وغیرہ کے رکن کی ذمہ داریاں بھی دیں۔ مفتی محمد اویس اکرم امام عیدگاہ اور شہر قاضی کرتپور بھی ہیں۔ مفتی محمد اویس اکرم کا شمار ضلع بجنور کے سرگرم مذہبی وملی رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ بے لوث ملی وقومی خدمات انجام دینے والے مفتی محمد اویس اکرم فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے لئے سرگرم وکوشاں ہیں۔ ساتھ ہی مظلوموں کے حقوق کے لئے بھی مفتی محمد اویس اکرم برسرپیکار رہتے ہیں۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی

اردو کی ترقی میں ضلع بجنور کے مدارس

مفتی محمد اویس اکرم

ہندوستان پر مسلمانوں کی صدیوں کی حکمرانی نے سارے برصغیر کو جو تحفے دیے ہیں وہ اردو، لال قلعہ اور تاج محل ہیں، تاج محل اسلام اور مسلمانوں کے شعور کا جمال اور تہذیبی سربلندیوں کا پیکر ہے۔ لال قلعہ ان کے آہنی عزم اور قوت وجبروت کا پُرشکوہ شاہکار ہے مگر اُردو کے سکّے پر ایک طرف تاج محل اور دوسری طرف لال قلعہ ہے۔ یہ زبان شاہ جہاں بادشاہ کے زمانے میں عربی کی جرأت، فارسی کی صباحت، ہندی کی لطافت اور انگریزی کی شہامت لے کر شستہ ورفتہ ہوئی، اور پنجابی، سنسکرت وغیرہ مختلف زبانوں سے مل کر مختصر مدت میں ملک کی قومی وسرکاری زبان بن گئی، اس لیے یہ زبان کسی ایک ملک وقوم یا مذہب وگروہ کی زبان نہیں؛ بلکہ ہندو مسلم، سکھ، عیسائی سبھی اس کو بولتے ہیں۔ یہ زبان خلوت کی انارکلی اور جلوت کی رضیہ سلطان ہے؛ یہی وجہ ہے کہ اس زبان میں محبوباؤں کے خطوط کی رازداری بھی ہے اور میدانِ کارزار میں طبلِ انقلاب کے غرور کی طرحداری بھی، عشق مجازی کا لہو اور عشق حقیقی کا خون اس کی نس نس میں تیر رہا ہے، اس میں شاخِ گل کی نرمی اور تلوار کی تیزی ہے، یہ زبان انسانی زندگی کی دھوپ چھاؤں کی نمائندہ ہے۔ اس کی نثر کا خزانہ بھی اتھاہ ہے اور اس کی شاعری کا سرمایہ بھی بے پناہ۔ مگر نثر اور شاعری کے علاوہ بھی اس زبان نے گفتگو اور تقریر کے میدان میں اپنی امتیازی حیثیت کا لوہا منوایا ہے ''چوں کہ اُردو میں کائنات کے سماجانے کا حوصلہ ہے''

اُردو زبان اور شعروادب کی زلف گرہ گیری کی مشاطہ گری میں دبستانِ دہلی ولکھنؤ، اُردو شعراء، دکن سے دہلی تک پھیلے ہوئے استاذی وشاگردی کے نیٹ ورک اور ادبی خدمات سے بھی انکار ممکن نہیں؛ لیکن اُردو زبان وادب کو عوام کے تعاون سے، عوامی زبان بنانے کا شرف اہلِ مدارسِ

اسلامیہ عربیہ کو ہی حاصل ہے، اور اتنا بڑا جگر کہ "اُردو میں کائنات کے سما جانے کا حوصلہ ہے" ان ہی مدارس نے دیا، وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے کہ شیرازِ ہند جون پور اور اس کے ذرا بعد دہلی، بھوپال، لکھنؤ اور بعض دیگر مقامات پر علم دین کی تدریس کا سلسلہ جاری تھا، علم کی روشنی دور دراز تک پھیل رہی تھی بہ ایں ہمہ وصف اس کی حیثیت صرف علمی بازار کی تھی جہاں سے علم دین کے ثمر تقسیم کیے جاتے تھے؛ لیکن جب دیو بند میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور حاجی عابد حسین صاحبؒ نے اپنے دیگر رفقا کے ساتھ ۳۰ رمئی ۱۸۶۶ء بروز جمعرات کو ایک اسلامی قلعہ کی بنیاد رکھی۔ اور یہ قلعہ "انار" کی عرفانی چھاؤں میں قائم ہوا، اور اس کی بسم اللہ ایک استاذ اور ایک شاگرد سے ہوئی حسنِ اتفاق کہیے کہ استاذ بھی محمود اور شاگرد بھی محمود؛ دیکھتے ہی دیکھتے یہ گہوارۂ علم و ہنر عالمی سطح پر اسلامی تعلیمات اور علومِ نبویہ کا واحد معتدل اور معتبر مرکز کی حیثیت اختیار کرتا گیا، طالبانِ علوم آتے، اس شجرِ طوبیٰ سے ثمر بار ہوتے اور علم دیں کے پودوں کو لے جا کر اپنے علاقوں میں ان کی شجر کاری میں لگ جاتے۔ شدہ شدہ برِ صغیر میں دارالعلوم کے طرز پر ہزاروں مدارسِ اسلامیہ قائم ہوتے گئے اور بیشمار اُردو جاننے والے مفسرین، محدثین، متکلمین، اہلِ قلم و مصنفین، شعراء و ادبا پیدا ہوتے گئے۔ اس طرح اردو تمام جگہوں پر ہر علاقے کے مدارس میں ذریعۂ تعلیم کی حیثیت اختیار کر گیا اور زمینی سطح پر اردو کو بہت بڑے خطے میں اپنے پاؤں پھیلانے کا ان مدارس کے توسط سے موقع ہاتھ آ گیا۔

یوں کہیے کہ دارالعلوم دیو بند ایشیاء ممالک میں ایک ایسا اُبلتا ہوا آبشار ہے: جس سے ملک و بیرونِ ملک کا ہر خطہ، خوشہ چیں ہے۔ انھیں رندوں میں ضلع بجنور بھی علمی و ادبی، تعلیمی و تدریسی خدمات میں نمایاں رہا ہے۔ اصد شکر شعر و سخن کے علاوہ اردو اگر اپنے طریق اسلوب اپنے رسم الخط اور املاء میں کہیں محفوظ ہے تو وہ دینی مدارس ہیں جنھوں نے اردو کو آج بھی اپنے سینہ سے لگا رکھا ہے۔ اسلامی عربی مدارس کے ذریعہ تعلیم اردو ہونے کی وجہ سے ہندوستان کی ان ریاستوں کے طلباء بھی جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے اسلامی مدارس میں داخلہ لینے کے بعد وہ طلباء اردو سیکھتے اور پڑھتے ہیں پھر بولنے اور لکھنے پر بھی قادر ہو جاتے ہیں۔ اسلامی علوم کی عربی فارسی کی کتابوں کو اساتذہ اردو میں پڑھاتے اور سمجھاتے ہیں قرآن کریم کی تفاسیر اور احادیث کی تشریحات اردو ہی

میں طلباء کو سمجھاتے ہیں یعنی اسلامی مدارس میں افہام وتفہیم کی زبان اردو ہی ہے ان مدارس کے جتنے ماہ نامے اور رسائل شائع ہوتے ہیں وہ اردو زبان میں ہی ہوتے ہیں مدارس سے جاری ہونے والے فتاوٰی کی زبان بھی اردو ہوتی ہے مدارس کا سارا کام کاج جیسا کہ حاضری طلباء مدرسین روزنامچہ، رجسٹر تنخواہ، اعلانات واحکامات تمام کام اردو ہی میں ہوتے ہیں۔اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اردو زبان اور اسلامی مدارس ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم کا درجہ رکھتے ہیں ہر چند کہ زبان وادب کی تعلیم وتدریس مدارس کے ذمہ نہیں ہے لیکن بعض بڑے مدارس میں اردو بحیثیت مضمون اختصاص کے ساتھ شامل ہیں۔

ضلع بجنور کے اسلامی مدارس اردو کی ابیاری میں پیچھے نہیں ہیں۔ضلع بجنور میں بڑی تعداد میں اسلامی دینی مدارس اور مکاتب ہیں جن میں قران کریم کا ترجمہ وتفسیر احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات اور دیگر فنون کی کتابیں جیسا کہ فقہ اصول فقہ نحو صرف منطق فلسفہ بلاغت و انشاء کی تعلیم اردو زبان میں ہی دی جاتی ہے۔ضلع بجنور میں بھی مدرسہ تعلیمی بورڈ لکھنو سے کئی سو مدارس منسلک ہیں جس میں ۴۰، ۴۵ مدارس عالیہ درجات کے ہیں۔مدرسہ تعلیمی بورڈ یوپی کے نصاب میں قرآن وحدیث، فقہ، منطق وفلسفہ نحو صرف کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کی تاریخ اردو نثر ونظم ترجمہ نگاری مرثیہ قصیدہ گوئی یعنی صنف سخن کے بھی اقسام اور ماہرین اردو زبان وادب نیز اردو زبان وادب کے نثر نگاروں اور سخن وروں کی حیات خدمات اور کارنامے بھی بطور خاص داخل نصاب ہیں۔مدرسہ تعلیمی بورڈ کے علاوہ بھی کئی سو مدارس ہیں جو دارلعلوم دیوبند سے الحاق شدہ ہیں جن میں درس نظامی کا نصاب پڑھایا جاتا ہے۔درس نظامی کے نصاب کی تمام تر کتب عربی اور فارسی میں ہیں، لیکن ان کی درس وتدریس کی زبان بھی اردو ہے۔

ضلع بجنور کے مدارس اسلامیہ میں بھی درس وتدریس، افہام وتفہیم، فتاوٰی کی زبان اردو ہی ہے۔بلکہ مدارس کے تمام تر کام کاج اردو زبان ہی میں کیے جاتے ہیں۔جہاں تک فروغ اردو، ترقی اردو کی بات ہے تو ضلع بجنور کی مٹی نے ایسے سپوتوں کو جنم دیا ہے جنھوں نے اُردو کی ہر پہلو سے آبیاری وآب پاشی کی ہے: خواہ وہ نطقاً ہو یا تحریراً۔صحتِ تلفظ کا میدان ہو یا املے کا۔چوں کہ کوئی بھی

زبان جب تک شستہ ورفتہ نہیں ہوسکتی اور نا ہی سیکھی اور سکھائی جاسکتی ہے؛ جب تک اس کے تعلق سے پانچ باتوں کو مدنظر نہ رکھا جائے۔

پہلی بات: زبان کو نطقاً سیکھنا اور حاصل کرنا ہے۔ یعنی اپنے خیالات، تاثرات، مشاہدات اور تجربات کو بیان کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کا سب سے مؤثر ہتھیار زبان ہے؛ چوں کہ ادائیگی کا اسلوب جتنا خوب صورت اور لہجہ دلکش ہوگا؛ اسی قدر متاثر بھی ہوگا۔

دوسری بات: زبان کو تحریراً سیکھنا اور سکھانا ہے یعنی مضمون نگاری، انشاء پردازی، اور تصنیف وتالیف کی سطح پر سیکھنا اور سکھانا ضروری ہے؛ اس لیے کہ تحریر کے ذریعہ سے بھی اپنے مقاصد کو الفاظ وحروف کے دیدہ زیب جامے میں دلکش اسلوب کے ساتھ ملبوس کیا جاسکتا ہے۔ اول الذکر ذریعہ آسان بھی ہے اور سہل بھی، مگر اس ذریعہ کے اثرات خاص حالات کو چھوڑ کر عموماً وقتی اور عارضی ہوتے ہیں پھر اس کا کوئی ریکارڈ بھی سامنے نہیں ہوتا کہ اپنی بات اسی انداز اور دلنشیں پیرائے میں دوبارہ ادا کی جاسکے، جتنی بار کوشش کی جائے گی اتنی ہی اسلوب وادائیگی میں تبدیلیاں ہوتی چلی جائیں گی، اس کے مقابلہ میں قلم سے ایک بار جو لکھ دیا اور خراش تراش کے بعد اسے آخری صورت دے دی تو جب تک کاغذ کی رگوں میں زندگی کی سیاہی دوڑتی رہے گی اور حروف روشن اور اجلے رہیں گے اس وقت تک یہ پیغام اور فکر زندہ رہے گی یا جب تک کاغذ کا پیرہن چاک نہیں ہوگا اس وقت تک یہ ذخیرہ محفوظ رہے گا اور پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا رہے گا۔

تیسری بات: کسی لفظ کا صحیح املا ہے یعنی کسی زبان کے کسی لفظ کو اسی طرح لکھنا جس طرح اس زبان میں اسے لکھا جاتا ہے، املا کی بڑی اہمیت ہے، اگر اس کا خیال نہ رکھا جائے تو لفظ کچھ کا کچھ بن جاتا ہے، بعض مرتبہ یہ سمجھنا دشوار ہوتا ہے کہ کس معنی میں مستعمل ہے۔

چوتھی بات: تلفظ اور صحتِ ادا ہے یعنی یہ ضروری ہے کہ جو لفظ زبان سے جس طرح ادا ہونا چاہیے اسی طرح ادا کیا جائے۔

پانچوی بات: حسنِ تحریر ہے، یعنی ہر نویسندہ اور اہلِ قلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ الفاظ عمدہ اور صاف لکھے اور کم از کم اتنا صاف لکھنا تو ہر نویسندہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ جو کچھ لکھے وہی پڑھا جائے، ایسا نہ ہو

کہ لکھے کچھ اور بدخطی کہ وجہ سے پڑھا جائے کچھ اور۔ ان مذکورہ پانچ باتوں پر عمل کیے بغیر اردو کا سیکھنا، سکھانا ناقص سمجھا جائے گا۔ الحمد للہ ضلع بجنور کے اہلِ مدارس، شائقینِ اردو زبان اور علماء نے صرف ان پانچ باتوں کو ہی مدنظر رکھ کر اردو کی آبیاری و آب پاشی نہیں کی؛ بلکہ انھوں نے ہر وہ پہلو جوان کے بس میں تھا اختیار کیا اور اُردو کی ترویج و اشاعت میں لگ گئے، اور لگے ہوئے ہیں۔ جن میں سرفہرست مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی قدس سرہٗ کی شخصیت ہے۔ جن کے مجاہدانہ کارناموں سے صرفِ نظر آپ کی خدمات ترقی اردو میں تقریر و تحریر کے اعتبار سے نمایا رہی ہے۔ آپ کی تصنیفات میں قصص القرآن، سیرت رسول کریم، اسلام کا اقتصادی نظام، اخلاق و فلسفہ، البلاغ المبین فی مکاتیب سید المرسلین وغیرہ قابلِ ذکر ہے۔ علاوہ ازیں آپ کے آہوئے قلم سے ایسے ایسے نافۂ مشک برآمد ہوئے ہیں جن کے بارے میں کچھ کہنا اور لکھنا آفتاب کو انگلی اٹھا کر دکھانے کے مترادف ہے۔ ؎

چہرہ کھلی کتاب ہے عنوان کچھ بھی دو

جس رخ سے مجھے پڑھو گے جان جاؤ گے

اسی طرح مناظرِ اسلام حضرت مولانا مرتضٰی حسن صاحب چاند پوریؒ کی ذاتِ بابرکت ہے جنھوں نے اردو کو مناظرے کے اسٹیج سے چہار دانگِ عالم میں پہنچانے کی کوشش کی۔ جب آپ مناظرے کے اسٹیج پر پہنچتے تو مجنون الذہن و کج رائے معاندین و معیوبین اسلام کے ہوش و حواس ہرن ہو جاتے چوں کہ حضرت کو سخن وہ دُرِ عدن، جو بات ہوتی وہ از راہِ معنی کرامت۔

صفِ اول کا مستحق نام قاضی سجاد حسین ؒ کا ہے جو محلّہ قاضیان کرتپور میں ۱۹۱۰ء کو قاضی شمشاد حسین کے دولت کدہ میں تولد پذیر ہوئے بعد تحصیلِ علوم آپ کا مشغلہ کتب بینی اور تحریر و تقریر کا رہا۔ فارسی زبان کے ایسے ماہر کہ فارسی کی بڑی بڑی کتابوں کی اردو میں شرح کی جیسے مثنوی شرح دیوان، فتاوائی تاتارخانیہ، شیخ سعدیؒ کی مشہور تالیف گلستاں کا اردو حاشیہ تحریر فرما کر ترقیِ اردو میں ضلع بجنور کا نام روشن فرما گئے۔

حضرت مولانا احمد رضا صاحب بجنوریؒ جن کی اردو تالیف انوار الباری شرح اردو صحیح البخاری، ملفوظات علامہ کشمیریؒ بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔

حضرت حافظ نذر احمد صاحب نگینوی ثم لاہوری جن کا لفظی ترجمہ اردو قرآن کریم فرید بک ڈپو نے طبع کیا ہے۔

حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب ؒ ۱۶ سے زائد کتب کے مصنف تقریر القرآن، تذکرہ مشائخِ دیو بند، انفاسِ قدسیہ، تاریخ الاحکام، آخری رسول، اسلامی دستور، اصحاب النبی وغیرہ کے مؤلف ۱۹۲۵ء کو قصبہ نہٹور میں تولد پذیر ہوئے۔

اگر اس مضمون میں امیر الہند حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ کا تذکرہ نہ کیا جائے تو یہ مقالہ یقیناً ناقص رہ جائے گا جن کی شخصیت ایشیاء کے عظیم مرکز ازہر الہند دار العلوم دیو بند اور ترقیِ اردو کے لیے ایک گوہرِ آبدار و پائیدار کی مانند تھی، جن کا وصفِ خاص چستی، ہمہ وقت سرگرم عمل، سستی سے بالکلیہ مُبرّا، بلند ہمتی، خود اعتمادی، ارادے کی پختگی، ایشیاء ممالک میں دینِ اسلام کی یہ زبانِ عربی، فارسی، انگریزی، اردو کی اشاعت کے سب سے بڑے رمز دار العلوم دیو بند کی ۳۰ رسال زمام اقتدار سنبھال کر چہار دانگِ عالم میں ترقیِ اردو کی موشگافیوں کو وَا کر کے ایک عظیم رہنما ثابت ہوئے۔

اب تک ہم نے نمونے کے طور پر مرحومین میں سے چند خدامِ اردو کا تذکرہ کیا ہے، وگرنہ لکھنے کو تو ایک طویل فہرست ہے۔ جن میں سے بھی صرف بعضوں کے نام پر اکتفا کرتے ہیں۔: ان کی خدمات اور حالات کو ان کی سوانح یا تاریخ ضلع بجنور میں پڑھا جا سکتا ہے۔ حضرت مولانا مفتی ریاض الدین صاحب افضل گڑھی، حضرت مولانا سیف الدین صاحب بجنوری، حضرت مولانا احسان اللہ خاں صاحب تاجورؔ نجیب آبادی، حضرت مولانا گل محمد خاں صاحب بجنوری، حضرت مولانا حکیم جمیل الدین صاحب نگینوی، حضرت مولانا رحیم اللہ صاحب بجنوری، حضرت شاہ حافظ محمد یاسین صاحب نگینوی، حضرت مولانا مظہر الدین صاحب شیر کوٹی۔

حضرت مولانا عبد الرحیم صاحب تھپوری نے مدرسہ اسلامیہ محلّہ بندوقچیان اور مدرسہ حسینہ قاسم العلوم محلّہ پہاڑی دروازہ دھامپور اور مدرسہ قاسمیہ عربیہ جامع مسجد نگینہ اور مدرسہ امداد العلوم محلّہ مغلو شاہ نجیب آباد اور آخر زمانہ میں مدرسہ ضیاء العلوم کلر والی مسجد کرتپور میں تقریباً ۵۰

سال درس تدریس اور افہام وتفہیم کے ذریعہ اردو کی آبیاری کی ہے۔ حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب تھپوری نے مدرسہ اسلامیہ محلّہ بندوقچیان اور مدرسہ حسینہ قاسم العلوم محلّہ پہاڑی دروازہ دھامپور اور مدرسہ قاسمیہ عربیہ جامع مسجد نگینہ اور مدرسہ امداد العلوم محلّہ مغلوشاہ نجیب آباد اور آخر زمانہ میں مدرسہ ضیاء العلوم کلروالی مسجد کرتپور میں تقریباً ۵۰ سال درس تدریس اور افہام وتفہیم کے ذریعہ اردو کی آبیاری کی ہے۔ مولانا جمیل احمد کرتپوری نے مدرسہ امداد الاسلام صدر بازار میرٹھ میں تقریباً ۳۲ سال قرآن وحدیث اور فقہ کی خدمت انجام دی ہے اور درس تدریس کے ذریعہ اردو کی خدمات انجام دی ہے۔

لگے ہاتھوں ان زندہ اشخاص کا بھی تذکرہ کردیا جائے۔ جنھوں نے اُردو کی آراستگی وپیراستگی میں سعیِ فراواں اور کوششِ بے پایاں کیں، اور مصروفِ عمل ہیں جن کی طبعِ وقاد نے عقدہائے معانی کو وا کیا ہے، جن کے ذہنِ نقاد نے پست وبلند شاہراہِ سخن کو ہموار ومصفا کیا ہے۔ ان میں سے:

حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی ظفر بجنوری ادام اللہ فیوضہم کی ذاتِ اقدس ہے۔ جن کے بارے میں جتنا لکھا جائے اتنا ہی کم ہے۔ شعروشاعری کی ان کی ذات نے رونق بڑھائی (جس کا جیتا، جاگتا، زندہ وتابندہ ثبوت ترانہ دارالعلوم دیوبند، ترانہ جمعیۃ علماء ہند)، اُردو نے ان کے زبان پر گذر کر عزت پائی۔ حضرت کا جو سخن ہے وہ دُرِ عدن، جو بات ہے از راہِ معنی کرامات۔ یہ نثر کی رنگینی، یہ نظم کی شیرینی، یہ لفظوں کی محبوبی، یہ ترکیب کی خوش اسلوبی، یہ جدتِ معانی، یہ طلاقتِ لسانی، یہ سلاستِ عبارت، یہ روانیِ مطالب، دیکھی اور سنی ہوئی ہیں، سطریں ہیں کہ موتی کی لڑیاں ہیں، باتیں ہیں کہ مصری کی ڈلیاں ہیں، بھلا اس عبارت فصاحت نشاں کا کیا وصف بیان کروں جس کی صفائی استعارات کی خجلت سے دُرِ شاہوار پانی پانی ہو۔ بس اتنا ہی لکھوں گا۔

میرا استاذ کہ ہے جس کا سخن عالم گیر
ہے ظہوری کا ظہور اور نظیری کا نظیر

حضرت کی شہرۂ آفاق اردو کتب کے چند نام اس طرح ہیں: ایضاح البخاری، شوریٰ کی شرعی حیثیت، نغمۂ سحر وغیرہ حضرت مولانا نسیم احمد صاحب غازی دامت برکاتہم جن کی درجنوں کتب بزبانِ

اردو خود ان ہی کے کتب خانہ ''مکتبہ نسیمیہ سرائے پختہ مُرادآباد'' میں موجود ہیں حضرت کی کتابوں کی سب بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر بات قرآن وحدیث کے حوالے سے ہے، چند کتب کے نام: مرآۃ الانوار شرح اردو مشکوٰۃ لاثار۔ دجال کا فتنہ، بیان رمضان، تحفۂ خواتین۔ وغیرہ مولانا سراج الدین ندوی نے سرکڑہ ضلع بجنور میں ملت اکیڈمی قائم کر کے اس سے بہت سی کتب شائع کی ہیں جیسا کہ اسلام اور حقوق انسانی قرآنی اسباق، عبادات مسلمان اور سائنس وغیرہ کتب کے علاوہ ماہنامہ اچھا ساتھی اور ماہنامہ تفہیمات شائع کر کے اردو کی بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

مفتی اسرار احمد صاحب نجیب آبادی استاد حدیث مدرسہ ضیاء العلوم کلروالی مسجد کرتپور میں درس وتدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کے ذریعہ اردو کی آبیاری میں لگے ہوئے ہیں۔

اب ہم مضمون کے طوالت کے خوف سے صرف یہ بات آپ کے گوشِ گزار کردینا چاہتے ہیں کہ اُردو کی اس وقت اگر کہیں آبیاری ہوری ہے اس کی خراش تراش پر محنت جاری ہے، مذکورہ پانچ باتوں کو سامنے رکھ کر اگر کہیں اردو کی خدمت ہورہی ہے تو سروے کرنے کے بعد اول نمبر پر یہ مدارسِ اسلامیہ ہی سینہ سپر نظر آئیں گے۔ اُردو خطاطی اور خوش نویسی مدارس سے ہی عبارت ہے یہاں ابتدائی درجات سے ہی خوش نویسی اور املا کی درستگی پر قواعد ونحو کو مدنظر رکھ کر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔

خدا سے دعا ہے کہ اے بارِالٰہ جو چیز بھی تیرے نبی کے لائے ہوئے دین اسلام کی ترویج میں معاون ہو اس کو ترقیات سے نواز دے اور ان کے خدام کی عمر میں برکت عطا فرما، جملہ شرور وفتن سے محفوظ فرما اور جائز حاجات کو پورا فرما، آمین یارب العلمین۔

رابطہ:9412386560

شاعرِ فطرت۔ یوسف اقبال

ضلع بجنور کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنی نگارشات اور تخلیقات کے ذریعہ اپنا نام اردو ادب میں مشہور ہی نہیں کیا بلکہ دوسرے ادیبوں شاعروں کو بھی زندہ جاوید بنا دیا۔ اس فہرست میں عبدالرحمٰن بجنوری کے بعد کئی نام ہیں جن میں ایک نام یوسف اقبال نگینوی کا آتا ہے۔ جنھوں نے 2008 میں علامہ اقبال کا فارسی کلام جاوید نامہ کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا۔ جاوید نامہ علامہ اقبال کی پوری زندگی کے مطالعہ اور تحقیق کا نچوڑ ہے جو ان کی آخری تصنیف بھی ہے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے جاوید نامہ کی شرح و تفسیر لکھی تھی لیکن یوسف اقبال نے علامہ اقبال کے جاوید نامہ کا منظوم ترجمہ کر کے اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ فرمایا ساتھ ہی وہ طالب علم جو علامہ اقبال کے تصورِ خودی اور ان کی شاعری کے مطمع نظر کو اچھی طرح سمجھنا چاہتے تھے ان کے لئے منظوم ترجمہ بے حد مددگار ثابت ہوا۔

یوسف اقبال کی پیدائش نگینہ کے محلہ لوہاری سرائے میں مولوی محمد عمر فاضل دیوبند کے یہاں 1925 میں ہوئی۔ یوسف اقبال کے والد نے بارہ تیرہ برس کی عمر تک فارسی، عربی، اردو اور انگریزی کی تعلیم گھر اور اپنے مدرسہ میں دی۔ اسی تعلیم سے یوسف اقبال میں اتنی صلاحیت اور لیاقت پیدا ہوگئی کہ وہ فارسی اور عربی خوب پڑھنے اور سمجھنے لگے۔ یوسف اقبال نے پندرہ برس کی عمر میں علامہ اقبال کے فارسی کلام کا مطالعہ اقبال کے اس شعر سے متاثر ہو کر کرنا شروع کیا۔

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم
فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

یوسف اقبال پر علامہ اقبال کی شاعری اور شخصیت کا پورا اثر تھا۔ اختر اسلام (میرٹھ) مجتبیٰ آفاق عرفانی کی فرمائش اور ہمت افزائی پر یوسف اقبال نے جاوید نامہ کا منظوم ترجمہ کیا۔ یوسف اقبال تلاش معاش کے لئے نگینہ سے آگرہ چلے گئے اور کٹرہ گاڑی بان نئی بستی آگرہ

میں رہائش پزیر رہے۔اور 13 اپریل 2014 کو آگرہ ہی میں ان کا انتقال ہوا۔فارسی،اردو میں معیاری اشعار کہنے والے خوش فکر،کہنہ مشق یوسف اقبال کا کلام جس نے بھی پڑھایاسنا وہ متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔"سوزِ آرزو" ان کی منتخب غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔جس کی یہ خوبی ہے کہ جواس کا ایک شعر پڑھ لے اس کے دل میں ایک ہی نشت میں مکمل کرنے کا شوق پیدا ہوجاتا ہے۔ہم یہاں قارئین کی خدمت میں ان کی طویل نظم "میرا وجود ہے اردو زباں سے وابستہ" کا مختصر حصہ اور پیش کررہے ہیں جو یوسف اقبال کے بلند پایہ شاعر ہونے کا تعارف کراتی ہے۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی

میرا وجود ہے اردو زباں سے وابستہ

یوسف اقبال

میں ایک غنچہ تھا ناواقفِ بہار و خزاں
میں ایک بچّہ تھا معصوم و کمسن و ناداں
تھا کھیل کود، خور و خواب مشغلہ میرا
غمِ جہاں سے نہ تھا کوئی رابطہ میرا
میں اپنے باپ کو شاہِ جہاں سمجھتا تھا
اور اپنی ماں کو سمجھتا تھا خلدِ راحت و نور
میں جب بھی لٹو گھماتا تھا گھر کے آنگن میں
طواف کرتی تھی میرا خلا کی رقاصہ
مجھے یہ ہوتا تھا محسوس جیسے دنیا کی
تمام خوشیاں سمٹ آئیں میرے دامن میں

وہ تتلیاں جو مرے گھر کے پھول پودوں پر
کہیں سے اُڑتی ہوئی آکے بیٹھ جاتی تھیں
میں دوڑتا تھا پکڑنے انہیں اِدھر سے اُدھر
وہ میرے ہاتھ نہ آتی تھیں پھر بھی خوش ہو کر
میں ان کے رنگ برنگے پروں کے نقش و نگار

جو دیکھتا تھا تو ہوتا تھا یہ گماں مجھ کو
کہ جیسے پتیاں پھولوں کی اُڑتی پھرتی ہیں
کہ جیسے پھولوں پہ خود پھول ہو رہے ہیں نثار

وہ کہہ رہی ہے پڑھو لا الٰہ الاّ ا للّٰہ
محمدٌ عربی عبدہٗ رسول اللّٰہ
وہی سبق ہے مرے علم و فن کی روح کا نور
اسی کے نور سے روشن ہوا ہے میرا شعور
مری معلمِ اوّل تو میری ماں ہے مگر
ملا ہے باپ سے ورثہ میں مجھ کو علم و ہنر
وہ علم و فضل کا پیکر فقیہہ دینِ مبیں
کشادہ ذہن، وسیع النظر، شگفتہ جبیں
مرے وجود کے ذرّوں میں ہے چمک اس کی
ہے میرے گلشنِ افکار میں مہک اس کی

مجھے رٹایا گیا حفظ آمدن نامہ
دیا گیا مرے کمزور ہاتھ میں خامہ
برائے مشق مجھے لاکے دی گئی تختی
میں جس پہ نقش بھلے اور برے بناتا تھا
پھر اپنے ہاتھ سے دھو کر انہیں مٹاتا تھا
کبھی کبھی کوئی ایسا بھی نقش دل آویز
مرے قلم سے مری لوح پر چمک اٹھتا

جسے مٹانے میں دل میرا ہچکچاتا تھا
میں دیر تک اسی الجھن میں بیٹھا رہتا تھا
مٹاؤں یا یونہی رہنے دوں جلوہ گر اس کو
بناؤں مرکز حسنِ دل و نظر اس کو
زباں پہ جم گئی جب قندِ پارسی کی مٹھاس
مجھے پڑھائے گئے تب صحیفہ ہائے ادب
کریما.... جس میں ہیں اصلاحِ نفس و دل کے اصول
گلستاں.... جس میں ہیں عرفان و آگہی کے پھول
وہ بوستاں.... جو ہے ناموسِ گلشنِ تہذیب
پہنچ گیا میں جب "اخلاقِ محسنی" کے قریب
تو اس کے پہلو بہ پہلو مجھے سکھائی گئی
قواعد عربی ، صرف و نحو کی ترکیب

علاوہ درسی کتابوں کے چھپ کے پڑھنے لگا
میں گل بکاولی و زہر عشق کے ابواب
کلامِ داغ، کلامِ ظفر کلامِ میر
کلامِ غالب و مومن، بہ کلیاتِ نظیر
پھر ان کتابوں کو پڑھ کر ہوا یہ میرا حال
بقولِ حالی صنم خانۂ تصور میں
بنا کے ایک خیالی شبیہہ حسن و جمال
کبھی کہا اسے دلبر، کبھی بتِ طناز
کبھی کہا اسے گل رو، کبھی سراپا ناز

اسی خیالی صنم کے حسیں تصور میں
میں نظم کرتا رہا کیفیاتِ ہجر و وصال

کبھی فسانے لکھے، اور کبھی کہیں غزلیں
مشاعروں میں مسلسل پڑھیں حسیں غزلیں
زبانِ اردو پہ اس وقت تھا بلا کا نکھار
تمام ملک میں تھے اس کے حسن کے چرچے
ہر ایک شہر میں، ہر گاؤں میں، ہر اک گھر میں
سبھی کے ہونٹ تھے اس کی مٹھاس کے خوگر
لٹا رہی تھی وہ ہر گھر میں ضوفشاں گوہر
شگفتہ بول، حسیں لفظ، دلنشیں جملے
لبِ عوام سے بے ساختہ نکلتے تھے
تعصبات کی آلودگی سے پاک تھی وہ
مثال آئینہ شفاف و تابناک تھی وہ
ملا کے گنگا کے پانی کو آبِ زم زم میں
پلا رہی تھی اخوت کے جام بھر بھر کے

ملہار، ساونی برہا، ملن، غزل، ٹھمری
کبت، کتھائیں، بھجن، نعت، حمد اور میلاد
سوانگ، راس، بھنڈئی، مجرے اور قوالی
اسی کے نغموں سے تھا گلشنِ وطن آباد

زبانِ اردو کو ایسا عروج تھا حاصل
کہ اس کے جلوؤں سے معمور تھی ہر اک محفل
رسالے اور جریدے، کتابیں اور اخبار
دکھا رہے تھے ریاضِ وطن میں اپنی بہار

نقوشِ حسرتؔ و سیمابؔ ، فانیؔ و اصغرؔ
نژادِ نو کے لئے تھے چراغِ راہ گذر
ادب کی بزم میں چمکا کے ''شعلہؔ و شبنمؔ''
زبان جوشؔ پہ تھا انقلاب زندہ باد
برنگ شکوہ تھا اقبالؔ مائلِ فریاد
طلوعِ بانگِ دراؔ بالِ جبرئیلؔ کے بعد
وہ لایا ضربِ کلیمؔ، اور ارمغانِ حجازؔ
دکھا کے وادئ شعر و سخن کو ''شعلۂ طورؔ''
غزل سرا تھا جگر مثلِ حافظِ شیرازؔ
دل فراقؔ کو بھایا تھا میرؔ کا انداز
نئی سحر کی تمنا میں چل پڑا تھا مجازؔ
بنا تھا دستِ صباؔ فکرِ فیضؔ کا ہمراز
رواں تھے اور بھی کچھ کاروانِ شعر و ادب
جنھیں تھی سب سے الگ اک نئے افق کی طلب
جو تنگ نائے غزل سے بہت پریشاں تھے
نظر میں جن کی نئی وسعتوں کے امکاں تھے
تھی ان کے سینوں میں غالبؔ کی آرزوئے قدیم

"کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے"
اس انتظار میں تھے وادیٔ سخن کے کلیم
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے"
بحسن و خوبی کیا نون میم راشد نے
یہ کارنامۂ نادر ، یہ شاہکارِ عظیم
روایتوں کے حصارِ کہن کو توڑ دیا
رخ ارتقاء کی طرف شاعری کا موڑ دیا
کچھ اس طرح سے نئی نظم کی رکھی بنیاد
اسے ردیف و قوافی سے کر دیا آزاد
ادب کی دنیا میں اک تازہ انقلاب آیا
عروسِ شعر و سخن پر نیا شباب آیا

ادھر تو قافلۂ شاعرانِ اردو زباں
گذر رہا تھا نئے تجربوں کی گھاٹی سے
اُدھر تھیں نثر نگاروں کی ٹولیاں سرگرم

زباں کو سادہ سلیس اور سبک بنانے میں
محل سے جنّ و پری کے اسے چھڑانے میں
رجب علی کی روش، طرز میرامن سے
ہٹا کے اس کو اک ایسی ڈگر پہ ڈال دیا
جہاں وہ بن گئی دھڑکن عوام کے دل کی
جدھر سے گزری وہ، اربابِ ہند نے اس کا

بڑے تپاک سے پرجوش احترام کیا

شموسِ ستہ نے کرنوں کی چھاؤں میں اپنی
اسے نکھار کے مقبولِ خاص و عام کیا
مکالمے کی زباں میں خطوطِ غالبؔ نے
حسین و سادہ و دلکش بنائے اس کے نقوش
دلوں کو کر گیا مسحور نطقِ سرسیدؔ
علوم نو کی ضرورت کا جس کو تھا احساس
وہ دلکشی ہے سمن زارِ نثر میں اس کے
کہ آج تک تروتازہ ہیں اس کی فکر کے پھول
شررؔ نے خونِ جگر سے اسے کیا سیراب
ہے جس کی نثر نگاری شگفتہ وشاداب
گیا سنوار کے گیسو عروسِ اردو کے
مثال شانۂ مشاطۂ خامۂ سرشارؔ
ابوالکلامؔ کے خطبات اور صحافت نے
بلند کر دیا اس کا مقام اور معیار
ہے اس کی نثر نگاری میں ایسا حسن و جمال
کے جس کو دیکھ کے کہنا پڑا یہ حسرتؔ کو

”جب سے دیکھی ابوالکلامؔ کی نثر
شعرِ حسرت میں کچھ مزا نہ رہا
پریم چندؔ کی افسانوی زباں کی مثال

کسی زباں کے فسانوں میں مل نہیں سکتی
علاوہ ان کے ہزاروں ادیب اور شاعر
زبانِ اردو کو اپنا لہو پلاتے رہے
قلم سے اپنے ہر اک انگ انگ کو اس کے
بنا سنوار کے دلکش، حسیں بناتے رہے
عجیب شان سے ہندوستاں میں لہرایا
زبانِ اردو کے جاہ و جلال کا پرچم
یہی زباں ہے لڑی جس نے جنگِ آزادی
اسی زباں نے حریفوں کے کر دیے سر خم
یہی زبان تھی بسمل کے قلب کی آواز
یہی زباں تھی شہیدوں کی ہم نفس، ہم راز
ادب نواز، مہذب، شریف، شائستہ
ہر ایک بول ہے جس کا شگفتہ و شستہ

عجیب بات تو یہ ہے زبانِ انگریزی
کہ، جو ہے دورِ غلامی کا ورثۂ باطل
فروغ ایسا ملا اس کو بعد آزادی
نہ تھا جو دورِ غلامی میں بھی اسے حاصل
زبانِ اردو فقط اک زبان ہی تو نہیں
ہے اس کے حسن سے وابستہ اک حسیں تہذیب
اخوت اور محبت کی جو پیامی ہے
فروغِ عدل و مساوات کی جو حامی ہے

رہا تھا چینؔ بھی زیرِ نگین افرنگی
ہمارے بعد ملی تھی اسے تو آزادی
ہوئی کسی کو گوارا وہاں نہ انگریزی
وہاں زباں ہے عوام و خواص کی چینی

ہمارے حاکم و افسر، ہمارے راہ نما
یہاں سے جاتے ہیں جب دوسرے ممالک میں
تو بولتے ہیں وہاں جا کے صرف انگریزی
کلام کرتے نہیں ہیں زبان میں اپنی

پرانے آقا کی تہذیب اور زباں سے ہمیں
ہے خاص انس اور اپنی زباں سے نفرت ہے
اسی پہ بس نہیں، ہندوستان کے اندر
شمال اور دکن کی حدود میں جاکر
فرنگیوں کی زباں میں خطاب کرتے ہیں
ہیں جس قدر بھی دفاتر یہاں حکومت کے
اسی زباں میں حساب و کتاب کرتے ہیں

یہ ہے ہماری غلامانہ ذہنیت کی دلیل
مزاجِ چینؔ ہے آزاد ذہن کی تمثیل

یہاں کا فطری تقاضا زبانِ اردو ہے
دل و نظر کی تمنا زبانِ اردو ہے
بغیر کاشت چمن زار ہند کے اندر
جو خود اگا تھا وہ پودا زبانِ اردو ہے

دلوں کو جوڑنے والی زبان ہے اردو
نہ مر سکے گی بڑی سخت جان ہے اردو
یہ وہ زباں ہے کھلاتی ہے جو دلوں کے کنول
میں اس زبان میں کہتا رہا ہوں نظم و غزل
مٹھاس جولب ولہجہ میں اس زبان کے ہے
وہ اس چمن کی کسی دوسری زباں میں نہیں
گوارا اردو زباں کو نہیں کراہتِ صوت
حسین پھولوں کا گلشن ہے یہ زبانِ حسیں
یہ سامعین کے کانوں میں شہد گھولتی ہے
یہ حرف وصوت کے رشتوں کا وزن تولتی ہے
یہ ایسے حرفوں کو کرتی نہیں قبول کبھی
گراں گزرتی ہے جن کی صدا سماعت پر
گریز کرتی ہے ایسے مرکبات سے یہ
نظام صوت و سماعت ہو جن سے زیر و زبر
فسونِ سفلی و ناپاک سے ہے اس کو گریز
کہ یہ زبان ہے گنجینۂ نوائے سروش
یہ وہ زباں ہے جو دعوے کے ساتھ کہتی ہے

پسند کرتے ہیں جن کو عوام وہ فلمیں
دکھائے جاتے ہیں ٹی وی سے سیریل جتنے
اسی زباں میں ہیں ان کے مکالمے اور گیت
عوام بولتے ہیں جس زباں کو کثرت سے
زبان غیر کہ ہے جس کا نام انگریزی
عجب تو یہ ہے کہ اس سے تمہیں محبت ہے
زبانِ اردو جو اس ملک میں ہوئی پیدا
اسی کے نام سے کیوں تم کو اتنی نفرت ہے؟
تم اس کا نام بدل کر یہی تو چاہتے ہو
شناخت اس کی مٹا دیں تو آنے والی نسل
یہ بھول جائے گی اردو بھی اک زباں تھی یہاں
کہاں کہاں سے مٹاؤ گے تم نقوش اس کے
کہ وہ نقوش تمہارے لئے ہیں فیض رساں
مٹانا چاہتے ہو تم گر اس زباں کی شناخت
جو اس زباں کے نگہباں ہیں وہ نقوش مٹاؤ
مٹاؤ تاج محل اور سیکری کا جمال
مٹاؤ دلّی کا اور آگرہ کا لال قلعہ
سکندرے سے مٹاؤ مزارِ اکبر کو
مزارِ ٹیپو اور اس کا محل کرو تاراج
مٹاؤ ارضِ دکن سے نقوشِ اردو زباں
ہیں بیجا پور اور احمد نگر میں جتنے نشاں

مٹاؤ سب کو، ہمایوں کا مقبرہ ڈھاؤ
مٹاؤ شہر میں اورنگ آباد کے جاکر
وہ قصر جس میں ہے اورنگ زیب خوابیدہ
یہاں جو اردو ادب کے نقوش تاباں ہیں
تمہارے واسطے تحصیلِ زر کا ساماں ہیں
اٹوٹ انگ ہے بھارت کا جس طرح کشمیر
اسی طرح سے ہے اردو بھی روحِ برِّ صغیر
زبانِ اردو سے وہ کون سا ہوا ہے قصور
کہ اس کا نام بھی لینا تمہیں نہیں منظور
یہ وہ زباں ہے کھلاتی ہے جو دلوں کے کنول
میں اس زبان میں کہتا رہا ہوں نظم و غزل

مرا وجود ہے اردو زباں سے وابستہ
کہ اس زباں سے ہے پیدائشی مرا رشتہ

رابطہ 09927362905

ادیب، صحافی اور سماجی کارکن: ظہیر ربانی

نہٹور تقریباً ۸۰۰ سال پرانا تاریخی قصبہ ہے جو مغل بادشاہ اکبر اعظم کے دورِ سلطنت میں یہ ایک خوشحال اور خود کفیل پرگنہ تھا جس کا ذکر ابوالفضل نے آئینہ اکبری میں بھی کیا ہے۔ جنگِ آزادی میں اس قصبہ نے سرگرم حصہ لیا۔ جس کو سر سید احمد خاں نے اپنی کتاب ''سرکشی ضلع بجنور'' میں بھی قلم بند کیا ہے اور یہاں کے لوگوں کو دانشمندان نہٹور کہا ہے۔ اردو ادب کو اس قصبہ نے کئی نامور شخصیات عطا کیں جس کا تعارف اس کتاب میں ظہیر ربانی نے کرایا۔

ظہیر ربانی مضمون نگار بھی ہیں صحافی بھی اور سرگرم سماجی کارکن بھی۔ آپ کی ولادت ۱۹۶۳ء میں محلہ پیر شہید ساکن حکیم محبوب احمد صاحب کے یہاں ہوئی۔ الحاج محبوب احمد صاحب نے اپنے فرزند ظہیر ربانی کو سماجی، معاشی اور سیاسی پسماندگی سے نکل کر باوقار زندگی گزارنے کے لئے راہیں ہموار کی اور سماجی خدمت کرنے کی ترغیب دی۔

طالب علمی سے ہی صحافت اور سیاست کا مشغلہ رکھنے والے ظہیر ربانی نے طلبا اور نوجوانوں کی کئی تحریک چلائیں۔ آل انڈیا اسٹوڈینٹس فیڈریشن کی ریاستی کونسل کے رکن اور کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی نے ظہیر ربانی کو رکشا پولر، مزدوروں نیز ہر پریشان حال کے حقوق کے لئے سرگرم رکھا۔ 1988 میں نہٹور میونسپل بورڈ کے رکن اور وائس چیرمین بنے۔ مشہور کمیونسٹ رہنما ممبر پارلیمنٹ مولانا اسحاق سنبھلی نے انجمن ترقی پسند مصنفین اردو کا ریاستی جوائنٹ سکریٹری نامزد کیا۔ ظہیر ربانی ضلع سطح پر یوپی ورکنگ جرنلسٹ یونین کے ضلع صدر اور جنرل سکریٹری کے عہدہ پر رہے۔ نشتر خانقاہی کی زیر سرپرستی روزنامہ خبر جدید بجنور میں نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ روزنامہ قومی آواز، روزنامہ انقلاب بمبئی، نئی دنیا دہلی، نئی زمین، صحافت، بجنور ٹائمز، شام

نامہ چنگاری، اتر بھارت ٹائمز وغیرہ اخبارات ورسائل میں خبریں اور مضامین لکھے اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، بھیشم ساہنی، غلام ربانی تاباں، مجروح سلطان پوری، وامق جون پوری، معین احسن جذبی، ڈاکٹر وارث کرمانی، جون ایلیا، شمیم فیضی، بابو سنگھ چوہان، نشتر خانقاہی، ڈاکٹر نامور سنگھ، محترمہ شوکت کیفی، فہمیدہ ریاض، قرۃ العین حیدر جیسی نامور شخصیتوں سے ظہیر ربانی کی ملاقاتیں اور قربت رہی ہے۔ جنھوں نے ظہیر ربانی کی صلاحیتوں کو نکھارنے کا کام کیا۔

آج کل ظہیر ربانی درس وتدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں اور سماجی خدمات، علم وادب کی جانب بھی مصروف کار ہیں۔ بہت ہی خاموشی کے ساتھ آپ اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔آپ کی کار گزاریاں،آپ کی سماجی ادبی خدمات قابلِ ستائش ہیں جنھیں قصبہ نہٹور ہی نہیں بلکہ ضلع بجنور ہمیشہ یاد رکھے گا۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی

علم و ادب کا شہر نہٹور

ظہیر ربانی

نہٹور قدیمی زمانہ سے ہی علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے اور ادبی سرگرمیوں سے اس شہر کا پیمانہ لبریز رہا شاید اسی بنا پر ہی عظیم مفکر، دانشور اور بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سر سید احمد خاں نے ''نہٹور کو دانشمندوں کا نہٹور'' کہا ہے۔ نہٹور وہ بستی ہے جس نے اردو ادب کی کئی نامور ہستیوں کو پیدا کیا جنھوں نے اردو ادب میں بین الاقوامی سطح پر نام روشن کیا انھیں میں ایک سر فہرست نام ہے قرۃ العین حیدر کا۔

قرۃ العین حیدر کے لگڑ دادا سید حسن ترمزی وسط ایشیأ سے نقل مکانی کر کے ہندوستان آئے اور قرۃ العین حیدر کے آباؤ اجداد مغربی یوپی کے قصبہ نہٹور میں آباد ہو گئے۔ پڑھا لکھا گھرانا ہونے کے سبب خاندان کے افراد دربار مغلیہ میں سہ ہزاری پنج ہزاری اور منصب دار وغیرہ عہدہ پر معمور ہو گئے۔ اس خاندان میں علم کی وراثت ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی رہی۔ والدہ ماجدہ نظر سجاد اپنے زمانے کی معروف ادیبہ تھیں ان کا پہلا ناول ''خیر النسأ'' 1908 میں دار الاشاعت لاہور سے شائع ہوا تھا۔

والد سید سجاد حیدر یلدرم کا شمار اردو کے مشہور کہانی نویسوں میں ہوتا ہے۔ سید سجاد حیدر یلدرم کو 1920 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا پہلا رجسٹرار بنایا گیا۔ جس کے سبب سید سجاد حیدر یلدرم کا پریوار علی گڑھ میں ہی رہنے لگا۔

20 جنوری 1927 کو قرۃ العین حیدر کی ولادت بھی علی گڑھ میں ہوئی لیکن اپنے آبائی قصبہ سے انکا رشتہ آخری دم تک قائم رہا۔ جولائی 2006 میں وہ آخری بار نہٹور آئی تھیں۔

قرۃ العین حیدر کی پرورش ادبی ماحول میں ہوئی۔ جس کا پورا اثر ان پر پڑا۔ انھوں نے بچپن میں ہی کہانیاں لکھنی شروع کر دی تھیں صرف چھ سال کی عمر میں اپنی پہلی کہانی لکھی لیکن وہ شائع نہیں ہو سکی۔ اس کے بعد ان کی پہلی کہانی ''بی چوہیا'' کی کہانی اس دور کے بچوں کے مشہور ہفتہ وار رسالہ ''پھول'' میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور وہ آخری دم تک لکھتی رہیں۔

تقسیمِ ہند کے بعد قرۃ العین حیدر کچھ مدت تک پاکستان میں سکونت پذیر رہیں اور وہاں سرکاری وغیر سرکاری کئی اہم عہدوں پر معمور رہیں اسی اثنا میں ان کا شہرۂ آفاق ناول ''آگ کا دریا'' منظرِ عام پر آ گیا جس پر پاکستان میں بحث و تنازعہ کا ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا کہ 1960 انھیں اپنے اصل وطن ہندوستان واپس آنا پڑا۔

قرۃ العین حیدر کا یہ ناول سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہوا۔ اس ناول میں ہندوستان کی عظیم تاریخ کے پس منظر کے ساتھ تقسیم کے المیہ کو بڑے دلکش انداز و بیان کے ساتھ پیش کیا گیا۔

انھوں نے اپنے اس مشہور ناول ''آگ کا دریا'' کا ترجمہ خود انگریزی میں کیا تھا۔ انھیں اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ اس ناول کا کئی دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا۔

قرۃ العین حیدر بنیادی طور پر ناول نگار تھیں انھوں نے قریب ایک درجن ناول تخلیق کیے جن میں ''پت جھڑ کی آواز'' ''کارِ جہاں دراز ہے'' ''آخری شب کا ہمسفر'' ''چاندنی بیگم'' ''میرے بھی صنم خانے'' ''سفینہ'' ''غمِ دل'' ''گردشِ رنگِ چمن'' اور ''آگ کا دریا'' وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ چار ناولٹ دل ربا، سیتا ہرن، چائے کے باغ، اگلے جنم موہے بٹیا ہی کیجو، بھی منظرِ عام پر آئے۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں ستاروں سے آگے، شیشے کے گھر، پت جھڑ کی آواز، روشنی کی رفتار، جگنوؤں کی دنیا، پکچر گیلری، کفِ گل فروش [دو جلدوں میں] داستانِ عہدِ گل کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

انھوں نے چار رپورتاژوں، ستمبر کا چاند، گلگشت اور خضر سوچتا ہوگا کے علاوہ متعدد کتابوں کے ترجمے اور ترتیب وتدوین کی خدمات کو انجام دیا۔ ان کی ادبی بلندیوں کا یہ عالم ہے کہ دنیا کی کئی زبانوں میں ان کی تخلیقات کے ترجمے ہوئے اور امریکا کی لائبریری آف کانگریس میں ان کی کئی تخلیقات موجود ہیں۔

قرۃ العین حیدر کو بھارت سرکار نے 1989 میں گیان پیٹھ ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ اس کے علاوہ انھیں سویت لینڈ نہرو ایوارڈ، ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ، غالب ایوارڈ، پدم شری، پدم بھوشن اور سرسوتی جیسے ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔

وہ 20/اگست 2007 کو طویل علالت کے بعد اس دار فانی سے رخصت ہوگئیں۔ لیکن اردو ادب میں ان کی نمایاں اور گراں قدر خدمات کو با آسانی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

پروفیسر خورشید احمد صدیقی:۔ پروفیسر خورشید احمد صدیقی نے اردو زبان کا آغاز مختلف نظریے اور حقائق جیسی اردو کی نظم کتاب لکھ کر اردو ادب میں اپنا مقام بنایا۔

پروفیسر خورشید احمد صدیقی کی ولادت نہٹور کے صاحب دیوان شاعر مرحوم طلعت صدیقی کے یہاں 1950 میں ہوئی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم نہٹور میں حاصل کی اس کے بعد ایم۔ اے، ایم۔ فل اور پی۔ ایچ ڈی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کرنے کے بعد جنوری ۱۹۷۸ء میں شعبہ اردو جموں یونیورسٹی میں لکچرار مقرر ہوئیں۔ 1987 میں ریڈر اور 2001 میں پروفیسر بنیں۔ ان کی کتاب ''اردو زبان کا آغاز مختلف نظریہ اور حقائق'' 1993 میں منظرِ عام پر آئی جس کو جموں کشمیر کلچرل اکیڈمی نے بہترین کتاب کا ایوارڈ 1995 میں دیا جس کا نام مصنفہ کے نام کے ساتھ امریکن بائیوگرافیکل ڈکشنری کے ساتویں ایڈیشن میں شائع ہوا اور امریکن بایوگرافیکل سوسائٹی نے Woman-99 کے باوقار ٹائٹل کے لئے نامزد کیا۔

ان کی مرتبہ کتاب ''اردو کے اہم افسانے'' 1993 میں شائع ہوئی اور ''اردو زبان کی ابتدا مختلف نظریے اور خیالات'' 2000 میں شائع ہوئی۔

پروفیسر خورشید احمد صدیقی نے اردو زبان کی ترقی کے لئے انجمن محبان اردو قائم کی

جس کی جانب سے فروغ اردو تحریک شروع کی جس کا ایک جلسہ نہٹور میں بھی ہوا اور اس میں اردو کے مشہور شاعر ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد اور مشہور افسانہ نگار رام لعل صاحب نے شرکت کی۔ انجمن کے ذریعے اردو کا ادبی اخبار ''آب رواں'' جاری کیا۔ آپ ادبی رسالے ''تسلسل'' کے پبلیشر اور پرنٹر ہیں۔ آپ نے کئی نیشنل اور انٹرنیشنل سمینار میں شرکت کر ریسرچ پیپر پڑھے آپ نے کئی سرکاری اور غیر سرکاری کمیٹیوں میں رہ کر اردو زبان کے فروغ کے لئے کام کیا۔ آپ جموں یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے کے بعد جموں میں ہی مقیم ہو گئیں اور اردو کی ترقی وترویج کے لئے کام کر رہی ہیں۔

حکیم نیر واسطی:۔ حکیم نیر واسطی کی پیدائش 1901 میں نہٹور کے محلہ رسول داران کے رہنے والے سید مظفر حسین کے گھرانے میں ہوئی۔ والد محترم نگینہ میں وکالت کرتے تھے بد قسمتی سے نو سال کی عمر میں ہی باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اردو، عربی، فارسی، کی ابتدائی تعلیم شہر کے ایک مدرسہ میں حاصل کی دس بارہ سال کی عمر میں ہی آپ نے شعر کہنے شروع کر دیے اور شہر کے صاحب دیوان شاعر صدیق حیدر سے اصلاح لینے لگے۔

حکیم نیر واسطی مجاہد آزادی مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کی تقریروں سے متاثر ہو کر تحریک خلافت سے وابستہ ہو گئے اور تحریک خلافت کے جلسوں میں انگریزوں کے خلاف اتنی نظمیں لکھیں کہ ایک مجموعہ ہو گیا جس کا نام انھوں نے ''ترانہ خلافت'' رکھا جسے دھامپور کی ایک پریس میں شائع کرایا لیکن انگریز حکمراں نے اسے ضبط کر لیا۔

آپ نے 1920 میں لکھنؤ سے طب کی ڈگری لی وہ تقسیم ہند سے پہلے ہی 1925 میں پاکستان چلے گئے اور وہاں لاہور کے چونہ منڈی علاقہ میں اپنا مطب شروع کر دیا۔

حکمت کی ڈگری لینے کے بعد بھی ان کا شعر گوئی کا سلسلہ جاری رہا اور 1931 میں ''میکدے'' نام سے ایک شعری مجموعہ شائع ہوا۔ 1959 میں ''شعر و حکمت'' کے نام سے دوسرا شعری مجموعہ شائع ہوا۔ 1949 میں اختر وسلمہ نام سے ایک کتاب لکھی۔ 1958 میں ''ترکی نظام طب کی تاریخ'' 1957 میں ''طب العرب'' نام سے طب سے متعلق کتاب لکھی انھیں پاکستان

سرکار نے ستارہ خدمت ایوارڈ سے سرفراز کیا۔وہ پاکستان میں کئی ممالک کے سفیر بھی رہے حکیم نیر واسطی نے طب یونانی میں جہاں نام کمایا وہیں اردو ادب میں بھی ان کی پہچان تھی۔

ڈاکٹر شمع افروز زیدی:۔ اردو کی مشہور و معروف مصنفہ ڈاکٹر شمع افروز زیدی ۲۵ر جولائی 1952 کو نہٹور کے رہنے والے سید مظفر حسین زیدی کے گھرانہ میں پیدا ہوئیں۔انٹر تک کی تعلیم نہٹور میں حاصل کی کم عمری میں ہی والد صاحب کا انتقال ہو جانے کے سبب ماہنامہ بیسویں صدی کے ایڈیٹر جناب رحمٰن نیّر سے ان کی شادی ہو جانے کے بعد وہ دہلی چلی گئیں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے ایم۔اے، پی۔ایچ ڈی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد شوہر رحمٰن نیّر کی نگرانی میں لکھنے کا کام شروع کیا۔

اردو اکاڈمی دہلی کی ماہنامہ میگزین ''امنگ'' کی آپ سب ایڈیٹر رہیں۔قومی اردو کونسل کے ماہنامہ رسالہ ''اردو دنیا'' اور فکر و تحقیق کے ادار یہ بورڈ میں شامل رہیں۔ساتھ ہی ماہنامہ روبی، آنگن، گلفشاں کی ایڈیٹر رہتے ہوئے خوب نام کمایا۔

اردو ناول میں طنز و مزاح، فکر تونسوی حیات اور کارنامے، گل دستہ کلام شعرأ، اردو ادب اور جدیت فن کے آئینہ میں اردو کی اہم کتابیں لکھ کر اردو ادب میں اپنا اہم مقام بنایا۔

1979 سے آپ اردو کے مشہور رسالہ بیسویں صدی کی ایڈیٹر ہیں۔آپ کو بہار اردو اکیڈمی اور مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کی جانب سے کئی ایوارڈ مل چکے ہیں۔

پروفیسر ثریا حسین:۔ اردو دنیا کی جانی پہچانی شخصیت پروفیسر ثریہ حسین کی پیدائش محلہ شیخان نہٹور میں وحید زیدی صاحب کے گھرانے میں 1930 میں ہوئی۔آپ کا شمار ذہین خاتون میں ہوتا ہے آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو فارسی زبان میں ایم۔اے کیا، بی۔ایڈ، ایل۔ایل کے بعد ڈی۔لٹ کیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر بن گئیں۔

پروفیسر ثریا حسین نے اردو میں کئی اہم کتابیں لکھیں۔کئی سفرنامہ لکھے ان کے سفرنامہ بڑے دلچسپ اور ریسرچ پیپر بڑے معلوماتی ہوتے ہیں۔

انھوں نے دو۔تین مئی 1981 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سید سجاد حیدر یلدرم پر

منعقد دوروزہ سمینار میں پڑھے جانے والے مقالات پر مشتمل ''سید سجاد حیدر یلدرم'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو نے شائع کیا۔ یلدرم کے نایاب افسانوں اور مضامین پر مشتمل ''انتخاب یلدرم'' عنوان سے ایک کتاب لکھی جسے اردو اکیڈمی نے شائع کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو میں کئی دوسری کتابیں لکھیں اور اردو ادب میں اپنی الگ شناخت بنائی۔

سید سجاد حیدر یلدرم:۔ سید سجاد حیدر کا سن ولادت 1880 ہے آپ نے 1892 میں مدرستہ العلوم علی گڑھ کی نویں جماعت میں داخلہ لیا راجہ مہندر پرتاپ، مولانا محمد علی جوہر اور سید سجاد حیدر یلدرم کا شمار اسکول کے بہترین مقررین اور ذہین طلبا میں ہوتا تھا۔ انھوں نے ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ سے بی اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اپنے زمانہ طالبِ علمی میں ایم۔ اے۔ او کالج یونین کے نائب صدر اور انجمن اخوان الصفا کے رکن رہے۔

سید سجاد حیدر یلدرم کی شخصیت اور مزاج میں انسان دوستی، وطن پرستی اور حریت پسندی شامل تھی وہ معاشرے اور ادب میں انقلابی تبدیلیاں لانے کے خواہشمند تھے۔ 1900 میں علی گڑھ سے شائع ہونے والے رسالہ معارف میں ان کا مشہور مضمون ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ'' شائع ہوا اس کے علاوہ ان کے کئی اور انقلابی مضامین معارف میں شائع ہوئے۔ زمانہ طالبِ علمی میں سید سجاد حیدر یلدرم نے ترکی زبان سیکھی اور ترکی کے متعدد افسانے اور ناولٹ اردو میں منتقل کیے۔ 1904 میں بحیثیت ترجمان برطانوی قونسل خانہ بغداد گئے اور اسی سال انھوں نے ''سفرِ بغداد'' کے نام سے اردو کا پہلا رپورتاژ لکھا۔ دوسرا رپورتاژ ''زیارتِ قاہرہ وقسطنطنیہ 1911 لکھا قیام بغداد کے دوران یلدرم نے بحیثیت صاحب طرز انشاپرداز زبردست شہرت حاصل کی۔ سید سجاد حیدر یلدرم کو اردو انگریزی اور برطانوی زبان پر عبور حاصل تھا اور ان زبانوں کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔

سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں اور مضامین کا پہلا مجموعہ ''خیالستان'' 1910 میں شائع ہوا۔ جو اردو ادب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ''خیالستان'' کے علاوہ ثالث بالخیر،

زہرا، مطلوب حسینائیں، حکایات و احساسات، جلال الدین خوارزم شاہ جنگ وجدال، پرانا خواب، آسیب الفت وغیرہ منظرِ عام پر آئے۔

1927 میں مولانا محمد علی جوہر چاہتے تھے کہ سجاد حیدر یلدرم ان کے اخبار "ہمدرد" کی ادارت کی زمہ داری سنبھالیں لیکن یلدرم کا مزاج صحافت کی ہنگامہ آرائی کا متحمل نہ تھا انھوں نے یہ پیش کش قبول نہیں کی۔ وہ شروع سے ہی نثر وشاعری میں نئے تجربات کے حامی تھے۔

یہ صاحبِ طرز انشاپرداز شاعر، مصنف اور ادیب ۱۹۴۳ء اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ انھوں نے انشائیہ نگاری، افسانہ نگاری، ناول نگاری اور ڈرامہ نگاری کے میدان میں اہم خدمات کو انجام دیا۔ ان کی تخلیقات اردو ادب کے لیے بیش قیمت سرمایہ ہے۔

خلیل الرحمن بیناں:۔ خلیل الرحمن بیناں کی ولادت 27/جنوری 1927 کو ہوئی۔ بجنور کے محلہ قاضی پاڑہ میں ہوتی لیکن وہ 1954 میں نقلِ مکانی کر کے نہٹور میں آکر مقیم ہو گئے۔ خلیل الرحمن بیناں ایک کہنہ مشق شاعر اور ادیب ہیں۔ دینیات وادبیات میں وسیع مطالعہ رکھتے ہیں۔

خلیل الرحمن بیناں نے مرزا اسد اللہ خاں غالب کی ایک سو اکیاسی غزلیات کی شرح "فتراک" کے نام سے ۵۴۴ صفحوں کی ایک ضخیم کتاب کی شکل میں شائع کی جس کا اجرا اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو اور کابینہ وزیر اعظم خاں نے سہارنپور میں منعقد ایک بڑے اجلاس میں کیا۔

خلیل الرحمن بیناں سے قبل کلامِ غالب کی مختلف شرحیں لکھی گئیں۔ مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر یوسف سلیم چشتی، جوش ملسیانی اور شمس الرحمن فاروقی کی شرحیں کتاب کی شکل میں موجود ہیں۔ خلیل الرحمن بیناں نے کسی شاعر یا شارح کی تقلید نہیں کی بلکہ مدلل طریقہ سے نئی اور موثر شرحیں پیش کی ہیں۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب کی غزلیات کی تفسیر کے بعد آپ نے شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی غزلیات کی شرح "طائرِ لاہوت" کی شکل میں 512 صفحوں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب اردو

ادب کو دینے کا عظیم کام انجام دیا۔ خلیل الرحمن بیناں نے علامہ اقبال کی اردو غزل کی تفسیر قرآن و حدیث اور جدید سائنس کی روشنی میں کی ہے۔ ان کے علاوہ ان کے دوسرے شعری مجموعہ غیر مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔

خلیل الرحمن بیناں صاحب کی یہ کاوشیں بلاشبہ اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔

رابطہ: 09927419488

دبستانِ بجنور کا نگینہ: تشنہ نگینوی

ضلع بجنور کا مرکزی شہر نگینہ علم وادب کی بستی ہے۔ جسے سرسید احمد خاں نے شرفائے نگینہ کا لقب دیا۔ آج بھی یہاں کی عوام شریف النفس ہے۔ لاکھ رنجش سہی لیکن کب دوستی میں بدل جائے، لحہ نہیں لگتا۔ اس تہذیب کے شہر میں اکثریت اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی ہے۔ لیکن جب ادب کے تعلق سے اس کی قواعد اور ضوابط کی بات ہو اور کسی کو ادبی اصلاح لینی ہو، تب نئی نسل میں ایک ہی نام سامنے آتا ہے اور وہ نام ہے احتشام نعمانی کا۔

احتشام نعمانی شاعر بھی ہیں، نثر نگار بھی اور مزاح نگار بھی۔ احتشام نعمانی کی ولادت محلہ سرائے میر نگینہ میں محمد یٰسین صاحب کے یہاں ۱۳ر جون ۱۹۷۱ء کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم نگینہ، نجیب آباد میں ہوئی اور بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی ایس سی (علم حیوانیات ونباتات) اور بی یو ایم ایس کیا۔ شروع سے ہی شاعری کا شوق رکھنے والے احتشام نعمانی کو جب یونیورسٹی کا ماحول ملا تو ان کا ادبی شوق اور سویا ہوا شاعر جاگ اٹھا۔ تب انھوں نے اپنا تخلص تشنہ نگینوی رکھا۔ ۹۰ کے دہائی کے تمام ادبی رسائل اور اخبارات میں ان کی غزلیں، مزاحیہ مضامین شائع ہونے شروع ہوئے اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ علی گڑھ تعلیم کے دوران احتشام نعمانی کو طبیہ کالج ٹاپر کی حیثیت سے یونیورسٹی گولڈ میڈل اور بیسٹ اسکالر ایوارڈ حاصل ہوئے۔ انجمن ترقی اردو نگینہ شاخ کے صدر، انجمن پاسبانِ اردو ادب کے جنرل سکریٹری تشنہ نگینوی کا پہلا مجموعہ کلام ''لب نہیں کھولے میں نے'' شائع ہو چکا ہے جس کی رسمِ اجراء باقی ہے۔ معالج کی حیثیت سے عوام کی خدمت کرنے والے ڈاکٹر تشنہ نگینوی اردو ادب کی مرہم پٹی میں بھی سرگرم رہتے ہیں۔ ان کا نمائندہ شعر ملاحظہ فرمائیں

مجھ پہ الزام نہ رکھ، لب نہیں کھولے میں نے
مجھ سے ٹکرا کے، ترے ہاتھ کا پتھر چیخا

ڈاکٹر شیخ نگینوی

شرفاء اور اردو کی بستی نگینہ

ڈاکٹر احتشام نعمانی

شوالک پہاڑیوں کی گود میں آباد سلاطین وامراء کی مشہور اور پسندیدہ شکار گاہ، آبنوس، صندل، شیشم اور ساگون کی لکڑی پر فنکارانہ نقاشی کے لئے عالمگیر شہرت یافتہ سرزمین، وطن عزیز کو انگریزوں کے غاصبانہ پنجوں سے آزاد کرانے کے لئے تن من دھن کی بازی لگانے والے مجاہدین آزادی کا وطن ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور علمائے کرام کے مسکن یعنی شہر نگینہ جو کسی وقت چھوٹا سا گاؤں تھا اور اس کا نام مدینہ تھا۔ شیر شاہ سوری کے دورِ اقتدار میں اس کا نام نگینہ پڑا۔ اکبر اعظم کے دورِ حکومت میں یہ پرگنہ رہا آئین اکبری میں اس کا ذکر جلی حروف میں ملتا ہے۔

نگینہ کے باشندوں نے پیاری زبان اردو کی ترویج وترقی میں کماحقہٗ کردار ادا کیا ہے۔ اس مردم خیز خطہ نے ادیب، شعراء، نثر نگار اور صحافی پیدا کئے ہیں۔ قدیم شعراء میں امیر خان امیرؔ، ناظم حسین ناظمؔ، سید محمد میر مضطرؔ، غیاث الدین غیاثؔ، سید محمد اخترؔ، مقصود بیگ مقصودؔ، حافظ رحمت اللہ فرحتؔ، مولانا عترت علی ناطقؔ، سید عبدالقادر، حکیم محمد یٰسین بسملؔ اور سید مصطفےٰ حسین، فرخ نگینوی کے نام مشہور ہیں۔ بیسویں صدی عیسوی کے شعراء میں بابو فخر الدین محزونؔ، غلام حسین فروغ، نجمی احسانی، قیام الدین مضطرؔ، یوسف اقبالؔ، رفعت سروش، قاضی جمیل الدین روشن، قاضی محمود الحسن بے خودؔ، عتیق الرحمن تاباں، محمود الرحمن عندلیبؔ، عبدالعزیز راہیؔ، ماسٹر خلیل احمد، نور الدین فرشوری، رئیس احمد راہی، محمود اعظم کاظمی سامریؔ، نجمی کاظمی، مولانا عبدالروف قمرؔ، محمد عرفان رومانیؔ، ظہیر احمد خلشؔ، سرور انصاری نگینوی، مقصود الحسن مقصود، ڈاکٹر مظفر جاہلؔ، ڈاکٹر محمد داؤد نور، عمر الدین سحرؔ، نعیم اختر رنگؔ، محمد شاہد انجم، خورشید انوار، اطہر شکیل، اکبر حسین اکبرؔ، عتیق احمد

فرماں، بہاؤالدین بہار، سنیل کمار ساحل، ڈاکٹر محمد عمران ساغر اور راقم الحروف ڈاکٹر محمد احتشام تشنہ نگینوی نے گیسوئے اردو کو سنوارنے میں اپنے روز و شب لگائے ہیں۔ اس کے علاوہ نگینوی خواتین بھی کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ تسنیم احسن، عائشہ خواجہ، عذرا جمال، صابرہ نکہت، شمیم زہرہ، ڈاکٹر مینا نقوی، علینا عترت، نصرت مہدی، ستارہ نور، شافعہ شاد، شاہینہ خان، شبانہ نذیر، عظیمہ نشاط، الماس رضا، صائمہ فہیم، جیسی شاعرات اور نثر نگار خواتین کی نا قابل فراموش خدمات شامل ہیں۔

شاعری کے علاوہ نثر نگاری اور صحافت کے میدان میں حافظ محمد ابراہیم، عبدالرحمن، ذکاوت امتیازی، عزیز الرحمن، ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی، محمد عرفان، عشرت جاوید، مسرت شیزی، عبدالقیوم صبا، مولانا فرید احمد، ڈاکٹر وسیم اقبال، پرویز عادل، اور ڈاکٹر شیخ نگینوی کے نام نہایت احترام سے لئے جا سکتے ہیں۔

نگینہ میں ادبی انجمنیں زمانہ قدیم سے قائم ہیں اور ان کی روایت آج تک چلی آ رہی ہے۔ یہاں پر انجمن پاسبان اردو ادب (رجسٹرڈ)، انجمن حصولِ ادب اور انجمن فروغ اردو جیسی انجمن شاعری کی بقا کی ضامن ہیں۔ انجمن پاسبان اردو ادب رجسٹرڈ کے زیر اہتمام پابندی سے طرحی اور غیر طرحی نشستیں منعقد ہوتی ہیں اور مختلف مواقع پر اردو کو فروغ دینے والے پروگرام بھی کئے جاتے ہیں۔ مستقبل میں اردو اسکول کا خواب دیکھا گیا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ یہ خواب ضرور بالضرور شرمندہ تعبیر ہو (آمین) دوسری طرف انجمن حصولِ ادب مستقل مصرعہ طرح دے کر اپنے ممبران میں مشق سخن کی شمع روشن کئے ہوئے ہے۔ موجودہ دور میں نگینہ کو محمد عرفان صدیقی جیسے ناقد، ڈاکٹر وسیم اقبال جیسے نثر نگار اور اردو پرور مشفق دوست، اطہر شکیل جیسے پختہ کلام اور خوش گلو شاعر، ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی جیسے مفکر اردو ڈاکٹر شیخ نگینوی جیسے صحافی اور ناظم کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر محمد داؤد نور جیسے ماہرِ تعلیم کی خدمات حاصل ہیں اللہ ان کی زندگیوں میں برکت عطا فرمائے اور زبان و ادب کی خدمات کرنے کی توفیق عطا کرے آمین۔

اردو زبان صرف ادب کا ہی نام نہیں بلکہ ایک زندہ جاوید زبان ہے آزادی سے قبل اور اوائل مابعد آزادی میں ہمارا سرکاری اور روزمرہ کا ہر کام اردو میں ہوتا تھا۔ مگر سرکاری بغض اور

اپنوں کی بے اعتنائی کی وجہ سے اردو کے استعمال کا دائرہ تنگ سے تنگ تر ہوتا گیا۔ حالانکہ کاغذی طور پر اردو آج بھی دوسری سرکاری زبان کے عہدے پر فائز ہے مگر عملی طور پر چلن میں کہیں کوئی نام ونشان نہیں ملتا۔ محبانِ اردو کے ذریعہ بار بار کی یاددہانی اور احتجاجی درخواستوں کے دباؤ میں کہیں کہیں کبھی کبھی کچھ سرکاری بورڈوں پر اور نیم پلیٹوں پر ٹوٹی پھوٹی تحریر میں غلط سلط املا کے ساتھ نام یا عہدے لکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جسے دیکھ کر ہم لوگ ایک دوسرے کو تحسین آفرین نظروں سے دیکھا کرتے ہیں۔ اس دورالم میں بھی ہمارے شہر کے چند حضرات روزمرہ میں اردو کا استعمال کرتے ہیں۔ جن کو شاید ہم لوگوں کی داد تک بھی نہیں پہنچتی ہے۔ منڈی سمیتی میں سبزی اور پھلوں کے تھوک بیوپاری آج بھی اپنے کھاتے اردو میں لکھتے ہیں۔ ان میں بابو منشی ان کے فرزند شہزاد احمد قابلِ ذکر ہے۔ اسی طرح گورمنٹ یونانی ہاسپٹل، نگینہ کے میڈیکل آفیسر ڈاکٹر عبداللہ جاوید اپنا اوپی ڈی رجسٹر اور روزنامچہ اردو میں پُر کرتے ہیں حالانکہ ان کو اپنے اعلیٰ آفیسران کی خفگی کا سامنہ کرنا پڑتا ہے۔ مگر وہ اپنا فرض منصبی ادا کر رہے ہیں۔ ہمارے شہر میں درجنوں دینی مدارس ہیں جن میں کئی ۱۹ ویں صدی کے ہیں ان کا تو اوڑھنا بچھونا ہی اردو ہے۔ ان کی خدمات کے اعتراف کے لئے ایک مستقل مضمون درکار ہے۔ نگینہ میں تین مسلم فنڈ بھی کام کر رہے ہیں۔ وہاں بھی تقریباً سارا کام اردو میں ہوتا ہے۔ ان اداروں میں جاتے ہیں تو دل کو تشفی بھی ہوتی ہے اور حوصلہ بھی بڑھتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ متعدد تعلیمی ادارے ہمارے یہاں اردو پڑھا رہے ہیں۔ اب تو انگلش میڈیم اسکولوں میں بھی اردو پڑھائی جارہی ہے مگر نہ تو طلباء اسے سنجیدگی سے لے رہے ہیں اور نہ استاد حضرات ہی عقیدت سے تعلیم دے رہے ہیں ورنہ انفارمیشن ٹکنالوجی کے اس دور میں جس طرح اردو کو بھرپور ستائش مل رہی ہے وہ دن دور نہیں کہ ہماری موجودہ پیڑھی اور آنے والی نسلیں اردو سے نہ صرف آشنا ہوں بلکہ اردو کی ماہر بھی ہوں اور معتقد بھی۔

اس سے ملتی جلتی آواز کہاں سے لاؤں
تاج محل بن جائے مگر ممتاز کہاں سے لاؤں

رابطہ:9045073113

ہمارا نگینہ

یوسف اقبال

ہمیں جان و دل سے ہے پیارہ نگینہ
ہمارا نگینہ.................ہمارا نگینہ
نہ کیوں اس کی مٹی پہ ہو ناز ہم کو
سکھاتی ہے جینے کے انداز ہم کو
وہ دیتی ہے ترغیب پرواز ہم کو
لبھاتی ہے اس کی ہر آواز ہم کو
ہمیں جان و دل سے ہے پیارہ نگینہ
ہمارا نگینہ.................ہمارا نگینہ
ہے اس کی زمیں مثل آغوش مادر
ہے اس کی ہوا روح افزا معطر
ہے اس کی فضا تابناک و منوّر
ہے جنت نشاں جس کا ہر ایک منظر
ہمیں جان و دل سے ہے پیارہ نگینہ
ہمارا نگینہ.................ہمارا نگینہ
لٹاتا ہے جو علم وفن کے خزانے

سناتا ہے امن واماں کے ترانے
نگینہ کی دانشوری کے فسانے
نہ بھولیں گے دانشوروں کے گھرانے
ہمیں جان و دل سے ہے پیارہ نگینہ
ہمارا نگینہ..................ہمارا نگینہ

ہے امیر اسی سر زمیں کے سخنور
اودھ کے نوابوں کی مجلس میں جاکر
وہ اشعار اپنے سناتے تھے اکثر
نگینہ کے لوگوں کو ہے ناز ان پر
ہمیں جان و دل سے ہے پیارہ نگینہ
ہمارا نگینہ..................ہمارا نگینہ

نگینہ کے یٰسینؔ شاہ پاک باطن
وہ ایک پیر کامل وہ ایک مرد مومن
مریدوں کی بخشش کے محشر میں ضامن
وہ کرتے تھے ذکرِ خدا رات اور دن
ہمیں جان و دل سے ہے پیارہ نگینہ
ہمارا نگینہ..................ہمارا نگینہ

اطِبّا یہاں کے مسیح زماں تھے
مریضوں کے امراض کے نکتہ داں تھے
عیاں ان پہ حکمت کے رازِ نہاں تھے
وہ یونانی حکمت کے روحِ رواں تھے
ہمیں جان و دل سے ہے پیارہ نگینہ

ہمارا نگینہ.................ہمارا نگینہ

تھے حافظ ابراہیم گوہر یہاں کے
جو کینڈریئے منسٹر تھے ہندوستاں کے
وہ اچھے مقرر تھے اردو زباں کے
وہ مشہور بلبل تھے اس گلستاں کے
ہمیں جان و دل سے ہے پیارہ نگینہ
ہمارا نگینہ.................ہمارا نگینہ

نگینہ کے مشہور شاعر تھے اخترؔ
جو تھے داغ کے جانشینوں کے ہمسر
نگینہ کو ہے ناز ان کے سخن پر
رسالوں میں اردو کے چھپتے تھے اکثر
ہمیں جان و دل سے ہے پیارہ نگینہ
ہمارا نگینہ.................ہمارا نگینہ

ضمیرؔ اور الفتؔ فقیرانِ کامل
جو وجدان و مجزوبیت کے تھے حامل
قلندر صفت کارواں میں تھے شامل
نگینہ کو ان سے ہوا فیض حاصل
ہمیں جان و دل سے ہے پیارہ نگینہ
ہمارا نگینہ.................ہمارا نگینہ

منصور احمد صدیقی

رامپور برصغیر کی ریاستوں میں ایک چھوٹی سی ریاست کا نام تھا۔لیکن اس نے علم وفن کو جو کچھ دیا وہ بڑی بڑی ریاستیں نہ دے سکیں ۔ یہ ایسی حقیقت ہے کہ جس کا اقرار ملک اور بیرون ممالک کے بہت سے صاحبِ نظر کر چکے ہیں ۔شاعری میں رامپور اسکول اور موسیقی میں رامپور اسکول گھرانے کی جو دین ہے اس سے کوئی انصاف پسند مورخ نگاہ نہیں بچا سکتا۔ خالص علمی اور ادبی میدان میں بھی رامپور سے وابستہ دو نام روشن ہیں ۔ پہلا رامپور کا مدرسہ عالیہ جو مشرقی علوم وفنون کی قدیم اور مشہور درسگاہ ہے۔اور دوسرا رامپور کا شہرا آفاق کتب خانہ جس نے رامپور کو دنیا کے علمی نقشے پر نمایاں فضا عطا کی۔ان اداروں کی وجہ سے یہاں کے باشندوں کو خاطر خواہ فائدہ ہوا۔اور بڑی تعداد میں شاعر ادیب اور دیگر فنکار یہاں پیدا ہوئے۔انھیں میں ایک نام منصور احمد صدیقی کا بھی ہے۔

22رفروری 1967 ذوالنور احمد کے یہاں پیدا ہوئے منصور احمد صدیقی کی ابتدائی تعلیم رامپور میں ہوئی۔ جو سلسلہ آگے چل کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تک پہنچا اور وہاں سے تاریخ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔1996 سے 2011 تک مرادآباد مسلم ڈگری کالج مرادآباد میں بحیثیت اسسٹینٹ پروفیسر اور دو سال پرنسپل کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ آج کل مسلمہ گرلز ڈگری کالج مرادآباد میں پرنسپل کے عہدہ پر مامور ہیں۔مرادآباد کی ادبی اور سماجی محفلوں میں شگفتہ اور شائستہ گفتگو کے لیے مشہور ہیں۔اچھے مقرر اور عمدہ ناظم منصور احمد صدیقی کا کلاس روم میں اردو ادب سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔مگر کچھ اپنے شوق،علیگڑھ کے ماحول نے فکری

ذوق کو جلا بخشی۔ ابتدا میں شاعری بھی کی مگر جلد ہی اسے ترک کر دیا اور نثر کے میدان میں طبع آزمائی کی۔ مختلف موضوعات پر مضامین رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو سے رشتہ ۱۸ سالوں میں بہت سی تخلیقات نشر ہو چکی ہیں۔ انگریزی میں ایک کتاب ''روہیلہ پٹھان آف اسٹیٹ رامپور'' اور اردو میں ''باغ بہشت'' شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ اردو کی دو کتابیں زیرِ طبع ہیں۔ خوش اخلاق، خوش گفتار منصور احمد کا شمار ایک اچھے منتظم کے طور پر بھی ہوتا ہے۔ انھوں نے مراد آباد شہر میں کئی قومی، ادبی سیمنار کا انعقاد بھی کرایا۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی

ڈپٹی نذیر احمد

منصور احمد صدیقی

مختلف تہذیبوں اور اقوام کے اختلاط نے ہندوستان کو جو تحفے دیے ہیں۔ان میں اردو ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔اس کی ساخت میں مختلف عناصر کی آمیزش ہے۔جس نے اس کی معنویت میں اضافہ کیا ہے۔یوں تو اس کی پیدائش،نشو نما اور ترقی میں ملک کے بہت سے حصّوں نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔مگر مغربی اتر پردیش کا یہ علاقہ جسے بجنور کہا جاتا ہے،اپنی ایک شناخت رکھتا ہے۔

ادبی اعتبار سے اس زرخیز سرزمین نے ملک کو بہت سے لعل و جواہر عطا کیے ہیں۔جن کی چمک وقت کے ساتھ ماند نہیں پڑی۔بلکہ بڑھتے دور میں ان کی اہمیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔اس فہرست پہ جب نظر ڈالتے ہیں تو ایک نام ڈپٹی نذیر احمد کا نظر آتا ہے۔نذیر احمد کی تحریریں نہ صرف اردو ادب کی بنیادوں کا حصہ بنیں۔بلکہ کچھ میدانوں میں ان کی اولیت نے آنے والوں کے لیے ایسے واضح اور روشن نقش پا چھوڑے ہیں،جس کے سبب اردو میں بیش قیمت ادبی سرمایہ وجود میں آیا۔

مولوی نذیر احمد ضلع بجنور کی تحصیل نگینہ کے موضع ریہٹر کے رہنے والے تھے۔ابتدائی تعلیم ضلع بجنور میں ہی حاصل کی پھر 14 سال کی عمر میں والد مولوی سعادت علی کے ساتھ دہلی آئے اور مدرسہ مسجد اورنگ آبادی کے مدرس عبدالخالق کے زیرنگیں حصولِ علم شروع کیا۔ان کے

لیے سخت وقت تھا جس کی تصویر کشی مرزا فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد صاحب کی زبانی اس طرح کی ہے۔

"پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا۔ صبح ہوئی اور میں چھتری ہاتھ میں لے کر گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلا............ مسجد کے پاس ہی عبدالخالق صاحب کا مکان تھا۔ اچھے کھاتے پیتے آدمی ہیں ان کے ہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا ادھر میں نے قدم رکھا ادھر ان کی لڑکی نے ٹانگ لی۔ جب تک سیر دو سیر مصالحے مجھ سے نہ پسوا لیتی نہ گھر سے نکلنے دیتی نہ روٹی کا ٹکڑا دیتی خدا جانے کہاں سے محلے بھر کا مصالحہ اٹھا لاتی تھی۔ پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے جہاں میں نے ہاتھ روکا اور اس نے بٹا انگلیوں پر مارا۔ بخدا جان سی نکل جاتی تھی روز یہی مصیبت جھیلنی پڑتی"

کچھ عرصہ بعد دہلی کالج میں داخلہ مل بھی گیا اور وظیفہ بھی۔ یہاں مولوی ذکاء اللہ ان کے ہم جماعت تھے۔ ۱۸۵۴ء میں کالج چھوڑا اور پنجاب میں ۴۰ روپیہ ماہوار پر مدرس ہوئے۔ دو سال بعد ڈپٹی انسپکٹر بن کر کانپور چلے گئے۔ یہاں انگریز انسپکٹر سے اختلاف کی بنا پر استعفیٰ دے کر دہلی چلے گئے۔ اسی اثنا میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ نذیر احمد اس کی چکی میں پسے مگر اتفاق سے ایک انگریز خاتون کی جان اس ہنگامہ میں انھوں نے بچائی تھی۔ اس کا صلہ ملا اور ڈپٹی انسپکٹر مدارس الہ باد متعین ہو گئے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے حکومت کی ایما پر قانون انکم ٹیکس کا ترجمہ کیا۔ دو سال تحصیلدار کے عہدے پر رہنے کے بعد ڈپٹی کلکٹر بنائے گئے۔ اس دوران انھوں نے ایک انگریزی علم ہیئت کی کتاب کا ترجمہ بھی کیا۔ ان کی غیر معمولی ذہانت و قابلیت سے متاثر ہو کر ریاست حیدرآباد کے سپہ سالار جنگ نے انھیں اپنی ریاست میں مدعو کیا۔ اور بالآخر اعظم گڑھ سے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے سے رخصت ہو کر حیدرآباد پہنچ گئے یہاں ترقی کرتے کرتے ریونیو بورڈ کے ممبر بن گئے۔ سپہ سالار جنگ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ اپنے نابالغ صاحب زادہ میر محبوب علی خاں بہادر کے لیے نصاب تعلیم مرتب کرایا۔ حیدرآباد قیام کے دوران نذیر احمد نے چھ مہینہ میں قرآن پاک کا حافظہ مکمل کیا۔ 1883 میں سپہ سالار جنگ کے انتقال کے بعد پینشن لے کر دہلی

واپس آ گئے۔ حیدر آباد میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ جس کا انھیں افسوس تھا۔ دہلی آ کر پوری تندہی سے اس میں مشغول ہو گئے۔

نذیر احمد نے اپنے پیچھے تصانیف کا اچھا خاصہ سرمایہ چھوڑا ہے۔ مختلف موضوعات پر ان کے اشہب قلم نے خوب خوب جولانیاں دکھائیں۔ بعض موضوعات پر تو اولیت کا سہرا انہی کے سر ہے مثلاً ناول کے اسلوب میں زنانہ ادب، قرآن پاک کا سلیس و مسلسل ترجمہ، قانونی کتابوں کے ترجمہ وغیرہ۔ نذیر صاحب خود اپنی تصانیف کے آغاز اور سلسلہ کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

''میں اپنے بچوں کے لئے ایسی کتابیں لکھنا چاہتا تھا کہ وہ ان کو چاؤ سے پڑھیں......ڈھونڈھا تلاش کیا۔ کہیں پتہ نہ لگا میں نے ہر ایک کے مناسب حال کتابیں بنانی شروع کیں۔ بڑی لڑکی کے لئے 'مراۃ العروس' چھوٹی کے لئے 'منتخب الحکایات' بشیر کے لئے 'چند پند' یہ نہیں کیا کہ کتابیں سالم لکھ لیں۔ تب پڑھانی شروع کیں۔ نہیں بلکہ ہر کتاب کے چار چار، پانچ پانچ صفحے لکھ کر ہر ایک کے حوالے کر دیے۔ مگر وہ بچوں کو ایسی بھائیں کہ جس کو پاؤ صفحہ کے پڑھنے کی طاقت تھی وہ آدھے صفحہ کے لیے اور جس کو ایک صفحہ کی استعداد تھی وہ ورق کے لیے مستعجل تھا۔ جب دیکھو ایک نہ ایک متقاضی کہ میرا سبق کم رہ گیا ہے۔ میں اسی وقت قلم برداشت لکھ دیا کرتا یوں کتابوں کا پہلا لگان تیار ہوا۔''

نذیر صاحب کے ناولوں میں مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت، رویائے صادقہ، ایامیٰ اور چند پند شامل ہیں مگر ان میں توبۃ النصوح اور ابن الوقت کو لاثانی شہرت حاصل ہوئی۔

ترجمہ قرآن مجید کے علاوہ الحقوق ولفرائض، الاجتہاد، امہات الامہ، ادعیۃ القرآن نذیر صاحب کی مذہبی تصانیف ہیں۔

نذیر احمد نے منطق اور علمِ ہیئت جیسے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا اور مبادی از حکمت جیسی تالیفات اردو کو دیں۔ فسانہ غدر مجموعہ، لیکچر، رسم الخط اور نصاب خسرو بھی ان کی علمی عرق ریزیوں

کی گواہ ہیں۔ نثر کے علاوہ ان کی نظموں کا ایک مجموعہ 'نظم بے نظیر' بھی منظرِ عام پر آیا۔

مولوی نذیر احمد کی تصانیف کا اگر تنقیدی جائزہ لیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ ان کا طرزِ تحریر منفرد نوعیت کا حامل ہے بے حد واضح، صاف اور پر اثر اندازِ بیان کے ساتھ دہلی کی زبان اور محاورے ان کا طرۂ امتیاز ہیں۔ اسلوب کی بے ساختگی خصوصاً زنانہ ناولوں میں شریف و اعلیٰ خاندانی مستورات کی زبان و انداز، ان کی نثر کو دلکش بناتا ہے۔ نذیر احمد عربی کے ثقیل الفاظ کے ساتھ ساتھ خالص ہندی کے الفاظ بھی جا بہ جا استعمال کرتے ہیں۔ نذیر احمد کے ناولوں کی مقبولیت میں بڑا ہاتھ ان کی ظرافت کا بھی ہے۔ اعتدال کے دائرہ میں رہتے ہوئے مہذب ظریفانہ طرز ادا ان کا خاصہ ہے۔ لیکن یہی انداز جب انھوں نے مذہبی موضوعات میں اپنایا تو اعتدال کا دامن چھوٹ گیا اور بے ادبی و گستاخی میں ملوث ہو گئے۔

نذیر احمد نے اپنی تحریروں میں انگریزی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے۔ انگریزی انھیں آتی تھی، زبان میں دلچسپی تھی، وقت کی ضرورت کے مطابق انگریزی محاورے اور ضرب الامثال کو اختیار کیا، مگر یہاں بھی حد سے آگے بڑھ گئے۔ دراصل نذیر احمد نے اپنی تحریروں میں انگریزی ہی نہیں عربی کے الفاظ و مرکبات بھی خوب خوب استعمال کئے اور عادتاً بے جا بھی کر گئے۔ حقیقتاً انھوں نے تحریر میں خطیبانہ طرز کی آمیزش کر دی۔ ان کی حیثیت ادیب و انشا پرداز کی پہلے ہے، مورخ و سیرت نگار کی بعد میں۔

نذیر احمد کا اردو ادب میں اہم مقام ہے۔ اس کا ایک بنیادی سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے کچھ تصانیف ایسی چھوڑیں جس میں ان کا کوئی ہمعصر شریک نہیں، یا یوں کہیے ان سے پہلے اس طرح کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ نذیر احمد سے پہلے سارا اردو ادب کھنگال ڈالیے، عورتوں کی تعلیم و تربیت یا انھیں درپیش مسائل کے مطابق کوئی کام نظر نہیں آتا۔ یہ انھیں کا خاصہ ہے کہ اپنے قلم سے انھوں نے خواتین اور ان کی معاشرت پر اس قدر ادب فراہم کیا۔ اپنے معیار اور توازن کے سبب نہ صرف یہ کتابیں اردو میں اولیات کا سہرا نذیر احمد کے سر باندھتی ہیں، بلکہ آنے والوں کے لیے بھی رہنما خطوط چھوڑتی ہیں۔ نذیر احمد کے بعد راشد الخیری نے ان تصانیف کا سلسلہ قائم رکھا۔

نذیر احمد کو اردو کے پہلے ناول نگار ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ان سے پہلے مافوق الفطرت کردار واقعات پر مشتمل داستانیں تو ہمارے ادب کا سرمایہ تھیں، مگر سماج اور معاشرے کی عکاس تحریریں سب سے پہلے نذیر احمد کے ناولوں کی ہی شکل میں صفحۂ قرطاس پر نظر آئیں ان کے پہلے دو ناول مراۃ العروس اور بنات النعش ناولوں کی دنیا میں اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔

مراۃ العروس میں نذیر احمد نے دہلی کے اشراف کے طرزِ معاشرت کو بعینہ پیش کیا ہے۔ اور سچ مچ یہ ناول اپنے دور کے سماج کا آئینہ ہے۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس کے کردار اصغری، اکبری وغیرہ زبان زد عام ہو گئے۔ خود نذیر احمد کے مطابق دو سال میں اس کی تقریباً ۱۰ ہزار جلدیں فروخت ہو گئیں، یہی نہیں علاقائی زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہوئے۔ اس میں اپنایا گیا مکالمہ کا طرز اردو میں پہلی مرتبہ نذیر احمد نے ہی اپنایا۔ ناول صرف طرزِ معاشرت کا آئینہ دار ہی نہیں تھا بلکہ اس کے ذریعہ انھوں نے نوجوان لڑکے لڑکیوں کے لیے پند و نصائح کا ایک طویل دفتر بھی کھول دیا مثلاً مراۃ العروس میں لکھتے ہیں۔

''لڑکوں اور لڑکیوں کو ضرور سوچنا چاہئے کہ ماں باپ سے الگ ہوئے۔ پیچھے ان کی زندگی کیوں کر گزرے گی۔ دنیا میں بہت بھاری بوجھ مردوں کے سر پر ہے۔ دنیا میں کھانا کپڑا اور روز مرہ کے خرچ کی سب چیزیں روپیہ سے حاصل ہوتی ہیں ......عورتوں کو بڑی خوشی کی بات ہے کہ اکثر کمانے اور روپیہ پیدا کرنے کی محنت سے محفوظ رہتی ہیں، دیکھو مرد کیسی کیسی سخت محنت کرتے ہیں......سب کے کاموں میں برابر درجہ کی تکلیف ہے......بلکہ خانہ داری کے تمام کام عورتیں کرتی ہیں۔ مرد اپنی کمائی عورتوں کے آگے لا کر رکھ دیتے ہیں......پس اگر غور سے دیکھو دنیا کی گاڑی جب تک ایک پہیہ مرد کا اور دوسرا عورت کا نہ ہو تو چل نہیں سکتی......جن عورتوں نے وقت کی قدر پہچانی اور اس کو کام کی باتوں میں لگایا وہ مردوں کی طرح دنیا میں مشہور اور نامور ہوئی ہیں، جیسے نور جہاں بیگم، زیب النساء بیگم یا ان دنوں نواب سکندر بیگم یا ملکہ وکٹوریہ یہ وہ عورتیں ہیں جنھوں نے ایک چھوٹے سے گھر اور کنبہ کا ہی نہیں بلکہ ملک اور جہان کا بندوبست کیا۔

نبات النعش دراصل مراۃ العروس کا ہی دوسرا حصہ ہے۔ اس کا اسلوب اور طرزِ ادا میں

وہی تعلیم وہی عورتوں کے لیے پند و نصائح اس ناول کی بھی خصوصیات ہیں مگر اس میں تاریخ، حساب، جغرافیہ، حفظانِ صحت، علمِ ہیئت وغیرہ کی بھی ضروری معلومات دلچسپ انداز میں دی گئی ہیں۔

نذیر احمد کی کہانیوں میں توبۃ النصوح واقعی شاہکار ہے۔ دلکش اسلوب، برجستہ مکالمے، مناسب کردار اس کی عام مقبولیت کے اسباب ہیں۔

نذیر احمد کی تمام تحریروں کا عمومی جائزہ لینے پر احساس ہوتا ہے کہ ان کی بعض خامیوں اور بے اعتدالیوں کے باوجود انھوں نے جو ادب، پیغام اور مواد قارئین کے لیے چھوڑا ہے۔ وہ ہمارے ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔ اپنی ذاتی زندگی میں ہی وہ نہایت کفایت شعار تھے۔ یہاں تک کہ بخل کی تہمت بھی لگائی جاسکتی ہے۔ مگر ساتھ ہی ان کی مروت اور سادگی نے ان کے ہاتھ کو دوسروں کے لیے کھول بھی دیا تھا۔ وہ بے تکلف دوسروں کو روپیہ قرض دیتے جو واپس بھی نہیں مل پاتا۔ مزاجاً شوخ تھے، دیانت اور شوخی کے امتزاج نے طبیعت میں چلبلا پن پیدا کر دیا تھا۔ جو ان کی تحریروں میں بھی جھلکتا ہے۔ نذیر احمد اعلیٰ درجہ کے خطیب تھے۔ قوتِ تقریر ایسی ودیعت ہوئی تھی کہ سامعین تقریر ختم ہونے کے بعد بھی منتظر رہتے۔ عوام میں ان کی تقریریں بہت مقبول تھیں۔

۳ مئی ۱۹۱۲ء کو نذیر احمد کی وفات ہوئی مگر ان کی تحریریں ادب کے ناقدین و محققین کے لیے نئے نئے دروازے وا کرتی رہیں گی۔

رابطہ: 09319362400

ضلع بجنور اور سر سید احمد

شیخ نگینوی

فکر انگیز دانشور، ماہرِ تعلیم، عالمِ دین، جدید معاشرے کے حامی، روشن خیال اور باعمل انسان سر سید احمد خاں (۱۸۹۰۔۱۸۱۷ء) ایک عظیم درس گاہ کے بانی کے ساتھ برصغیر کی مقبول ترین زبان اردو کے فروغ کے بھی اہم ستون ہیں۔ سر سید کو معلوم تھا کہ زبان معاشرت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس لئے انھوں نے اردو زبان کو جدید تقاضوں سے ہمکنار کیا۔ طوطا مینا کی کہانیوں کے گرداب سے نکال کر اردو نثر کو ایک توانا اور سادہ طرز دیا۔ انھوں نے اصلاح معاشرہ کا کام بھی قلم سے لیا اور اردو میں انشاء نگاری کو فروغ دیا۔

1854 میں سر سید جب آثار الصنادید کا دوسرا ایڈیشن نکال چکے تھے، تب اڈورڈ تھامس، سابق جج دہلی کے مشورے پر 13 / جنوری 1855 کو دہلی سے بجنور مستقل صدر امین ہو کر آئے۔ جس زمانے میں سر سید دہلی سے بجنور تبادلہ ہو کر آئے انھی دنوں میں ایک سرکلر محکمۂ صدر بورڈ سے تمام صاحبان ضلع کے نام یہ مضمون جاری ہوا تھا کہ جس ضلع کا بندوبست ختم ہو جائے اس ضلع کی ایک مفصل تاریخ لکھوائی جائے۔ یہ سرکلر پہلے سے صاحب کلکٹر بجنور کے دفتر میں آیا ہوا تھا مگر ابھی تک عمل درآمد نہ ہوا تھا۔ ایک روز صاحب کلکٹر نے سر سید سے اس کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا اس ضلع کی تاریخ میں لکھوں گا۔ سر سید نے بجنور ضلع کی تاریخ بھی اپنی جبلی عادت کے موافق نہایت تحقیق اور کاوش اور محنت کے ساتھ لکھی۔ سر سید کا بیان تھا کہ ''گو اس تاریخ میں ضلع کے حالات کے سوا کوئی عام دلچسپی کی بات نہ تھی مگر اثنائے تحقیقات میں بعض قانون گویوں کے پاس اکبر اور عالمگیر کے زمانے کے ایسے کاغذات ملے جن سے نہایت عمدہ نتیجے نکلتے تھے'' ان سب کاغذات کی نقلیں اپنے اپنے موقع پر اس تاریخ میں درج تھیں۔ جب یہ تاریخ لکھی جا چکی، تو صاحب کلکٹر بجنور نے اس کو ملاحظہ کے لئے صدر بورڈ میں بھیج دیا۔ ابھی وہ بورڈ سے واپس نہ آئی

تھی کہ غدر ہو گیا اور آگرہ میں تمام دفتر سرکاری کے ساتھ وہ بھی ضائع ہو گئی۔ (حیاتِ جاوید)

سرسید احمد خاں نے بجنور آکر جو ایک اہم ادبی کام انجام دیا وہ آئینِ اکبری کی تصحیح بھی ہے۔ آئینِ اکبری اول تو زبان اور طرزِ بیان کے لحاظ سے ایک نئی طرح کی کتاب تھی، دوسرے جس قسم کے مضامین اس میں بیان کیے گئے فارسی لٹریچر میں کبھی اس قسم کے مضامین بیان نہیں ہوئے۔ اس لئے اس کے پڑھنے میں جی الجھتا تھا۔ پھر آئینِ اکبری کے نسخے کاتبوں کے سہو وخطا سے اکثر مسخ ہو گئے تھے۔ اس لئے اس کا صحیح کرنا سخت دشوار تھا لیکن سرسید نے بہت طریقے اور سلیقے سے اس کام کو انجام دیا۔ سرسید احمد خاں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کا خواب بھی بجنور تقرری کے دوران دیکھا تھا۔ جو بعد میں شرمندۂ تعبیر ہوا۔

سرسید ترقی کرکے مراد آباد کے صدر الصدور بن گئے اور بجنور سے مراد آباد ۱۸۵۸ء میں منتقل بھی ہو گئے۔ ۱۲ر مئی ۱۸۵۷ کو ضلع بجنور میں غدر ہو گیا تھا۔ سرسید نے مئی ۱۸۵۷ء سے اپریل ۱۸۵۸ء تک کے غدر کے حالات ''سرکشیٔ ضلع بجنور'' میں چھپوا کر شائع کیے۔ اس تاریخ میں غدر کے حالات اور واقعاتِ غدر جو ضلع بجنور میں گزرے بقیدِ تاریخ نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے تھے تمام خط وکتابت جو کہ وہ حکام ضلع کے ساتھ رڑکی میں کرتے تھے اور تمام تحریریں جو انھوں نے نواب محمود خاں اور چودھریوں کے نام یا آپس میں ایک دوسرے کے نام بھیجیں اور اس کے سوا اور بہت سی تحریرات جو اس معاملہ سے تعلق رکھتی تھیں لفظ بہ لفظ اس کتاب میں درج کیں۔ (حیاتِ جاوید)

سرسید نے ضلع بجنور میں رفاحی کام بھی کئے اور وہ ضلع میں حکومت کے رفاحی کاموں کے ذمہ دار بھی بنائے گئے تھے۔ سرسید کی حکمت عملی، ملی جذبہ اور دوراندیش ہونے کی وجہ سے ضلع بجنور کے عوام بالخصوص مسلمانوں کا بغاوت کے باوجود کم نقصان ہوا۔ سرسید کی قومی، ملی، علمی اور ادبی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

رابطہ: 9412326875

انجینئر محمد فرقان سنبھلی

ریاست اتر پردیش کا ضلع سنبھل اپنی گونہ گوں خصوصیات کی بنا پر یکتائے روزگار رہے۔ صنعتی انفرادیت کے علاوہ یہاں کے باشندے نہایت ذکی، فہیم اور علم وادب کے شیدائی ہوتے ہیں اپنے ضلع کی علمی وادبی فضا کی شناخت کو مستحکم بنانے کے لئے محمد فرقان نے خود کو ہر حال میں ادبی ماحول سے وابستہ رکھا۔

محمد فرقان کی زندگی کا سفر ۲۰ رجون ۱۹۷۳ء کو محمد غفران اور عبیدہ خاتون کے خانوادے سے شروع ہوا جو اب اس جہانِ پرخار میں اپنے نونہال کو تنہاں چھوڑ کر عدم آباد میں جابسے۔

محمد فرقان صاحب نے اپنا تعلیمی سلسلہ بھی سرزمین سنبھل سے ہی جوڑے رکھا اور ایم۔ اے، ڈپلومہ سول انجینیر نگ کرنے کے بعد عارضی طور پر 1996 سے جل نگم کی کنسٹرکشن ڈویژن مراد آباد میں خدمات کا سلسلہ شرع کیا۔ 2001 سے روزنامہ سہارا اردو، دہلی سے وابستہ ہوئے اس کے علاوہ ہفتہ وار قومی فکر اور وقار اخبار کی ادارت کا کام 2009 شروع کیا۔ نیز انٹرنیٹ پر ایک ویب میگزین مشعل جاری کی۔ اب اس سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے ہم ان کے ادبی سفر کی جانب رخ کرتے ہیں۔

محمد فرقان کے فکر تخیل کے رخش ہمیں 1992 میں مشرقی آنچل میں شائع شدہ افسانہ زخمی دل میں رواں دواں نظر آتا ہے۔ ان کے افسانوی مجموعہ کے علاوہ افسانہ سے متعلق کئی کتابیں اشاعت کے مراحل سے گزر چکی ہیں۔ فرقان صاحب کی اردو سے قلیل المدت وابستگی کے باوجود ان کی کاوشوں کا ایک عظیم سرمایہ موجود ہے۔ ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔ مصرِ قدیم، آئینہ فلکیات، اردو صحافت اور ضلع مراد آباد، آبِ حیات (افسانوی مجموعہ) نقوشِ قلم (مجموعہ

مضامین)، ترک اور سرکار سنبھل (ترجمہ)، اسلم جمشید پوری کے دیہی افسانے۔ اپنی ادبی خدمات کی بنا پر انھیں حکومت اتر پردیش نے 2013,2008,2005 میں ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ اس کے علاوہ اور بہت سے اعزازات سے ان کو نوازا جا چکا ہے۔ محمد فرقان کی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ریسرچ مکمل ہو چکی ہے اور گیسٹ لیکچرر کے طور پر ویمنس کالج علی گڑھ میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی

سجاد حیدر یلدرم

انجینئر محمد فرقان سنبھلی

ہندوستان میں بیسوی صدی قبل ایسی تحریریں لکھی جانے لگیں تھیں جن میں افسانے کے عناصر موجود تھے سر سید احمد خاں کی تحریر ''گزرا ہوا زمانہ'' کا آغاز اور وسط افسانوی طرز کا ہے لیکن اس کے اختتام کی وجہ سے یہ اردو کا پہلا افسانہ نہیں بن سکا۔ اختتام تک آتے آتے سر سید کی قومی فکر بیدار ہو اٹھی اور آخر میں انھوں نے جو خطابیہ کلمات تحریر کیے اس نے تحریر کو افسانہ نہیں رہنے دیا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ تحریر اس زمانے کی ہے جبکہ فکشن کے خلاف باقاعدہ ردِ عمل کی صورت دکھائی دیتی تھی بہر حال اردو میں افسانہ کی روایت کا آغاز انگریزی کی شارٹ اسٹوری کے ذریعہ ہوا۔ شارٹ اسٹوری کے مفہوم میں لفظ افسانہ کا پہلا استعمال سجاد حیدر یلدرم کے یہاں ملتا ہے:

> ''سجاد حیدر یلدرم نے پہلی بار شارٹ اسٹوری کے مفہوم میں لفظ ''افسانہ'' استعمال کیا''[1]

سجاد حیدر یلدرم روہیل کھنڈ کے قصبہ نہٹور ضلع بجنور سے تعلق رکھتے تھے اس طرح روہیل کھنڈ میں اردو افسانہ کا آغاز ٹھیک اسی دور میں مانا جاسکتا ہے جس دور میں ہندوستان میں اردو افسانہ کا آغاز ہوا۔ پروفیسر احتشام حسین نے لکھنؤ میں منعقدہ اردو افسانہ پر ایک سمپوزیم میں سجاد حیدر یلدرم کو اردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں شمار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہم کو جو ابتدائی افسانہ نگار ملتے ہیں ان میں دو نام نمایاں طور پر نظر آتے ہیں ایک سجاد حیدر یلدرم کا دوسرا پریم چند کا دونوں کی افسانہ نویسی کی ابتدا کم و بیش ایک ہی زمانہ میں ہوئی''[2]

سجاد حیدر یلدرم نے تراجم کے ذریعہ نہ صرف رومانی میلان کو متعارف کرایا بلکہ اردو

افسانہ کو بھی ایک نئی جہت عطا کی۔ انھوں نے اردو کو نئے انداز اور لطیف احساس سے روشناس کرایا۔ جبکہ ان کے ہی زمانے میں پریم چند نے حقیقت پسندی کا رجحان قبول کیا۔ شاہد لطیف نے ترقی پسند افسانوی ادب میں لکھا ہے:

> ''بیسویں صدی کے ربع اول تک ہمارے افسانوی ادب میں دو تحریکیں پیش پیش نظر آتی ہیں۔ ایک کے سالار پریم چند، سدرشن وغیرہ ہیں۔ دوسری کے روح رواں سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، سلطان حیدر جوش، ل احمد اور ان کے مقلدین ہیں۔ یہ دونوں تحریکیں اپنا اپنا کام کرتی اور آہستہ آہستہ اپنا اپنا حلقہ اثر پیدا کرتی رہیں''[۳۲]

سجاد حیدر یلدرم نے علی گڑھ تحریک کی کوکھ سے جنم لیا لیکن وہ سرسید کی حقیقت پسندی اور بے نمکی کے خلاف جا کھڑے ہوئے۔ سرسید احمد خاں نے جذبے اور جمالیاتی قدروں کی جو اندیکھی کی اس سے سجاد حیدر یلدرم مطمئن نہیں تھے۔ سرسید کی اصلاحی تحریک اس اعتبار سے غیر متوازن تھی کہ اس نے زندگی کے محض ایک مظہر عقل اور فکر کو ہی مکمل زندگی تصور کر لیا تھا۔ یلدرم حالانکہ سرسید سے بے حد عقیدت رکھتے تھے اور علی گڑھ تحریک سے بھی گہرا شغف رکھتے تھے لیکن تخیل اور جذبات کی بنیاد پر انھوں نے نئی راہ نکالی اور حقیقت پسندی کے خلاف خوش مزاج اور باذوق نوجوانوں کے لئے کشش کا سامان پیدا کیا۔

روہیل کھنڈ خطہ میں اردو افسانہ کے آغاز میں دو افسانہ نگار پیش پیش نظر آتے ہیں سجاد حیدر یلدرم اور سلطان حیدر جوش۔ سجاد حیدر یلدرم کے تقریباً ایک سال کے بعد ہی سلطان احمد جوش بھی افسانہ نگاری کے میدان میں طبع آزمائی کرتے ہیں اور اس طرح روہیل کھنڈ میں اردو افسانہ کے آغاز پر ہی اسے دو افسانہ نگار مل جاتے ہیں۔

بعض ناقدین نے سجاد حیدر یلدرم کو اردو کا پہلا افسانہ نگار بتایا ہے۔ پاکستان کے نقاد ڈاکٹر معین الرحمن نے یلدرم کو پہلا افسانہ نگار بتاتے ہوئے ان کے ایک قدیم ترافسانہ ''نشے کی پہلی ترنگ''[۳۳] (مطبوعہ اکتوبر ۱۹۰۰ معارف علی گڑھ شمارہ ۳) کو اردو کا پہلا افسانہ قرار دیا ہے

حالانکہ یہ افسانہ طبعزاد نہیں ہے۔ بلکہ ترکی زبان کے مشہور افسانہ نگار خلیل رشدی کے افسانے کا ترجمہ ہے۔۵ یلدرم کے پہلے افسانوی مجموعہ ''خیالستان'' کے تازہ (سال اشاعت ۲۰۱۲) ایڈیشن کے دیباچہ میں ڈاکٹر معین الرحمن نے ''نقوش'' لاہور کے حوالے سے قرۃ العین حیدر کا لکھا ایک اقتباس پیش کیا ہے جس میں وہ لکھتی ہیں:

ایک پاکستانی محقق اور نقاد سید معین الرحمن نے ''خیالستان'' کا نیا ایڈیشن نئی ترتیب کے ساتھ اردو مراکز لاہور سے شائع کیا ہے۔ مرتب نے کتاب کے مقدمہ میں یہ ثابت کیا ہے کہ پریم چند کے بجائے یلدرم اردو کے پہلے افسانہ نگار تھے۔''۶ (نقوش لاہور سالنامہ جنوری ۱۹۷۶ ص ۴۳)

مرزا حامد بیگ نے ''اردو کے اولین افسانہ نگار'' مضمون میں تاریخی اعتبار سے جو ابتدائی طبعزاد افسانوں کی فہرست ترتیب دی ہے اس کے مطابق سجاد حیدر یلدرم کا افسانہ ''دوست کا خط'' (مطبوعہ مخزن لاہور اکتوبر ۱۹۰۶) چھٹے نمبر پر ہے [حالانکہ یلدرم کے اس سے قبل بھی افسانے شائع ہو چکے تھے۔ مثلاً ''جہاں پھول کھلتے ہیں'' ۱۹۰۵ میں شائع ہوا ہے] جبکہ راشد الخیری کے افسانے ''نصیر اور خدیجہ''۔ (مطبوعہ مخزن لاہور دسمبر ۱۹۰۳) کو پہلا افسانہ قرار دیا گیا ہے۔۷ اس فہرست میں وہ راشد الخیری، علی محمود اور وزارت حسین کے بعد چوتھے افسانہ نگار ہیں سجاد حیدر یلدرم بھلے ہی اردو افسانہ کی تاریخ کے پہلے افسانہ نگار نہ ہوں لیکن روہیل کھنڈ میں وہ پہلے ہیں جنھوں نے اردو افسانہ کا آغاز کرنے کے ساتھ اسے نئے میدان سے آشنا کیا۔

مرزا حامد بیگ کی اس فہرست میں پانچویں افسانہ نگار سلطان حیدر جوش ہیں جو کہ روہیل کھنڈ کے بدایوں ضلع میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا پہلا افسانہ ''نابینا بیوی'' (مطبوعہ مخزن دہلی دسمبر ۱۹۰۷) اردو افسانہ کی تاریخ کا دسواں افسانہ ہے۔ حالانکہ یلدرم کی طرح سلطان حیدر جوش کو بھی اردو کا پہلا افسانہ نگار کہا جاتا رہا ہے۔ ۱۹۸۸ء میں ''پہلی کرسی کے حضور'' مضمون میں ابوالفضل صدیقی نے سلطان حیدر جوش کو ان کے اپنے بیانات کی روشنی میں اردو کا پہلا افسانہ نگار

کہا تھا۔[8]

روہیل کھنڈ میں افسانہ نگاری کا آغاز بلاشبہ سجاد حیدر یلدرمؔ کے افسانوں سے ہوتا ہے۔ سلطان حیدر جوش نے بھی کم وبیش اسی عہد میں افسانے لکھنے کا آغاز کیا حسن اتفاق کہ دونوں ہی افسانہ نگاروں کو اردو کو پہلا افسانہ نگار بتایا گیا حالانکہ نئی تحقیق نے اب دھند صاف کردی ہے اور پہلے افسانہ نگار راشد الخیری کو تسلیم کرلیا گیا ہے۔ اس تحقیق کے مطابق سجاد حیدر یلدرمؔ کو چوتھا اور سلطان حیدر جوش کو پانچواں مقام حاصل ہوا ہے سجاد حیدر یلدرمؔ کا افسانہ ''دوست کا خط'' (مطبوعہ مخزن لاہور اکتوبر ۱۹۰۶) ہے جبکہ سلطان حیدر جوش کا پہلا افسانہ ''نابینا بیوی'' (مطبوعہ مخزن دہلی دسمبر ۱۹۰۷) ہے۔ اس طرح روہیل کھنڈ کے یہ دونوں افسانہ نگار ۱۹۰۵ تا ۱۹۰۷ افسانہ نگاری کا آغاز کر چکے تھے۔ محمد طیب نے تو ''جوش فکر'' میں دعویٰ کیا ہے کہ سلطان حیدر جوش نے پہلا افسانہ ۱۹۰۶ میں لکھ لیا تھا جو کہ ذرا تاخیر سے ''الناظر'' میں شائع ہوا۔ اگر اس پر یقین کیا جائے تو سلطان حیدر جوش روہیل کھنڈ کے پہلے افسانہ نگار ہو سکتے تھے لیکن محمد طیب نے اس معاملے میں وضاحت پیش نہیں کی ہے جس کی وجہ سے جوش کا دعویٰ مظبوط نہیں کہا جا سکتا۔

سجاد حیدر یلدرمؔ کا طبعزاد افسانہ بھلے ہی ۱۹۰۵ میں منظر عام پر آیا ہو لیکن وہ اردو افسانہ میں ترجمہ کے ذریعہ بہت پہلے داخل ہو چکے تھے۔ پاکستان کے نقاد ڈاکٹر معین الرحمن نے سجاد حیدر یلدرمؔ کے افسانہ ''نشے کی پہلی ترنگ'' کو ''خیالستان'' کے تازہ ایڈیشن میں شامل کر کے اسے اردو کا پہلا افسانہ قرار دیا ہے۔ جو کہ ۱۹۰۰ میں پہلی بار معارف علی گڑھ (ریڈر مولوی وحید الدین سلیم) جلد ۴ شمارہ ۳ اکتوبر ۱۹۰۰ میں شائع ہوا ہے۔ لیکن شمارہ کی فہرست (ص ۴) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترکی کے مشہور رسالہ ثروت فنون میں شائع [افسانہ نگار خلیل رشدی] کے افسانے کا ترجمہ ہے اس سے پہلے معارف کے اگست ۱۹۰۰ کے شمارہ میں سجاد حیدر یلدرمؔ کا افسانہ ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ'' شائع ہو چکا تھا جو کہ انگریزی افسانہ کا ترجمہ ہے۔ یہ افسانہ لطیف مزاح سے بھرپور ہے۔ یلدرم کے ایک اور طبعزاد افسانہ ''احمد'' کا بھی پتہ چلا ہے جو کہ مئی ۱۹۰۶ میں ''علی گڑھ منتھلی'' میں شائع ہوا ہے۔ جو کردار نگاری کا اچھا نمونہ ہے۔ پتہ نہیں کیوں اس کا ذکر مرزا حامد بیگ نے اردو

کے ابتدائی افسانوں میں نہیں کیا ہے۔ مرزا حامد بیگ ہی کیوں، ناقدین نے عام طور پر اس افسانے کو توجہ نہیں دی ہے۔ معروف نقاد پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے لکھا ہے:

''اسی زمانے کا ایک افسانہ 'احمد' ہے یلدرم نے یہ افسانہ ۱۹۰۶ میں لکھا تھا۔ اس افسانہ کو نہ جانے کیوں کسی نقاد نے گفتگو اور تنقید کا موضوع نہیں بنایا جبکہ افسانہ شخصی خاکے کی تکنیک میں لکھا ہوا کردار نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے'' ص ۱۲۰

8 سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں کی تاریخی ترتیب کچھ اس طرح ہے:

۱۔ مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ......انگریزی سے ماخوذ......اشاعت معارف اگست ۱۹۰۰

۲۔ نشے کی پہلی ترنگ......ترکی افسانہ سے ترجمہ......معارف اکتوبر ۱۹۰۰

۳۔ جواب......ترکی افسانہ سے ترجمہ......معارف جولائی ۱۹۰۱

۴۔ فطرت جواں مردی......ترکی افسانہ سے ترجمہ......مخزن جولائی ۱۹۰۱

۵۔ جہاں پھول کھلتے ہیں......طبعزاد......علی گڑھ منتھلی ۱۹۰۵

۶۔ صحبت ناجنس......ترکی سے ترجمہ......مخزن فروری ۱۹۰۶

۷۔ ایک مغنیہ سے التجا......ترکی سے ترجمہ......اردوئے معلیٰ فروری ۱۹۰۶

۸۔ میں چاہتا ہوں......طبعزاد......اردوئے معلیٰ مارچ اپریل ۱۹۰۶

۹۔ احمد علی گڑھ کا ایک قصہ......طبعزاد......علی گڑھ منتھلی ۱۹۰۶

۱۰۔ خارستان وگلستان......ترکی افسانہ سے ماخوذ......مخزن جون ۱۹۰۶

۱۱۔ غربت ووطن......طبعزاد......اردوئے معلیٰ اکتوبر ۱۹۰۶ / جنوری ۱۹۰۷

۱۲۔ دوست کا خط......طبعزاد......مخزن اکتوبر ۱۹۰۷

۱۳۔ حضرت دل کی سوانح عمری......مخزن فروری ۱۹۰۷

۱۴۔ چڑیا چڑے کی کہانی......طبعزاد......مخزن اپریل ۱۹۰۷

۱۵۔ ازدواج محبت

۱۶۔ نکاح ثانی......ترکی سے ترجمہ......مخزن جون ۱۹۰۷

۱۷۔سیل زمانہ.....طبعزاد......مخزن جولائی ۱۹۰۷

۱۹۔حکایہ لیلیٰ مجنوں...طبعزاد......مخزن اکتوبر ۱۹۰۷ر اپریل ۱۹۰۸

۲۰۔سودائے سنگین........ماخوذ......مخزن اگست ۱۹۰۸

ان میں سے بعض افسانے یلدرمؔ کے پہلے افسانوی مجموعہ ’’خیالستان‘‘ میں ۱۹۱۰ میں شائع ہوئے ہیں۔خیالستان بیسویں صدی کے اوئل کی بڑی تابندہ کتاب تھی۔بقول پطرس بخاری یہ مجموعہ اپنی اشاعت کے چند ہفتوں کے اندرہی بے حد مقبول ہوگیا تھا۔اس کے اگلے ۱۸ سالوں میں ۱۸ ایڈیشن شائع ہوئے۔۱۹۶۲ میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے اور ۱۹۶۸ میں ڈاکٹر معین الرحمن نے پاکستان سے شائع کیا۔ڈاکٹر معین الرحمن نے اگلا ایڈیشن ۱۹۷۶ میں شائع کیا جبکہ سال ۲۰۱۲ میں اس کا تازہ ایڈیشن الوقار پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا ہے۔اس میں ڈاکٹر معین الرحمن نے نئی ترتیب کے ساتھ افسانے شائع کیے ہیں ’’نشے کی پہلی ترنگ‘‘ کو بطورضمیمہ پیش کیا ہے۔مجموعہ میں تین مضامین دوست کا خط،اگر میں صحرا نشیں ہوتا،سیل زمانہ ’’انشائیہ اور افسانے کی ملی جلی شکل ہیں۔چار افسانے خارستان وگلستان،صحبت ناجنس،نکاح ثانی اور سودائے سنگین ترکی افسانوں کے تراجم ہیں جن میں یلدرمؔ نے بہت کچھ تصرف سے کام لیا ہے۔ایک انشائیہ نما افسانہ ’’مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ‘‘ انگریزی سے ترجمہ ہے بقیہ پانچ افسانے ازدواج محبت،چڑیا چڑے کی کہانی،حضرت دل کی سوانح عمری،حکائیہ لیلیٰ ومجنوں اور غربت ووطن خود یلدرمؔ کی ذہنی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔

روہیل کھنڈ کی ابتدائی کاوشوں میں ’’خیالستان‘‘ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔اردو افسانہ نگاری کے تعلق سے یہ پہلی کاوش کہی جاسکتی ہے جو کہ بہت مقبول بھی ہوئی۔یلدرمؔ اور ان کے ’’خیالستان‘‘ کے نوترتیب شدہ ایڈیشن کے بابت سید وقار عظیم نے جن کلمات سے ڈاکٹر معین الرحمن کو مفتخر فرمایا ان کے مطابق:

’’یلدرمؔ افسانہ نگار ہیں۔یلدرمؔ رومانی افسانہ نگار ہیں یلدرمؔ اردو کے اولین افسانہ نگار ہیں اور ان سب حیثیتوں سے بیسویں صدی کی نثر میں ان کا ایک نمایاں مقام ہے ان سب باتوں کی وضاحت

خیالستان کے اس نو ترتیب ایڈیشن میں کی گئی ہے اور اس طرح کی گئی ہے کہ یہاں ہمیں تحقیق اور تجربے کے علمی اور حسنِ ذوق کے جمالیاتی تقاضے پوری طرح ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

میرے نزدیک خیالستان کے اس ایڈیشن نے پہلی مرتبہ ایک بلند افسانہ نگار اور قابلِ رشک انشا پرداز اور مترجم کو اس کا حق دیا ہے جس سے اب تک ہم نے اسے محروم رکھا تھا۔'' ۳؎

سجاد حیدر یلدرم تراجم کے توسط سے اردو افسانہ کے میدان میں داخل ہوئے تھے اس لئے خیالستان میں ان کے تراجم کو ترتیب کے اعتبار سے شروع میں رکھا گیا ہے۔ صحبت ناجنس، خارستان وگلستان، نکاح ثانی اور سودائے سنگین ترکی سے ترجمہ کیے گئے ہیں جن کے متعلق سجاد حیدر یلدرم کا اعتراف شامل کتاب ہے:

''یہ افسانے کچھ طبعزاد ہیں کچھ ترکی وانگریزی سے ملخص۔ خارستان وگلستان، صحبت ناجنس، نکاح ثانی، سودائے سنگین ترکی سے لئے گئے ہیں مگر ان میں میں نے بہت کچھ تصرف کیا ہے۔'' ۵؎

سجاد حیدر یلدرم بھلے ہی اردو کے پہلے افسانہ نگار نہ کہے جاسکیں لیکن ان کے روہیل کھنڈ کے پہلے افسانہ نگار ہونے سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ یلدرم نے جس روش کو اختیار کیا تھا وہ دھیرے دھیرے ایک رجحان بنتا گیا اور اس طرح ہندوستان نے اردو زبان میں ایک نئی صنف کو نئے تناظر میں دیکھنے کا آغاز کیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر یلدرم نے شارٹ اسٹوری کو اردو میں متعارف نہ کرایا ہوتا تو جوش، نیاز، حجاب امتیاز علی وغیرہ جیسے افسانہ نگاروں کے لئے راہ ہموار نہ ہوئی ہوتی۔

۱؎ پاکستان میں اردو افسانہ کے پچاس سال از شہزاد منظر ص ۱۸

۲؎ اعتبار نظر از احتشام حسین لکھنؤ طبع اول ۱۹۶۵ء ص ۱۵۵۔۱۵۴

۳؎ ترقی پسند افسانوی ادب۔ شاہد لطیف۔ اردو جولائی ۱۹۴۰ء ص ۴۴۱

۴؎ ڈاکٹر منظر اعظمی نے ''اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ'' کے ص ۳۳۷ پر ''نشے کی پہلی ترنگ'' کو ترجمہ بتایا ہے اور لکھا ہے کہ ترکی کے نامور رسالے ''ثروت فنون'' سے

ترجمہ کیا گیا ہے اور حاشیے میں سجاد حیدر یلدرم نے خود اسے ''ماخوذ'' بتایا ہے۔

۵ قصہ ایک صدی کا از ڈاکٹر انوار احمد ص ۴۴

۶ خیالستان دیباچہ ڈاکٹر معین الرحمٰن سال اشاعت ۲۰۱۲ ص ۱۰

۷ اردو کے اولین افسانہ نگار مشمولہ ''تنقید'' علی گڑھ جون ۲۰۰۵ ص ۱۹

۸ پہلی کرسی کے حضور از ابوالفضل صدیقی مطبوعہ ''سیپ'' کراچی ۱۹۸۸

۱ مقدمہ ''جوش فکر'' از سلطان حیدر جوش ص ۴

۲ اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل۔ پروفیسر صغیر افراہیم ص ۱۱۳

۳ ص ۱۲۰

A انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ پروفیسر ثریا حسین اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۸۵ ص ۱۰۔۱۱

B انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ پروفیسر ثریا حسین اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۸۵ ص ۱۰

۳ دیباچہ ''خیالستان'' طبع دوم ۱۹۷۶ ص ۹

رابطہ:09411808585

کچھ ڈاکٹر زیبا ناز کے بارے میں

زیبا ناز نے ۵ جون ۱۹۷۶ کو مردم خیز شہر مراداباد کے محلہ مانپور میں محمد دین صاحب کے یہاں آنکھیں کھولیں۔ محمد دین صاحب نہایت معزز اور باوقار شخصیت کے مالک ہیں پیشے سے تاجر ہیں، لیکن زیبا ناز کی والدہ صادقہ بیگم سادے کاروں کے خانوادے سے تعلق رکھتی ہیں۔ سول کمشنر حافظ سجاد حسین یانی صاحب کے فرزند ابوالحسن یانی صاحب کی صاحبزادی ہیں۔ جگر صاحب مراداباد میں حافظ سجاد حسین یانی صاحب کے یہاں ہی قیام کیا کرتے تھے۔ لہٰذا صادقہ بیگم کی پرورش و پرداخت میں جگر صاحب کا بھی عمل دخل رہا۔ انھیں اردو سے خاص شغف ہے آج بھی اردو کی کسی نہ کسی کتاب کے مطالعہ میں مستغرق رہتی ہیں۔ بے پناہ اشعار ازبر ہیں۔ والدہ کی صحبت اور تربیت کا اثر زیبا ناز کی طبیعت سے نمایاں ہے۔

زیبا نے ابتدائی تعلیم مراداباد کے کانوینٹ اسکول میں حاصل کی۔ عبدالسلام مسلم گرلز انٹر کالج سے میٹرک پاس کیا اور بی۔ اے گوکل داس ہندو گرلز کالج اور ایم۔ اے مہاراجہ ہریش چندر پی جی کالج، مراداباد سے کیا۔ طالب علمی کے دوران ان کے استاد ڈاکٹر صابر صاحب اپنی غیر موجودگی میں زیبا کو کلاس میں پڑھانے کا حکم صادر فرما دیتے۔ اور یہ انہی کی مہربانی تھی کہ زیبا ناز کو تدریسی باریکیوں کی تفہیم کا موقعہ ملا۔ چنانچہ ایم۔ اے میں فرسٹ ڈویژن سے کامیابی حاصل کر پی ایچ ڈی شروع کر دی۔ ڈاکٹر فہمیدہ خان کی زیرِ نگرانی تحقیق کے دوران گوکل داس ہندو گرلز کالج میں بحیثیت اردو لکچرر خدمات انجام دیتی رہیں۔ جس میں صرف طالبات کو اردو پڑھانا ہی نہیں بلکہ ان میں اردو کی جانب خاص رجحان پیدا کرنا بھی تھا۔ اردو کی بقا کے لیے وہ بے لوث خدمات انجام دیتی چلی آ رہی ہیں۔ گوکل داس میں یہ 1998 سے 2011 تک اسسٹینٹ پروفیسر کے عہدہ پر فائز رہیں بعد ازاں مہاراجہ ہریش چندر پی۔ جی کالج میں 2013 تک اردو زبان و ادب کی

خدمت کی۔اب گلاب سنگھ ہندو پی۔جی کالج چاندپور ضلع بجنور میں اردو زبان وادب کی خدمات انجام دے رہی ہیں۔

''فرہنگ کلیاتِ ذوق'' ڈاکٹر زیبا ناز کی مطبوعہ کتاب ہے جس پر اردو اکادمی لکھنؤ نے انھیں انعام سے سرفراز کیا، اس کے علاوہ مختلف ادبی مجالس، شہر و بیرون شہر ادبی سمیناروں اور سماجی پروگراموں میں انھیں انعامات و اعزازات سے سرفراز کیا جاتا رہا ہے۔موصوفہ ایک افسانہ نگار اور تحقیق نگار کے نام سے جانی جاتی ہیں۔اگرچہ ابتداء میں چند نظمیں بھی لکھیں۔لیکن جلد ہی اس کوچہ سے باہر آگئیں اور اپنی تمام تر توجہ افسانہ پر مرکوز کردی۔''زندگی کے پیچ وخم'' ''کرنی بھرنی'' ''بڑی بہن' ان کے بہترین افسانے ہیں جو متعدد ادبی رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ ''رحمت جو بن جاتی ہے زحمت'' ان کا انشائیہ بھی بہت دلچسپ ہے۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی

اختر الایمان

ڈاکٹر زیبا ناز

پہاڑوں کے دامن میں بسا ضلع بجنور اپنی رنگا رنگ تہذیب، روایت، ثقافت اور علم و ادب کی خدمات کے سلسلے میں منفرد مقام کا حامل ہے۔ اس سرزمین پر جنم لینے والے علم وادب کے شیدائیوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے اور ایوانِ ادب کی جس طرح مرصع سازی کی اور گل بوٹے تراشے ان سے ایوانِ ادب جگمگا اٹھا۔ لہٰذا ان پاسبانِ علم وفن اور رہروانِ زبان وادب کی خدمات کو اردو داں طبقہ کبھی فراموش نہیں کرسکتا ان ناموں میں ایک اہم نام اختر الایمان کا بھی ہے۔

اختر الایمان 12 نومبر 1912 کو راہوکھیڑی نجیب آباد میں مولوی فتح محمد کے یہاں پیدا ہوئے۔ دہلی یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ حصولِ علم کے بعد کچھ عرصہ محکمہ سول سپلائز سے جڑے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے آل انڈیا ریڈیو میں کام کیا۔ لیکن ابتدائی میلان شاعری کی جانب تھا لہٰذا فکر کو فن کو جلا دیتے رہے اور ایک کامیاب شاعر بن کر ابھرے۔

اختر الایمان نے نظم کے میدان میں اپنی شناخت قائم کی۔ ان کی تمام نظمیں ہیئت کے اعتبار سے آزاد اور معرا ہیں۔ انھوں نے میراجی اور راشد کی طرح اپنی تمام تر توجہ آزاد نظم پر ہی مذکور نہیں کی بلکہ پابند اور معرا نظم پر بھی طبع آزمائی کی۔ وہ ایسے نظم گو کی حیثیت سے مشہور ہیں جنھوں نے غزل کی روایت سے انحراف کیا۔ اور مروجہ شعری زبان کو کو بھی ہدفِ طعن وتشنہ بنایا انھوں نے اپنی نظموں میں روزمرّہ استعمال ہونے والی عام فہم زبان کے ساتھ علامات کا نہایت حسین استعمال کیا ہے۔

اختر الایمان کا خیال کہ اعلیٰ وارفع جذبات کے اظہار کے لئے ضروری نہیں کہ الفاظ بھی اعلیٰ معیاری اور دقیق ہوں۔ کبھی کبھی ایسے الفاظ بھی استعمال کرنے پڑتے ہیں جو رکیک، سادہ، پست اور ساقط المعیار ہوتے ہیں اور تہذیب یافتہ حلقے کی سماعت کو مجروح کرتے ہیں لیکن ان کے پیچھے جو روح کار فرما ہوتی ہے اور جو خیال ان کی پشت پناہی کرتا ہے وہی اصل ہے ان کی نظموں کا مطالعہ کرنے پر جیتی جاگتی تصویریں آنکھوں میں پھر جاتی ہیں۔ بدلتے حالات کی مجبوری اور مشینی دنیا کے تحت احساس کو کچل دینے والی مصروفیت نے جذبات کو کس طرح پامال کیا ہے ایک نظم ''عہدِ وفا'' میں ملاحظہ ہو۔

یہی شاخ تم جس کے نیچے کسی کے لیے چشمِ نم ہو
اب سے کچھ سال پہلے
مجھے ایک چھوٹی سی بچی ملی تھی جسے میں نے آغوش میں
لے کے پوچھا تھا، بیٹی
یہاں کیوں کھڑی رو رہی ہو
مجھے اپنے بوسیدہ آنچل میں پھولوں کے گہنے دکھا کر
وہ کہنے لگی
مرا ساتھی ادھر، اس نے اپنی انگلی اٹھا کر بتایا، ادھر
اس طرف ہی
جدھر اونچے محلوں کے گنبد، ملوں کی سیہ چمنیاں، آسماں
کی طرف سر اٹھائے کھڑی ہیں
یہ کہہ کر گیا ہے کہ میں سونے چاندی کے گہنے ترے
واسطے لینے جاتا ہوں

اختر الایمان اپنے مخصوص استعاراتی وعلاماتی انداز میں بڑے سے بڑے مضمون کو بہ آسانی قلم بند کر جاتے ہیں۔ زبان شستہ رفتہ اور برجستہ ہے جو قاری کی توجہ کو بہا لے جاتی ہے۔

اور ذہن میں لطف و انبساط کا ایک جہان پیدا کر دیتی ہے اختر الایمان کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ وہ لطیف جذبات اور بلند خیالات پر صوتی آہنگ کو حاوی نہیں ہونے دینا چاہتے اور نہ ہی جذبات و احساسات کو موسیقیت سے لبریز کر کے تصورات کو ابھارنے کا کام کرتے ہیں۔ طرزِ بیان کی سادگی اور احساس کے فطری پن اور صوتی آہنگ میں گھلی ملی ہلکی موسیقیت ان کی نظم کا حسن دوبالا کر دیتی ہے جو تاثرات میں اضافہ کا سبب بنتی ہے وہ نظم کے آرائشی پہلو کو ملحوظ نہ رکھتے ہوئے تعمیری پہلو پر توجہ صرف کرتے ہیں اور انھوں نے اردو نظم کو جدید نظم کی ہیئت سے روشناس کرایا۔ اردو کی نئی نظم کے وہ آخری بڑے شاعر ہیں۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ فرسودہ خیال اور فرسودہ شعری عناصر سے کلام کو پاک رکھا۔ اور بنے بنائے سانچے میں ڈھالنے اور فنی لوازمات سے گراں بار بنانے کے بجائے توانا علامات کا استعمال کرتے ہیں۔ اختر الایمان نے لکھا ہے کہ وہ نظم میں علامت نگاری پر اصرار کرتے ہیں۔ چنانچہ اپنی نظم ''قلوپطرہ'' کی مثال سے اس کی وضاحت بھی کی ہے۔ ان کی نظموں میں ''ایک لڑکا'' ''مسجد'' اور گرداب میں رمزیہ، اشارتی اسلوب موضوعات سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں

اختر الایمان کی شاعری روایتوں کی امین بھی ہے۔ قدیم انداز کی شاعری کی مانند انکے کلام میں بھی درد و غم اور رنج و الم خوب نظر آتے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ غم انکی زندگی کے لئے بوجھ نہیں بلکہ بیش قیمت سرمایہ ہے۔ جن سے دوچار ہو کر عارضی طور پر ضرور افسردگی کا احساس ہوتا ہے لیکن اس سے پیدا ہونے والی مایوسی اور بیزاری دیرپا نہیں ہوتی۔ جو راہِ فرار یا بے عملی کی راہ اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے، ان کا غم زندگی کو اجیرن نہیں بناتا، اسے مفلس کی قبا نہیں سمجھتا۔ جس میں ہر گھڑی درد کا احساس رہتا ہے۔ نیا آہنگ کے پیشِ لفظ میں رقم طراز ہیں کہ ''میری شاعری کیا ہے؟ اگر ایک جملے میں کہنا چاہیں تو میں اسے انسان کی روح کا کرب کہوں گا یہ کرب مختلف اوقات میں محرکات کے تحت الگ الگ لفظوں میں ظاہر ہوتا ہے۔''

ادھر سے نہ جاؤ
کوئی راہ میں روک لے گا

نیا کوئی خطرہ نیا مسئلہ کوئی جس کو
نہ سوچا نہ سمجھا نہ احساس ہے جس کا اب تک
کوئی ایسی صورت نکالو
یہ سب آفتیں اپنا دامن نہ پکڑیں
کوئی اور راہِ فرار ایسی ڈھونڈوں
کہ ہم زندگی کے جہنم کو جنت سمجھ لیں!

اختر الایمان کے نزدیک شاعری کا اہم مقصد انسان کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرنا بھی ہے، وہ زندگی میں پیدا ہو جانے والی بدعنوانی اور بدصورتی کی جانب انگشت نمائی کرتے اور روز بروز بڑھتی ہوئی اخلاقی قدروں کے زوال کا ماتم بھی پرزور انداز میں کرتے ہیں یا انسان کے اندر بنیادی معصومیت کی موت کو رونا، شاعری انسان کے ہر قسم کے خیالات کی ترویج کا آلہ کار بنتی ہے۔ اور ہر شاعر کا اپنا زمان و مکان ہوتا ہے جس کی نمائندگی وہ اپنا فریضہ سمجھ کر کرتا ہے۔ اختر الایمان کی شاعری کا اہم پہلو گزراں وقت کی سفاکی کا احساس ہے انھوں نے وقت کی ہمیشگی کے ساتھ ساتھ وقت کا ہر زمانے میں ادراک کیا ہے۔

اس التہاب میں اس سرگیں اجالے میں
سوا تمہارے مجھے کچھ نظر نہیں آتا
ہر ایک لمحہ گریزاں ہے جیسے دشمن ہے
نہ تم ملوگی نہ میں، ہم بھی دونوں لمحے ہیں
وہ لمحے جا کے جو واپس کبھی نہیں آتے

وقت رواں دواں ہے اور ماضی کو حال اور حال کو مستقبل سے منسلک کرتا رہتا ہے۔ اور ہر کو نقش بر آب ثابت کرتا رہتا ہے۔ عزت، عظمت، جاہ و جلال اور اقتدار کے قصوں کو گزرے وقت کی داستان بناتا رہتا ہے اس خیال کا سب سے موثر اور توانا اظہار ان کی دو خوبصورت نظمیں مسجد اور پرانی فصیل میں ہوا ہے۔ مسجد جو ایمان کی حرارت اور یقین کی روشنی کا استعارہ ہے

اور جس کے ساتھ فضاؤں میں اذان کی گونج اور صحن میں نمازیوں کی صفیں جس کی پہچان ہیں بدلتے وقت کے دھارے نے اس کی ہیئت بھی تبدیل کر دی اور اسے سامانِ عبرت بنا دیا۔

ایک ویران سی مسجد کا شکستہ سا عکس
پاس بہتی ہوئی ندی کو تکا کرتا ہے
اور ٹوٹی ہوئی دیوار پہ چنڈول کوئی
گیت پھیکا سا کوئی چھیڑ دیا کرتا ہے

وقت کے جبر کے سائے مسجد کی پامالی اس سے زیادہ اور کیا ہوگی ایمان و یقین کی یہ سب نشانیاں داستانِ پارینہ بن چکی ہیں اب یہاں صاحبِ افلاک کے پیغام و سلام آتے ہیں نہ صدائے جبریل سنائی دیتی ہے نہ ہی کسی کعبہ کی بنیاد پڑنے کا امکان ہے غور کیجیے کہ مسجد کی پامالی دیکھ کر افسوس صرف عظمتِ پارینہ کے منہدم ہو جانے کا ہی نہیں بلکہ ایمان و یقین اور عقیدہ کی روشنی کے گم ہو جانے کا بھی افسوس ہے۔ صدائے جبریل، صاحبِ افلاک کے پیغام و سلام، آوازِ خلیل اور کعبہ کی بنیاد جس کے استعارے ہیں اور حال کی ویرانی جس کا انجام انسانی کاوشوں کا مظہر وقت کی زد میں ہے۔

اختر الایمان کی شاعری بیسویں صدی کی مشینی دنیا اور انسان کے درمیانی رشتے کی کہانی ہے۔ ہندوستانی عوام کے سینوں کی دھڑکن، گاؤں کے لہلہاتے کھیت، بل کھاتی ندیاں اور ٹیڑھی ترچھی پگڈنڈیاں جن سے راہیں تلاش کر کے مشینوں کی دنیا میں قدم رکھا ہے۔ دھواں اگلتی مشینوں کی آواز میں سادہ اور معصوم انسان کی محبت مجروح ہوئی ہے اور فطرت سے رشتہ کمزور ہو گیا ہے۔ ان تمام خیالات کو سمیٹ کر انھوں نے نظم ''ایک لڑکا'' تخلیق کی ہے اس نظم کو مکمل کرنے میں انھیں کم و بیش بیس سال لگے تھے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ جس پینسل سے نظم شروع کیا کرتے تھے اسی سے مکمل کیا کرتے تھے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کبھی آموں کے باغوں میں کبھی کھیتوں کی مینڈوں پر
کبھی جھیلوں کے پانی میں کبھی بستی کی گلیوں میں

تعاقب میں کبھی گم تتلیوں کے سونی راہوں میں
یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو

جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مر چکا ظالم
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اس کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں
یہ لڑکا مسکراتا ہے یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب وافترا ہے جھوٹ ہے دیکھو میں زندہ ہوں

اختر الایمان کی نظمیں اعلیٰ اقدار، دردمندی، انسانی محبت کی حرارت اور گدازِ قلب میں ڈوبی ہوئی ہیں ان کا شعری مجموعہ بعنوان ''یادیں'' ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا جس پر انھیں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ایک منظوم ڈرامہ ''سب رنگ'' ۱۹۴۸ میں منظرِ عام پر آیا۔ اور آخری شعری مجموعہ ''زمستانِ سرد مہری کا'' انتقال کے بعد شائع کرایا گیا۔ ایک زمانے میں انھیں افسانہ نگاری سے بھی شگف پیدا ہوا۔ چنانچہ اس فکشن نویس نے ہمراز، ضمیر،، آدمی اور وقت سمیت متعدد کہانیاں لکھیں جن پر فلمیں بنیں اور مقبول بھی ہوئیں۔

''جن کے گھر شیشے کے ہوتے ہیں وہ دوسروں پر پتھر نہیں پھینکتے'' ایسے بیش قیمت مکالموں سے بالی وڈ کی فلمی زبان کو بامعنی اور بامحاورہ تشبیہات سے مالامال کرنے والے شاعر اختر الایمان ہی ہیں وہ کہانیاں اور مکالمے بہت عمدہ لکھتے تھے۔ ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ فلمی دنیا سے وابستہ رہا۔ اسی شعبہ میں خدمات انجام دیتے رہے بالآخر ۱۹۹۵ء میں ممبئی میں جہانِ فانی کو خیرباد کہہ کر اپنے نقش چھوڑ گئے۔

رابطہ: 09634191717

وہ لڑکا اب بھی زندہ ہے

(اختر الایمان کو خراج عقیدت)

جلیس نجیب آبادی

وہ لڑکا جس نے پتھر گڑھ کی دیواروں کے سائے میں
کسی ٹوٹے ہوئے چھپّر میں ایک دن آنکھیں کھولی تھیں
وہ شاعر ہجرتوں پر ہجرتیں جس کا مقدر تھا
وہ لڑکا نامور اردو کا بیٹا، نامور شاعر
جو غالب کی طرح دھارے کی الٹی سمت بہتا تھا
معیشت دوسروں کے ہاتھ میں تھی، اس کے حصے میں
جز اک ذہن رسا کچھ بھی نہیں تھا" اس کا کہنا تھا
"خروش عمر کے انجام تک اک بوجھ اٹھانا ہے
عناصر منتشر ہو جانے، نبضیں ڈوب جانے تک
نوائے صبح ہو یا نالۂ شب کچھ بھی گانا ہے"

اور اس شاعر نے جو کچھ بھی کہا تھا کر دکھایا ہے

ہمارے عہد کے نقاد، قاری اور دانشور
اسے اس عہد کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے ہیں

وہ لڑکا جس کا دل چراغ کے نشتر سے زخمی تھا

اسی دل سے جواں بیٹی کو بیوہ ہوتے دیکھا تھا

وہ لڑکا کشتی اردو کا مانجھی، اختر الایمان

مسلسل رت جگوں سے تھک چکا تھا سو گیا

اور اس کی موت پر اہل زباں آنسو بہاتے ہیں

میری آنکھوں میں بھی آنسو ہیں لیکن دل یہ کہتا ہے

ہماری شاعری کی آبرو ہے جس کا فرمودہ

وہ شاعر تھک کے سو سکتا ہے لیکن مر نہیں سکتا

ا ''قلوپطرہ، جواری، اتفاق، عہد وفا، مسجد،

قیامت، میر ناصر، باز آمد، جنگ تبدیلی،

محبت، ایک لڑکا، دور کی آواز، پگڈنڈی،

جمود، عمر گریزاں.........، داشتا.........، تاریک سیارہ''ا

کئی بے جوڑ نظمیں، نثر پارے، اور دیباچے

جو یہ شاہکار زندہ ہیں تو وہ لڑکا بھی زندہ ہے

....

ا۔ نظموں کے عنوان

محمد عرفان نگینوی: شاعر ادیب اور نقّاد

اردو کے مشہور شاعر، ادیب، نقاد محمد عرفان کو اردو دنیا کے لوگ عرفان رومانی، عرفان صدیقی، محمد عرفان نگینوی، پروفیسر عرفان جیسے کئی الگ الگ ناموں سے جانتے ہیں۔28 جون 1938ء کو نگینہ کے علمی گھرانے میں پیدا ہوئے محمد عرفان کی ابتدائی تعلیم نگینہ میں ہوئی اور نگینہ کے بعد دہلی سے تعلیم مکمل کر اسلامیہ کالج بریلی میں درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہو گئے۔ اسلامیہ کالج میں محمد عرفان انگریزی کے استاد کی حیثیت سے جانے جاتے تھے اور ادبی حلقوں میں اردو داں کی شکل میں پہچانے جاتے ہیں۔ نثر میں محمد عرفان کی طرزِ غالب، جوش ملیح آبادی کا نفسیاتی ولفظیاتی مطالعہ، صدائے جبریل اور ''میرا نقطۂ نظر'' تصانیف ہیں۔ نظم میں دسترس، احتساب، انشیٰ یا رسول اللہ ان کے مجموعہ کلام ہیں۔ یو پی اور بہار اردو اکادمی سے اعزاز یافتہ محمد عرفان کی شاعری و نثری تخلیقات بین الاقوامی سطح کی ہیں جس کی تصدیق اردو کے تمام بڑے ادیبوں نے کی ہے ٹی وی، ریڈیو پر اکثر اردو ادب پر معیاری گفتگو کرتے دیکھے اور سنے جاتے ہیں۔ سیمناروں میں ان کے مقالے اور محفلوں میں ان کی گفتگو توجہ کا باعث بنتی ہے۔ ان کا نمونۂ کلام۔

ہے کاروانِ ادب کا یہ انتخاب بھی خوب
کوئی ہے مشرق و مغرب کوئی شمال و جنوب

ڈاکٹر شیخ نگینوی

قرۃ العین حیدر
اپنے عنوانات کے آئینے میں

محمد عرفان نگینوی

اردو زبان وادب کے اس امتحان و آزمائش کے تکلیف دہ دور میں بھی جو ادارے ہماری تہذیب و ثقافت کو محفوظ رکھنے بلکہ نئی زندگی دینے کے لئے کوشاں ہیں ان میں ضلع بجنور کا ایک حوصلہ مند ادارہ "مشعلِ راہ" زبردست اور نا قابل فراموش خدمات انجام دیتا نظر آرہا ہے۔ راقم الحروف کی طرف سے ادارۂ "مشعلِ راہ" کے اراکین عموماً اور ان کے جنرل سکریٹری جناب اقبال احمد صدیقی اور مدیر جناب شہزاد تمکنت خصوصاً قابل مبارکباد ہیں۔ مشعل راہ ایک ادبی و کلچرل فورم ہے جس نے دو سال کے مختصر ترین عرصہ میں ایک بہترین لائبریری بھی قائم کر لی ہے اور اس لائبریری کے افتتاح کے موقعہ پر ایک یادگار مجلّہ شائع کر رہا ہے۔ میں تہہ دل سے بارگاہِ رب العزت میں ادارۂ مذکور کے اغراض و مقاصد کی کامیابی کے لیے دست بدعا ہوں۔

ضلع بجنور ہندوستان کی تاریخ میں ادبی و سیاسی نقطۂ نظر سے ایک بلند مقام رکھتا ہے۔ آسمان سیاست کے آفتاب، عزت مآب جناب حافظ محمد ابراہیم صاحب، سابق وزیر صوبۂ یوپی و وزیر کابینہ ہند اور گورنر پنجاب، نگینہ ضلع بجنور کے متوطن تھے۔ ضلع بجنور میں ایک اور مردم خیز خطّہ، قصبہ نہٹور اس کے قرب و جوار تک پھیلا ہوا ہے۔ ساداتِ نہٹور میں بڑے اولوالعزم ادیب اور اہل قلم پیدا ہوئے جن میں سجاد حیدر یلدرم اور ان کی صاحبزادی قرۃ العین حیدر نے ابدالآباد کے لئے شہرت پائی ہے۔

قرۃ العین حیدر ایک صاحبِ طرز ناول نگار ہیں جن کے ناولوں کی فہرست طویل تو نہیں لیکن وقیع ضرور ہے۔ ان کے ناولوں میں جو چند ناول شہرۂ آفاق کہلائے ان میں

۱۔ سفینۂ دل

۲۔ میرے بھی صنم خانے میں

۳۔ آخرِ شب کے ہم سفر

۴۔ کارِ جہاں دراز ہے

۵۔ آگ کا دریا

نہایت اہم اور قابلِ ذکر ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی یہ وہ تخلیقیں ہیں۔ جنھوں نے اُردو ناول میں نئی جہتوں اور نئی سمتوں کا اضافہ کیا۔ قرۃ العین حیدر نے اُردو کو جن امکانات و تجربات، جس جدّت و انفرادیت اور جس تعمیق و وسعت سے آشنا کرایا وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

تکنیکی طور پر اردو ناول نگاری میں عرصۂ دراز سے ایک خلاء چلا آ رہا تھا اس خلاء کو پُر کرنے کا اعزاز قرۃ العین حیدر ہی کو پہنچتا ہے، یوروپین ناول نگاری میں علم نفسیات کی ترقی کے زیر اثر ناول نگاری کی ایک نئی تکنیک کا آغاز ہوا جس کو انگیزی میں "اسٹریم آف کانشنس" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اُردو میں جس کا ترجمہ "شعور کی رو" کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس میں مشہور ماہر نفسیات فرائڈ، ینگ، ایڈلر وغیرہ کی نفسیاتی دریافتوں اور تجربوں کا اثر کارفرما نظر آتا ہے۔ ان حالات کے زیر اثر ایک نئی ادبی فضا قائم ہوئی جس میں پہلا اقدام ایک یوروپین خاتون "ڈوروتھی رچرڈسن" کے نام جاتا ہے جن کی اولیت کو ایک دوسری خاتون ناول نگار "ورجینیا وولف" نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ مردوں میں شعور کی رو تکنیک کا سب سے مکمل استعمال "جیمس جوائس" نے کیا لیکن ایک طرح سے اس نفسیاتی اندازِ تحریر کی بنیاد اس سب سے بہت پہلے "لارنس اسٹرن" کے یہاں پائی جاتی ہے۔ اُردو میں اس تکنیک کو معراج کمال تک پہنچانے کا اعزاز قرۃ العین حیدر کو پہنچتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری ایک پوری لائبریری کی متقاضی ہے۔ ان کے ناولوں پر نام بنام تحقیق و تفصیل سے لکھنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ اور ان کی ناول نگاری کے گرداگرد نقد و نظر

کا ایک مفید ترین ذخیرہ پہلے ہی جمع ہو چکا ہے۔ البتہ قرۃ العین حیدر کے ناولوں کے عنوانات کی استعاریت و اشاریت کا موضوع ابھی بہت تشنہ ہے۔ اگر چہ ان کے ناولوں کے عنوانات کے ماخذ کی نشاندہی کی جا چکی ہے۔ اس پر بھی ان کے شہرہ آفاق ناول ''آگ کا دریا'' کا عنوان مزید تحقیق کا مستحق ہے۔

قرۃ العین حیدر ایک ایسی ناول نگار ہیں جنھوں نے اپنے ناولوں کے لئے بیشتر عنوانات شعر و سخن سے اخز کئے ہیں۔ مثلاً فیضؔ کا یہ خوبصورت شعر۔

آخر شب کے ہم سفر فیضؔ نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی

یا اقبالؔ کا یہ شعر۔

باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

اسی طرح ''سفینۂ دل'' اور میری بھی صنم خانے'' دنیائے شعر و ادب سے ماخوذ ہیں، اور نقد و نظر ان تمام ماخذ سے بخوبی آشنا بھی ہیں لیکن قرۃ العین حیدر کا شہرۂ آفاق ناول ''آگ کا دریا'' اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے اگر چہ یہ عنوان یعنی آگ کا دریا ذہن کو اُردو کے اس مشہور شعر کی طرف مبذول کرتا ہے۔

یہ عشق نہیں آساں، اتنا ہی سمجھ لیجئے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

لیکن یہ شعر ناول ''آگ کا دریا'' کے عنوان کا ماخذ نہیں ہے بلکہ اس عنوان کا ماخذ کوئی مخصوص اور متعین طور پر ہے ہی نہیں۔ کیوں کہ اس عنوان کے پس منظر کا پھیلاؤ شعور کی رو کی تکنیک کی زمین سے لے کر فلسفہ الٰہیات کے آسمانوں تک پھیلا ہوا ہے۔ جس کے درمیان میں کتنی ہی متعدد اور کڑیاں بھی ہیں۔ جو اس زمین کو ان آسمانوں سے جوڑتی ہیں۔

تکنیکی سطح پر آگ کا دریا ناول کے عنوان کی حیثیت سے اس شعور کی رو کی طرف اشارہ

کرتا ہے جس کے میڈیم میں اس عظیم ناول کی تخلیق ہوئی ہے۔ لیکن اس عنوان کے معنوی تانے بانے یہیں پر ختم نہیں ہو جاتے جیسا کہ اگلی تفصیل سے معلوم ہو جائے گا۔ مندرجہ بالا شعر ناول کے عنوان کا ماخذ اس لئے نہیں ہے کیونکہ قرۃ العین حیدر کے ناول کا مرکزی خیال عشق نہیں بلکہ وقت ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر شمع افروز زیدی کا قول ہے کہ۔

''آگ کا دریا کا مرکزی کردار وقت ہے لوگ بدل جاتے ہیں وقت نہیں۔ بدلتا، وہ رواں تھا اور رواں ہی رہتا ہے''۔

جناب ماجد کلیم صاحب ناول ''آگ کا دریا'' پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ۔

''اس ناول میں وقت کا یہ تسلسل کرب کے لمحوں سے مرتب ہے۔ دریا وقت کی علامت ہے جو تباہ کن ہے اور قائم بھی رہتا ہے۔ یہ دریا آگ کا دریا اس لیے ہے کہ وقت سے مفر نہیں اور وقت کا ہر لمحہ کرب کا لمحہ ہے''۔

یعنی زندگیاں موت کے گھاٹ اترتی رہتی ہیں لیکن وقت کی تلوار اپنی جگہ قائم رہتی ہے اس لئے ''جبر صادق' میں فرمایا گیا ہے ''اَلوقت سیفٌ'' یعنی وقت ایک تلوار ہے۔ اس میں وقت کی تباہ کن صلاحیت اور اپنے آپ میں قائم رہنے کی حیثیت بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ مصنفہ محترم کی نظر ان حوالوں تک یا ان تک جو آگے آئیں گے پہنچ سکی ہے یا نہیں لیکن جس کی نظر میں آگ کا دریا کے عنوان سے اشارات وعلامات ابھرتے ہیں وہ شخص آگ کے دریا کے متن کو ان اشارات وعلامات کے سیاق وسباق میں دیکھنے پر مجبور ہے۔ اور ان علامات واشارات کو ذہن میں رکھ کر ناول میں جو تہہ داری ایک صاحب نظر کو محسوس ہوتی ہے وہ ان کی غیر موجودگی میں ایک خلاء پیدا کرتی نظر آتی ہے۔

وقت کی تباہ کن حرکات وحادثات کا حوالہ شیکسپیئر نے اپنے ایک سانیٹ کے خوبصورت پیکر میں پیش کیا ہے۔ وقت کی تباہ کن خصوصیت کے بعد اس کے تسلسل کا نمبر آتا ہے تو یہاں پر ہم مشہور فلاسفر برگ ساں کے فلسفۂ امتداد واستمرار زماں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جس میں وقت کے تسلسل وتواتر کو اس قدر پُر اثر انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ شاعر مشرق علامہ اقبال بھی اس سے

متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ وقت کو زندگی کا زمان و مکان تصور کرتے ہوئے شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ اس تسلسل و تواتر کے لئے بحرِ بیکراں، جاوداں، رواں دواں جیسے مترادفات استعمال کرتے ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

دمادم رواں ہے یمِ زندگی

(بالِ جبریل)

یعنی زندگی کا سیلاب ہمہ وقت رواں دواں رہتا ہے۔

دوسری جگہ مثنوی اسرار و موز میں فرماتے ہیں۔

این و آں پیدا ست از رفتارِ وقت
زندگی سرّ یست از اسرارِ وقت
اصلِ وقت از گردش خورشید نیست
وقت جاوید ست و خود جاوید نیست

یعنی وقت مجموعۂ راز ہے زندگی اسی کا ایک عشرِ عشیر ہے۔ وقت امروز و فردا کا نام نہیں جن کی آمد و شد طلوع و غروبِ آفتاب کی مرہون منت ہوتی ہے۔ بلکہ وقت بذاتِ خود ایک زندہ جاوید شے ہے باقی ہر شے عارضی ہے۔

اسی طرح انگریزی کا ایک رومانی شاعر ایک دوسرے موقعہ پر عارضیت و تواتر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''نسلِ انسانی تو آنی جانی ہے لیکن دریا کا تواتر و تسلسل خلل سے بے نیاز ہے''

یہاں تک ہم نے اس پر تبصرہ کیا کہ وقت کو دریا کیونکر کہا جاسکتا ہے۔ اب ہم لفظ ''آگ کا دریا'' کی ترکیب کے ماٰخذ پر غور کرتے ہیں اور اس کے کرب و اذیت پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔

آگ کا رقیق تصور ہمیں مشرقی ادب کی مشہور اصطلاح ''آتش سیال'' میں بھی ملتا ہے۔ اسی آتش سیال کا پیمانہ اگر لبریز ہو جائے تو وہی آگ کا دریا بن جاتا ہے۔ آگ کے دریا کا ایک معتبر تصور ہمیں ملٹن کی نظم ''فردوسِ گم شدہ'' میں بھی ملتا ہے۔ جہاں ابلیس کو آگ کے سیلاب رواں و

تلاطم آتشِ فشاں سے متصادم پیش کیا گیا ہے۔ اور ابلیس اور اس کے پرستاروں کو کرب واذیت کی ہمیشگی سے دوچار دکھلایا گیا ہے۔ یہ ہے ناول کے عنوان آگ کا دریا کا پس منظر جس میں وقت کو مرکزی کردار مان کر اسے دریا کے کرب واذیت کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ کیونکہ ناول کے شخصی کرداروں کو کرب واذیت، کشش و کشمکش، تصادم وتلاطم کی ایک مسلسل اور لامتناہی کیفیت کا شکار دکھلایا گیا ہے۔

ہمارے عام تصور کے مطابق کسی ناول کے کردار غیر شخصی نہیں ہوا کرتے جبکہ آگ کا دریا کا مرکزی کردار وقت ہے تو کیا اس جدت کا پس منظر بھی کسی روایت میں ملتا ہے یا نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ قرۃ العین حیدر کی یہ جدت بھی خلاء کی پیداوار نہیں ہے بلکہ صدیوں قبل یونانی واطالوی کلاسیکی ڈراموں میں تقدیر یا مشیت کو مرکزی کردار کر کے پیش کیا گیا ہے۔ جس روایت کو کچھ ردّوبدل کے ساتھ شیکسپیئر نے بھی برتا۔ آگے چل کر انگریزی کے مشہور ناول نگار تھامس ہارڈی نے اپنے یہاں کہیں تقدیر کہیں مشیت کہیں موسم اور کہیں ماحول کو کبھی پس منظر میں اور کبھی مرکزی کردار کر کے دکھایا ہے۔ اس طرح ''آگ کا دریا'' اپنے عنوان کی تہہ داری کی طرح ایک نہایت ہی گیرائی اور گہرائی والا ناول ہے۔ جس میں بصارت وبصیرت کے ساتھ معانی کی پرتیں یکے بعد دیگرے کھلتی چلی جاتی ہیں۔ اور ناول نگار کو جدّت اسلوب اور عظمتِ تصور کی عظیم بنیاد پر دورِ حاضر کا عظیم ترین ناول نگار کر کے پیش کرتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کو شاید اپنی ایک ہم نام شاعرہ قرۃ العین طاہرہ کے ساتھ ایک ٹیلی پیتھی یعنی روحانی لگاؤ نظر آتا ہے اس کا ایک مشہور مصرعہ ہے۔

دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم چشمہ بہ چشمہ جو بہ جو

قرۃ العین حیدر کے عنوانات چوں کہ اپنے اندر علامتیت واشاریت اور رمزیت و سرّیت لئے ہوئے ہیں اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے ناولوں کے متن کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ان کے ناولوں کے عنوانات میں پوشیدہ معانی کو بھی سمجھنا پڑے گا۔ جس کے بغیر قرۃ العین حیدر کی فکروفن کی عظمت سے لطف لینا ممکن نہیں۔

اس مقام پر آکر مجھے ایک دلچسپ شعر یاد آتا ہے جو اس طرح ہے۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

اگر ناول ''آگ کا دریا'' کی محترم تخلیق کار میری اس طویل خامہ فرسائی پر نگاہ ڈالیں تو شاید ان کو تھوڑا انتظار اور تھوڑا خلفشار پیدا ہوگا۔ کیونکہ ابھی تک جس امر واقعہ کا تذکرہ ہونا تھا وہ معرضِ اظہار میں نہیں آسکا لیکن اب آتا ہے۔

جارج برنارڈ شا (George Bernard shaw) کا ایک مشہور نیم تاریخی اور نیم تخلیقی ڈرامہ ہے جس کا عنوان ''سینٹ جون'' (St. John) ہے۔ جس میں فرانس کی مشہور نیم تاریخی، نیم افسانوی ہیروئن سینٹ جون کو سیاسی اغراض اور مذہبی مقاصد کی بنا پر ''دریائے آتش زار'' کے سپرد کر دیا گیا تھا۔

جارج برنارڈ شا کے اس ڈرامے کے باب آخر میں یعنی (Epilogue) نہ صرف یہ کہ اس آتش زار کو جس کے حوالے سینٹ جون کردی گئی تھی ایک ’آگ کا دریا'' کی صورت میں پیش کیا گیا ہے بلکہ صدیوں نظام الاوقات کو خواب اور شعور کی رو (Dream & stream of consciousness) کی تکنیک کے ذریعہ لمحوں اور دقیقوں کی علامت سے تحریر کیا گیا ہے اور یہ کل تکنیک بمع اپنے آتشیں عنوان کے قرۃ العین حیدر کے شہرۂ آفاق ناول ''آگ کا دریا'' کا آخری ماخذ نظر آتی ہے۔

اس گفتگو کی طغیانیوں میں بہتے بہتے ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جس کا سرا لوٹ کر پھر نقطۂ آغاز سے جا ملتا ہے اور وہ شعر جس کو ہم ناول کے ماخذ سے باہر سمجھتے تھے، وہ شعر تحقیق و تنقید کے مزید دریچوں پر دستک دیتا ہوا دلچسپ نشان دہانیاں کرنے لگتا ہے۔ شعر یہ تھا۔

یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

دیکھنا یہ ہے کہ اُردو شاعری میں ''آگ کا دریا'' بطور تصور کہاں سے در آیا ہوگا۔ اور ڈوب

کر تیر نکلنے کی کیا اہمیت ہوگی! اس پر غور وفکر کرتے کرتے اتفاقاً ہماری نگاہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے تذکرے کے ان صفحات پر پہنچ جاتی ہے جہاں وہ اپنی اوائلِ عمر کی طوفان شناسیوں کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''ایک طرف دریا سے عنانی کا ذوق وشوق دوسری طرف آگ کے شعلوں سے سیراب ہونے کی یہ تشنگی۔۔۔۔۔۔۔۔۔شاید یہ اس لئے ہو کہ اقلیم زندگی کی سطح پر پانی بہتا ہے۔ تہہ میں آگ بھڑکتی رہتی ہے۔

اسی لئے نکتہ سرایانِ حقیقت کو کہنا پڑا کہ۔

ہم سمندر باش، ہم ماہی کہ درا قلیمِ عشق
روئے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است''

یعنی بطور ترجمہ شاعر کہتا ہے کہ دنیائے عشق میں بسنے والے کو بیک وقت دوطرح کا مزاج پیدا کرنا ہوگا۔ پہلے تو 'سمندر' نام کے اس جانور کا جس کا آشیاں آگ کے شعلوں سے ہی مرتب ہوتا ہے اور دوسرا مچھلی کا کہ جو پانی سے دور زندہ رہ ہی نہیں سکتی۔ اس طرح سمندر بن کر دریائے عشق کی گہرائی میں شعلوں سے لو ہالینا اور سطح کی نرم سیر موجوں کا لطف اٹھانا، یہ دونوں کیفیات پیدا ہوں تب انسان صاحب عشق کہلا سکتا ہے۔

اب اس سے آگے اگر پرواز کی جاتی ہے تو جبریلِ تخیل کے بازوؤں کو جل اٹھنے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہیں پر قطعِ کلام۔

رابطہ:09359079968

شاعری کا ایک برگ آفتاب: جلیس نجیب آبادی

فنکار کا احساس عام لوگوں سے زیادہ شدید ہوتا ہے زندگی کے حسن سے اس کا تعلق زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے قدرت کے مناظر خدائے برتر کی تخلیق کردہ زندہ تصویریں، موسم، نغمی، مسرتیں، غرض جو کچھ وہ دیکھتا ہے، سنتا ہے اور محسوس کرتا ہے، اسے اپنے تجربے کا ایک حصہ بنالیتا ہے، پھر وہ کسی اور دنیا میں کھو جاتا ہے، یہی کیفیت اپنے اور دوسرں کے دکھ درد سے اس پر طاری ہوتی ہے اور یہ کرب آمیز لذتیں، خوشیاں اور غم اس کے اندرون میں کہیں گم ہو جاتی ہیں اور پھر اس کا قابل استعمال حصہ فنکار اپنے فن پاروں میں لوٹا دیتا ہے اور اس میں سے بھی وہ حصہ جس کی ''نمود خونِ جگر سے'' ہوتی ہے، معجزہ فن بن جاتا ہے۔

یہ چند الفاظ ضلع بجنور کے معروف ادیب وشاعر جلیس نجیب آبادی کی مکمل ترجمانی کرتے ہیں۔ جلیس نجیب آبادی کا اصل نام اسلام الدین ہے۔ ان کی پیدائش یکم جنوری 1947 کو نجیب آباد شہر میں سراج الدین صاحب کے یہاں ہوئی۔ جلیس نجیب آبادی نے ایم اے اردو تک تعلیم حاصل کی اور ٹیکس انسپکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ آپ نے نشتر خانقاہی سے تلمذ حاصل کیا۔

جلیس نجیب آبادی کی تصانیف (شعری مجموعے) شہرِ خیال، موسم، برگِ آفتاب، تذکرہ سیدنا یوسف (طویل نظم)، قحط اور بارشیں اور صبح کرنا شام کا ہیں۔ جلیس نجیب آبادی نے تنقید، شخصی، تاریخی، سوانحی مضامین، خاکے، ریڈیو فیچر وغیرہ تحریر کئے، جو مختلف ادبی جرائد اور کتابوں میں شائع ہوئے اور نشر ہوئے۔ جلیس نجیب آبادی کی نثری کاوشیں کتابی شکل میں ابھی زیرِ ترتیب

ہیں۔اردو کی ان شعری اور نثری خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے جلیس نجیب آبادی کو اردو اکیڈمی سے چار بار، بہار اردو اکیڈمی سے دوبار اور غیر سرکاری طور پر دس ادبی ایوارڈ مل چکے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی، مخمور سعیدی، پروفیسر عنوان چشتی، امجد اسلام امجد (پاکستان)، مظفر وارثی (پاکستان)، پروفیسر محمد حسن، ڈاکٹر تاراچندر ستوگی، مفتی عزیز الرحمٰن، مولوی عیسیٰ وغیرہ معروف ومشہور ادیبوں، شاعروں نے جلیس نجیب آبادی کے شعری مجموعوں پر اپنی رائے اور تاثر تحریر کئے ہیں۔

جلیس نجیب آبادی کا کلام پختہ کلام ہے جو ہندوپاک کے تمام معروف اخبار و میگزین میں قارئین کو پڑھنے کے لئے اکثر ملتا رہتا ہے۔جلیس صاحب کی نثر اور نظم کے دو نمونے اس کتاب میں شامل کئے جا رہے ہیں جو ان کی ادبی صلاحیتوں کا ثبوت ہیں۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی

نشتر خانقاہی

جلیس نجیب آبادی

نشتر خانقاہی کے سات شعری مجموعے منظرِ عام پر آئے ہیں۔ بڑی تعداد میں نظمیں اور غزلیں مختلف ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ میں نے اپنے کسی مضمون میں کہا تھا کہ ان کا ہر نیا مجموعہ بڑی حد تک سابقہ مجموعے سے مختلف ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے شاعر نے گذشتہ زاویۂ خیال اور موضوعات کو ذہن سے جھٹک دیا ہے۔ اور نیا طریقۂ اظہار اختیار کیا ہے، جس طرح انھوں نے روایت سے ہٹ کر شاعری کی ابتدا کی اسی طرح اپنے عہد کی دو اہم تحریکوں (ترقی پسندی اور جدیدیت) سے بھی وہ ایسے متاثر نہ ہوئے جیسے اور بہت سے۔ ان کا یہ عمل یہیں ختم نہیں ہو گیا بلکہ انھوں نے اپنے تخلیقی کارناموں کو فن کی معراج سمجھ کر ذہنی سفر ختم نہیں کیا اور خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رکھی۔ غالب کا ذکر کرتے ہوئے جس کو اختر الایمان ''دھارے کی مخالفت سمت میں بہنے کا عمل'' کہا ہے وہ نشتر خانقاہی کا بھی مرغوب عمل ہے۔

سید انوار حسین نشتر خانقاہی کی ولادت 1930ء میں بجنور کے نزدیک گاؤں جہان آباد میں ایک زمیندار گھرانے میں ہوئی تھی۔ نشتر خانقاہی کے لئے شاعری عبادت کا درجہ رکھتی تھی۔ شاعری ہی نہیں، ہر تخلیقی سرگرمی، لیکن یہ کسی خاص زاویہ یا سیاسی نقطۂ نظر کے تحت نہیں تھی خالص انسانی نقطۂ نظر سے۔ اپنے وقت کے آدمی اور اس کی زندگی کا مطالعہ کرنا ان کا مشغلہ تھا۔ آدمی کے اندر جھانکنا اور اس کی تہہ کو کھولنا نشتر خانقاہی کا کام تھا۔ اس کے تختۂ مشق پر وہ خود بھی ہوتے تھے اور دوسرے بھی۔ آدمی اس کی ذاتی، جنسی اور معاشرتی زندگی یعنی اس کو معاشرہ کے پس منظر میں رکھ کر سمجھنا اور

سست رفتاری سے ہونے والی تاریخی تبدیلی کے اثر کو نشتر خانقاہی نے نتائج اور تجربات کے تجزیے سے گزار کر ادبی تخلیق کی شکل دی ہے۔

نشتر خانقاہی نے 1948ء سے غزلیں اور نظمیں لکھنا شروع کیں جو ملک کی مختلف اخبار ورسائل میں شائع ہوئیں۔ ان کا پہلا مجموعہ ''میر لہو کی آگ'' 1974ء میں شائع ہوا اور وہ اردو کی ادبی دنیا میں قائم ہو گئے۔ نشتر خانقاہی نے تنہائی کی تکلیفوں اور ذاتی مطالعہ کے دائرے سے باہر نکل کر اپنے گرد و نواح اور نزدیک کے ماحول پر نظر ڈالی اور فن کے آئینہ پر معاشرے کے ان عکس کو پڑتے دیکھا، جو ان کے وقت میں تہذیب کے خاتمے اور بزرگوں کی تمدن کے نقش بن کر سامنے آئے تھے۔ نشتر نے اپنی شاعری میں ان تمام کڑوے تجربات کو بھی جگہ دی جن سے معاشرہ کا ایک حصہ خاموشی کے ساتھ گزر رہا تھا۔

دسترس، سرائے میں شام، شعرِ من، منظر پس منظر، معلوم نا معلوم، موم کی بیساکھیاں، غزل میں نے چھیڑی، پھر لہو روشن ہوا وغیرہ نشتر خانقاہی کے شعری مجموعے ہیں۔ شاعری آج بھی دلوں پر راج کرتی ہے اور کل بھی کرتی رہے گی، شرط یہ ہے کہ وہ شاعری ہو۔ نشتر خانقاہی کی نظر میں وہی شاعری اور شاعر قابل قدر ہیں، جو املا نہیں لیتے، بلکہ خود مختارانہ طور پر لکھتے ہیں اور آزادی کے ساتھ سوچتے ہیں۔ نشتر خانقاہی کی شاعری میں اگر ایک جانب سماجی اور اجتماعی زندگی کا عکس ہے تو دوسری طرف آدمی کی ذاتی زندگی اور اس کی ذاتی سرگرمیوں کو بھی جگہ ملی ہے۔

جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے ''میرے لہو کی آگ'' سے ''منظر پر منظر'' تک اس کے بعد بھی جو شے سب سے زیادہ ان کی شاعری میں نظر آتی ہے وہ ہے ''خوف'' یا ''دہشت ناکی'' خوف ان کی شاعری میں ہیئت بدل بدل کر سامنے آتا ہے۔ خوف ان کے یہاں کبھی اظہار کی سطح سے جھانکتا ہے، کبھی مناسب لفظوں کی چادر اوڑھ کر۔ واقعہ یہ ہے کہ نئے طرز ادا، قادر الکلامی اور قوت اظہار کے باوجود دیگر موضوعات کی طرح زندگی کی دہشت ناکی کو خود سے الگ نہیں کر پائے ہیں وہ ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب نشتر خانقاہی نے مجھے ایک ریڈیو انٹرویو میں دیا تھا اور جس کی کچھ تفصیل موصوف نے اپنے چوتھے شعری مجموعے ''منظر پس منظر'' کے دیباچے میں بیان کی

ہے۔علم نفسیات کا طالب علم ہونے کے ناطے میں ان کی شخصیت کی نہایت پیچیدہ گہرائیوں میں اور آگے جانا چاہتا تھا لیکن جب بھی ارادہ کیا کوئی نہ کوئی دوست یا شاگرد موجود ملا اور بات اگلی ملاقات تک ٹل گئی۔ دیوناگری رسم الخط میں خاکوں پر مشتمل ان کی کتاب ''کیسے کیسے لوگ ملے'' منظرِ عام پر آئی تو موصوف کا خود بھی ایک خاکہ ''انوار حسین بنام نشتر خانقاہی'' ملا جس کے مطالعہ سے مجھے بہت کچھ ملا اور خصوصاً ''خوف گرفت گی'' کی جڑوں تک میں بڑی حد تک پہنچ گیا''۔

مذکورہ دیباچہ اور خاکے سے جو اسباب وعلل سامنے آئے اس کا مختصر بیان یہ ہے۔

''پیدائشی اور فطری طور پر ان کا غیر معمولی طور حساس ہونا ہندوستانی معاشرہ اور خصوصاً مسلم معاشرہ میں عمر کے اعتبار سے بڑوں کو اعزاز ومراعات ملنا اور چھوٹوں کی حق تلفی اور اس نظریے کے تناظر میں نشتر خانقاہی کے رجحانات اور صلاحیتوں کو سمجھنے کے بجائے اس فنِ شریف کو تضحیک کی نظر سے دیکھا جانا جس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے تھی۔(اگرچہ خانقاہی اپنے بزرگوں کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتے کیونکہ ان دنوں ثقہ مسلم گھرانوں میں شاعری کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا) بچپن میں پولس اور زمینداروں کے تشدد جو انھوں نے دیکھے، جوانی میں باپ اور بڑے بھائی کا قتل ایسی بیماریاں جو لاعلاج قرار دی جا چکی ہیں.....اس کے علاوہ تقسیمِ وطن کے دیدہ وشنیدہ ہولناک مناظر، اپنے مولد جہاں آباد کے کھنڈر اور وہ تاریخی عمارتیں جن میں اب ابابیلوں کے مسکن ہیں اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ جو ان کے لاشعور میں یقیناً موجود ہے۔

لیکن یہ سب تو دوسرے بچوں اور بڑوں نے بھی دیکھا ہوگا اور اس کا ردِ عمل شاید خوابوں کی شکل میں رونما ہو کر اپنی شدت کھو بیٹھا ہوگا یا گرد، ماہ وسال میں کھو گیا ہوگا یا کم سے کم دھندلا گیا ہوگا۔ظاہر ہے کہ نشتر خانقاہی جیسے حساس اور سچے شاعر کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ اس ردِ عمل کو ذہن سے جھٹک کر پھینک دیتے۔اس کا اظہار ان کی شاعری میں ناگزیر تھا۔اگر وہ ترقی پسند تحریک کے بستہ بردار ہوتے تو اپنی انقلابی نظموں میں ان حادثوں کو اپنے ڈھنگ سے پیش کر کے نہ صرف اپنے سیاسی فرائض کا بوجھ ہلکا کر لیتے بلکہ وقتی شہرت بھی کماتے ،نفرت کے اس اظہار سے شاید خوفِ گرفتگی سے بھی کچھ نجات تو مل ہی جاتی۔(میں نے نفرت کے ساتھ خوف کے احساس کا ذکر

اس لئے کیا کہ کچھ ماہرین نفسیات کے خیال میں جب ہم جس سے ڈرتے ہیں دراصل اس سے نفرت کرتے ہیں) خوف اردو شاعری میں نئی چیز نہیں ہے۔اس سے کم ہی شاعر بچ پائے ہوں گے۔

غالب کے یہاں تو بڑی شدت سے اس کا اظہار ہوا ہے۔ ؎

پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

اور جوشؔ ملیح آبادی کی نظم کے یہ دو مصرعے بھی دیکھئے۔ ؎

خود بہ خود کیوں بج رہے ہیں کان، کیسی رات ہے؟
پیچھے پیچھے آرہا ہے کون، یہ کیا بات ہے؟

دیگر شعرا کے حوالے طوالت کے خوف سے موقوف کرتا ہوں۔اب دیکھتے ہیں نشترؔ خانقاہی کے یہاں خوف گرفتگی دوسرے شعرأ سے کس طرح مختلف ہے۔ان کا ایک خوف تو مشاہدوں کی دین ہے۔ ؎

دم بخود تھے لوگ اپنے آپ سے سہمے ہوئے
گھر کے اندر عافیت کا ایک بھی گوشہ نہ تھا
بند دروازوں پہ اپنا سر پٹختی تھی ہوا
تنگ گلیوں سے نکلنے کا کوئی رستہ نہ تھا
تونے اے پت جھڑ کے موسم! وہ سماں دیکھا نہیں
گھر کو جب کاغذ کے گل بوٹے لیے جاتے تھے لوگ
بہت وقت نازک ہے
ایسے میں اب یہ نہ سوچو

اپنے جسموں کو بھی شاید کھو چکا ہے آدمی
راستے میں پھر رہے ہیں پیراہن بکھرے ہوئے

اگر یہ زمیں دوسری مرتبہ پھٹ پڑی تو ؟(کوئی اور موج)

دوسری طرح کا خوفِ گرفتگی ان کے ذاتی تجربوں کے ردِعمل کا نتیجہ لگتی ہے اور جس کا سلسلہ ان کے بچپن کے واقعات سے جاملتا ہے۔

ان جانے حادثات کا کھٹکا لگا رہا
نیند آرہی تھی رات مگر جاگتا رہا

بھولے سے کل جو آئینہ دیکھا تو ذہن میں
اک منہدم مکان کا نقشہ ابھر گیا

احساس عدم تحفظی کا اور رات
دیوار سے خوف اتر رہا ہے ، کیا ہوا ؟

خوف کا تیسرا پہلو مشاہدات اور تجربات کا ملا جلا ردِعمل ہے جو شاعر کے اندرون میں اتر کر ذاتی تجربہ میں ڈھل گیا ہے۔

میں کہ سرجن کی ٹیبل پر رکھا ہوا آج ایک جسم ہوں تجربہ گاہ میں
آج کی رات گذری تو یہ چارہ گر کل لگا دیں گے فائل میں لکھ کر مجھے

پناہ مانگتا ہوں ، اس جہنم سے جہاں
مرد و زن سانپ کے جوڑوں کی طرح
کرتے ہیں دن رات جماع
اور پھر عمر و صحت کے بدلے
اپنی اولاد کے مرنے کی دعا مانگتے ہیں
(حشر کے دن ایک مناجات)

اپنی آپ بیتی (خاکہ) میں خانقاہی نے اپنے گھر سے گنگا کی نزدیکی اور گنگا سے اپنا

فطری لگاؤ کا ذکر بڑی تفصیل اور والہانہ پن کے ساتھ کیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ مقدس گنگا کی قربتوں کا ان کی شخصیت کی تعمیر میں گہرا اثر ہے ۔(''مقدمہ شعر و شاعری'' میں حالؔی نے بھی کہیں آبِ رواں کو شاعری کے لئے نہایت مفید ہونا بیان کیا ہے) اس سے انکار کی کوئی وجہ نہیں لیکن ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ موصوف نے اپنے بچپن میں ساحلِ گنگا سے یا کم از کم اپنے مکان کی چھت سے گنگا کی طغیانی کے ایسے مناظر بھی دیکھے ہوں گے جن سے دل پر دہشت طاری ہوئی ہوگی۔ کیا پتہ کبھی یہ خیال آیا ہوگا کہ اس میں ڈوبنے والے کی کیا حالت ہوتی ہوگی پھر یہ خیال لاشعور میں کہیں گوشہ گیر ہو گیا ہو اور پھر اس نہایت اہم شعر کی تخلیق کا سبب بنا ہو۔

اس کی غرقابی کو مدت ہو گئی لیکن یہ کیا
رات اور تالاب سے باہر نکلنا ہاتھ کا

یہاں یہ شعر بھی ملاحظہ فرمائیں۔

اجتماعی خود کشی کا سانحہ تھا یا بھنور
چند لاشے دھار پر دریا کی بہتے آئے تھے

خوف کا یہ آسیب ایک لاعلاج بیماری کی طرح عمر کے ڈھلان تک پہنچ جانے پر بھی شاعر کے ساتھ سائے کی طرح لگا ہوا تھا۔ نشتؔر خانقاہی فطری شاعر ہیں اور بقول خود جہاں، جس وقت چاہیں ادب تخلیق کر سکتے تھے۔ مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ شاعری الہام کا ایک جز ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنی تخلیق کو خوبصورت بنانے کے لئے شدید محنت درکار ہوتی ہے۔ اور یہ فریضہ پوری دیانت داری کے ساتھ شاعر نے انجام دیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں ایسی شاعری ہمارے سامنے آئی جس کے بارے میں شاعرِ مشرق علامہ اقبال کا ارشاد ہے۔

معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر میں نے ان کے ایک ہی مجموعے ''دسترس'' سے الفاظ اور ترکیب کے یہ مٹھی بھر پیکر اٹھا لیے ہیں جو زیرِ نظر موضوع کی دلچسپی میں اضافہ کرتے ہیں نیز میرے مذکورہ بالا بیان کی تصدیق بھی ان سے ہوتی ہے۔

''سوزنِ انفاسِ جاں''، ''نہالِ بیزاری''، ''پسِ پشت کوہِ ندا''، ''مدارِ بوم سرِ شاخِ آرزو''، ''نانِ یقیں''، ''سنگ پوشی''، ''برگِ نقشِ پا''، ''ریگِ سیال''، ''غلافِ سنگ''، ''دیارِ غبارِ غفلت''، ''غمِ خود فراہمی''، ''زنجیرِ تعلق''، ''خود غفلتی''، ''چہرہ آسیب خوف''، ''نیم بالغ رات''، ''کم فرصتی''، ''بے رشتگی''، ''ساحلِ دریائے باد''، ''دھوپ کی دھجی''، ''فصلِ شب''، ''خود انتشاری''، ''مقراضِ روز و شب''، ''میزانِ خیال''، ''محاذِ جاں''، ''صراطِ ارضِ یقیں''، ''ارضِ مفارقت''، ''زخمِ بے صدا''، ''کمندِ دسترس''، ''شہرِ بے حبیب''، ''خیال کا بوسہ''، ''بے پایاں زبانوں کا جنگل''

یقین کیجئے میں نے دیگر شعری مجموعوں میں ایسے پیکروں کو تلاش ہی نہیں کیا اور یہ کام اس ریسرچ اسکالر کے لئے چھوڑ دیا ہے، جس کا نام ابھی سے کیا لیا جائے؟ ان میں اختراعی کون کون سی تراکیب ہیں اور اختیاری کون کون سی؟ اس وقت میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا اور نہ آپ کا زیادہ وقت لینا چاہتا ہوں۔ لیکن اس سے نشتر خانقاہی کے شعری سفر کی تفہیم میں کچھ نہ کچھ مدد تو ملے گی ہی ایسا میرا خیال ہے۔ یہ نشتر خانقاہی کی شاعری کے نہایت اہم اجزائے ترکیبی ہیں۔ ان اسباب کے ساتھ جب ان کی خوف گرفتگی شعر کا قالب اختیار کر لیتی ہے اور ارتقاق سے اگر ان کا قاری ذہین اور مخلص بھی ہے اور اس راہ میں ان کا بے لوث ہم سفر بھی تو یہ دہشت ناکی قاری کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور بہت دیرپا ثابت ہوتی ہے اور قاری کو اس حالت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس کے بارے میں ممتاز محقق، مفکر اور ناقد محمود ہاشمی نے کہا تھا۔

''ڈالی کی تصویروں اور بودلیر کی نظموں کی طرح نشتر خانقاہی کی شاعری بڑھتے ہوئے جس دہشت اور خوف کا احساس ہوتا ہے اس کی حقیقت کو سمجھنا آسان نہیں۔'' اس کیفیت کا تھوڑا بہت اندازہ کرنے کے لئے خصوصاً ایسے شعر قابلِ توجہ ہیں جو ہمیں خوف کے ان ریگ زاروں میں لے جاتے ہیں جہاں اندیشے، احساس، محرومیاں اور تنہائیاں آسیب بن کر سامنے آتے ہیں۔

مگر آج کیا ہے بھوتوں کے ڈر سے
بڑھاپے میں میرا بدن کانپتا ہے

(ذوق سفر کا انجام)

کہتے ہیں کہ اندیشہ ہے بے چہرہ و بے عکس
ہر کس کا دیوار سے اگتا ہے؟ کوئی ہے
آسیب بن گیا ہے اندھیرے کا خوف کیوں
کیوں دوپہر میں شمع جلائے ہوئے ہیں ہم
اور بڑھ جاتی تھی بازاروں کی رونق دِن ڈھلے
گھر کے سناٹے سے گھبرا کر نکل آتے تھے لوگ

دست و پا دھڑ سے الگ ہیں
گردنیں سر سے جدا
خون کی بہتی ندی کے اُس طرف
چل رہا ہے لاشۂ ردِ عمل

(منظر بے تاثر)

خوف کے یہ آسیب گھر کے باہر بھی ہیں، گھر کے اندر بھی ہیں......کہاں نہیں؟ یہ تو زہر غم کی طرح شاعر کے رگ و پے میں اتر چکے ہیں اور ان کی جڑیں تلاش کرنے کا مطلب خانقاہی کے لفظوں میں شاید یہی ہوگا۔

جتنا کھولا اون کا گولا اور الجھتا چلا گیا

گھر کو کنجِ عافیت وغیرہ نام دیے گئے ہیں، لیکن بقول غالب ''جو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں''۔ نشتر خانقاہی کے یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

کیا تحفظ دے سکے گی مجھ کو وضعِ احتیاط
کیا دریچہ موند لینے سے بلا رک جائے گی
چھتوں سے چپکی ہوئی بے صدا ابابیلیں
اندھیری رات میں خالی مکان مجھ سا تھا

کھڑکیاں مت کھول، جنسِ جاں اٹھا لے جائے گی
گھر کے گھر کو موت کا ریلا بہا لے جائے گی

ناچتی رہتی ہے پرچھائیں سی اک دیوار پر
دیکھتے رہتے ہیں ہم سائے کو سر ہوتے ہوئے

تمہیں بھی تنہائیوں میں اپنی شریک کرنا کہاں تھا ممکن
کہ سرد بستر پہ رات میرے بدن برہنہ پڑا رہا دن

اک سگِ آسیب ہیبت
ریڑھ کی بے گوشت ہڈی مری
رات دن گاڑے ہوئے دندانِ تیز
توڑتا ہے بند بند
(ایک نظم اپنے لئے)

جب شاعر کی حالت زبوں تر ہو جاتی ہے اور وہ اپنی رفیقِ حیات سے مخاطب ہوتا ہے تو کہتا ہے۔

نکل جانا مرے بس میں نہ تھا سوراخ سوزن سے
یہ دنیا مجھ کو دھاگے کی طرح بٹتی رہی ہے اے جاں

یہی زانو کا ایک تکیہ وبالِ جسم وبالِ جاں ٹھہرا
بہت سفاک نکلا کربِ تنہا بستری اے جاں

گھر کے باہر کے منظر شاعر کو کیا دیتے ہیں اور وہ پھر کس طرح انہیں خوبصورت پیکر عطا کرتا ہے، اس کے چند نمونے دیکھئے جن میں خوف بھی ہے عبرت بھی اور ایک سوالیہ نشان بھی کہ آخر اس کا مداوا کیا ہے؟۔

غلافِ سنگ میں لپٹا ہوا تھا شہر کا شہر
چلی ہوا تو زمیں سے غبار تک نہ اٹھا

ہمارے پاس ہماری نشانیاں بھی ہیں
ہوا نہیں تھا کسی عہد میں زیاں ایسا

کم سنی، کہنہ سالی کے انتم کنارے کو چھوتی ہوئی

وقت سے پہلے عمریں گزرنے کا منظر مرے سامنے

تھک کے بازار سے لوٹا ہوں تو گھر سامنے ہے

یعنی تنہائی کو اک اور خرابہ در پیش

یہ کس جگہ مجھے لے آئی ہے اڑا کے ہوا

سنبھل کے پانو جو رکھوں زمیں ڈرائے مجھے

ان داخلی اور خارجی عوامل کا ردِ عمل مستقبل کے بارے میں شاعر کو کیا سوچنے اور کیا کہنے پر مجبور کرتا ہے ملاحظہ ہو۔

گرد گماں میں ڈھل جاؤ گے آخر وہ دن آئے گا

رات میں جب بھی آنکھ کھلے گی اپنا جسم ٹٹولو گے

منحصر اُگلی ہوئی سانسوں پہ ہوگی زندگی

تیل کے چشمے رسدگاہ صبا ہو جائیں گے

سب نمک احساس کا، ساری حلاوت جسم کی

آنے والے دن کا ڈر، سارا مزہ لے جائے گا

شق کبھی ہوگا جو پردہ جان لیوا حبس کا

دوپہر میں لو چلے گی تو صبا کہلائے گی

یہاں یہ عرض کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ نشتر خانقاہی کی متذکرہ شاعری جب منظرِ عام پر آئی تو یار لوگوں نے خوف کے احساس کو ایسا اپنایا کہ ادبی رسائل اور اخبارات میں آسیبی غزلوں کی باڑھ سی آگئی اور بھوت پریت، آسیب، جن، ہم زاد، چڑیلیں، چھلاوے وغیرہ بیشتر شعرا کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس میں ایسے اشعار بھی تھے جو بہت پر اثر تھے، بہت اچھے تھے اور ایسی شاعری بھی تھی جسے پڑھ کر احساس ہوتا تھا کہ یہ خوف زدگی ارادۃً اپنائی گئی ہے اور حقیقی تجربہ کو اس میں بہت کم دخل ہے اور رفتہ رفتہ اس شاعری کا بڑا حصہ رسائل سے غائب ہو

گیااور اچھی شاعری کتب ورسائل میں اب بھی موجود ہے۔اور یہ کوئی معیوب بات نہ تھی، ایک تجربہ تھاجو کامیاب بھی رہااور ناکام بھی۔

نشتر خانقاہی کی شاعری کے مطالعے سے صاف نظر آتا ہے کہ ان کی تخلیق کردہ تصویریں زیادہ تر زندگی کے حقیقی خوفناک پہلوؤں کی عکاس ہیں خوفِ فنا کا ان سے زیادہ واسطہ نہیں ہے۔

کیا دے سکا وظیفۂ ردِ بلا مجھے

جاگا تو میرے ساتھ ہی جاگے وبال سب

مجھ کو دشمن فوج کے دستے ڈھونڈھ کے روز گزرتے ہیں

دونوں طرف ہے دشتِ ہوا کا ایک اکیلا رستہ مجھ میں

آج پھر کمرے کی چھت نیچے اتر آئی بہت

آج پھر نزدیک تر بستر سے دیواریں ہو گئیں

ایک کمندِ دسترس، یہ بے لہو گردن مری

اے ہمہ بے اختیاری اب خدا لکھنا مجھے

قدم قدم پہ یہ ڈر تھا کہ گھات میں ہے کوئی

یہاں تو ہائے تفکر بھی بے جھجک نہ اٹھا

ان گنت خواب مٹھی میں تھامے ہوئے رات بجلی کے تاروں پہ لٹکی رہی

زرد چہرے پہ کنگال آنکھیں لئے بند کمرے میں سورج سلگتا رہا

لمس کو ترستے ہیں سرد تار بجلی کے، دور ہے سوئچ مجھ سے بس مرا نہیں چلتا

رات اور اکیلا پن تنگ و تار کمرے میں قبر ہے کہ بستر ہے کچھ پتہ نہیں چلتا

سر بریدہ گھنی گھاس کے درمیاں وہ جو وادی ہے اس میں اترتے ہوئے

سر ابھارا تو دیکھا وہی حد نہیں ، وہی لو کے تھپیڑے وہی دھوپ ہے

نشتر خانقاہی کی شاعری پڑھنے کے بعد ایک ایسی شخصیت سے ملاقات ہوتی ہے، جو بہت حساس، انسانیت سے پیار کرنے والی، زندگی کی صداقتوں کو بےنقاب کرنے والی ہے، جس

کے لئے اپنے ماحول سے سمجھوتہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ جو انسان کی تذلیل ہوتی نہیں دیکھ پا رہی ہے ....وہ صرف دیکھ سکتا ہے محسوس کر سکتا ہے، احساسات کا شعری اظہار کر سکتا ہے (جسے ایک طریقۂ احتجاج بھی کہا جا سکتا ہے) لیکن وہ بھی ان ایماندار، مخلص اور سچے لیکن مجبور لوگوں میں سے ایک ہے جو نہ انتقام لے سکتے ہیں نہ حالات کو بدل سکتے ہیں۔ ویسے بھی شاعر کے حالات اور ماحول کو بدلتی نہیں، ہاں اس کام کے لئے اذہان ضرور تیار کرتی ہے اور جب نشتر خانقاہی جیسے فنکار حالات بدلنے یا حالات سے سمجھوتہ کرنے سے معذور ہو جاتے ہیں تو پھر ''قہرِ درویش بر جانِ درویش'' والا معاملہ پیش آتا ہے، جسے حضرت نشتر خانقاہی نے ''خودگزیدگی'' کا نام دیا۔

جنوں نہ کہیے اسے ،خود اذیتی کہیے
بدن تمام ہوا ہے لہو لہان مرا

رابطہ:09837401782

ذی وقار احمد

یہ نہ کوئی ادیب ہیں اور نہ شاعر ہی۔ ان کی پیدائش ۱۹۷۲ء میں مراد آباد کے ایک تاجر گھرانے میں ہوئی بچپن کی شرارتوں کی وجہ سے والد صاحب نے ان کو دہلی، جامعہ ملیہ اسلامیہ مڈل اسکول ہاسٹل میں داخل کرا دیا۔ ۱۹۹۴ء میں گریجویشن جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے کرنے کے بعد مراد آباد واپس آ گئے۔ اور اپنے والد صاحب کے ساتھ تجارت میں مشغول ہو گئے۔

علمی ادبی شوق کی وجہ سے کچھ نہ کچھ لکھتے پڑھتے رہتے ہیں۔ اور اسی ذوقِ طبع اور اردو دوستی نے انھیں اردو کی طباعت واشاعت کے کام سے وابستہ کر دیا۔ اردو ان کا محبوب ترین مضمون رہا ہے۔ اردو لکھنا پڑھنا اور لوگوں کی توجہ اس جانب مبذول کرانا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ اپنے لکھنے پڑھنے کے تمام نجی کام اردو زبان میں کرتے ہیں اور تمام سرکاری کام بھی نہایت اعتماد کے ساتھ اردو میں کرتے ہیں۔ اور اردو والوں کو ایسا کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

ذی وقار صاحب نہایت شریف الطبع انسان ہیں جو شخص ان سے ایک مرتبہ مل لیتا ہے وہ بار بار ملاقات کا مشتاق رہتا ہے۔ طبیعت کی سادگی ہر خاص وعام کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے۔ دیانت داری اور دوسروں کا احترام ان کی طبیعت کے ایسے اوصاف ہیں جو ان کا قد اور بھی بڑھا دیتے ہیں۔ ان کی شخصیت سے متاثر ہو میں نے ان سے ضلع بجنور کے حوالے سے کچھ لکھنے کی خواہش ظاہر کی تو انھوں نے معذرت طلب کی اور اپنی کم مائیگی کا اظہار کیا۔ لیکن میرا وہ اتنا احترام کرتے ہیں کہ مجھے مایوس نہیں کیا اور میری خوشی کے لیے ''رفعت سروش صاحب'' پر ایک مضمون تحریر کیا۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی

بجنور کا معروف شاعر: رفعت سروشؔ

ذی وقار احمد

نثر ہو یا نظم اپنے خالق کی شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے۔لہٰذا کسی تخلیق کار کی شخصیت کو پہچاننے جانچنے اور پرکھنے اور اس کی طبیعت سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے اس کی تخلیقات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء مخفیؔ کا ایک شعر ہے۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگِ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

یہاں مشہور شاعر رفعت سروش کو جاننے کے لیے ان کی شاعری اور کچھ اہم باتوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔کیونکہ وہ ایک بلند پایہ شاعر ہی نہیں ایک بہترین ناول نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، مضمون نگار، مترجم اور ریڈیو پروڈیوسر بھی رہے۔اپنی کتاب ''علم وادب کے روشن چراغ'' کے پیشِ لفظ میں لکھتے ہیں ''میں بنیادی طور پر شاعر ہوں مگر کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے''۔ چنانچہ ان کی وسیع وعریض کاوشوں اور طبیعت کے تمام اوصاف وکمالات کا احاطہ کرنا اس مختصر مقالہ میں ممکن نہیں ان کے کارناموں پر باقاعدہ سنجیدگی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اصل نام سید شوکت علی لیکن ادبی دنیا میں رفعت سروش کے نام سے مشہور ہیں۔ 2رجنوری 1926 کو نگینہ ضلع بجنور کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔شاعری کا شرر فطری طور پر طبیعت میں موجود تھا۔لہٰذا اپنی دلچسپی کے کاموں کو تلاش کرنا شروع کردیا۔اس سلسلہ میں ان کے بڑے بھائی اشتیاق علی ''شوق'' نے ان کی رہنمائی کی۔

ہم جس معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں وہ آج کن گوناں گوں حالات سے دوچار ہے۔ معاشرے میں رہ کر بھی انسان خود کو کس قدر تنہا، بے سہارا اور مجبور محسوس کر رہا ہے چنانچہ آدب معاشرے کا آئنہ ہوتا ہے اور ادیب اس کا نبض شناس۔ لہٰذا بہترین ادیب وہ ہے جو سماج کا سچا ترجمان ہو۔ ادب میں مثبت پہلوؤں کو اجاگر کرے زندہ اقدار کو جگہ دے مردہ دلوں کو جلائے ان میں احساس اور بیداری پیدا کرے، غفلت اور بے حسی کو دور کرے۔ اس کے افکار و خیالات سے ہر طبقہ، فرقہ اور جماعت مستفید ہو۔ رفعت سروش ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

''آج ہمارا معاشرہ جس ابتلاؑ کے دور سے گزر رہا ہے اور جس تشدد مذہبی عصبیت کا شکار ہے اور جہاں نفرت ہزار روپ میں پروان چڑھ رہی ہے۔ اس ماحول میں مبہم لب و لہجہ کے بجائے آج کے تخلیق کار کو سماجی مجرموں اور منافرت پیشہ سیاست دانوں اور قاتلانہ مزاج رکھنے والے صاحبانِ اقدار پر بھرپور وار کرنے کی ضرورت ہے۔''

رفعت سروش غیر جانب دار ذہن رہتے تھے۔ حقائق کا پردہ فاش کرنے میں وہ کسی مصلحت اندیشی سے کام نہیں لیتے تھے۔ اور بے خوف و خطر اپنی بات کو صاف صاف کہہ جاتے تھے۔ ایک نظم ''عجائب گھر'' میں کچھ اس طرح فرماتے ہیں۔

یہ ایک عجائب خانہ تاریخ ہے
آجکل اس پر مسلط ہے سیاسی مصلحت کا دیوزاد

عوام الناس کو راہِ فلاح دکھانے اور قعرِ مذلت سے باہر نکالنے، باہمی ایثار و صلہ رحمی کے اوصاف سے متصف کرنے، محبت، اخوت، رواداری سے ہم کنار کرنے ذہنوں میں وسعت پیدا کرنے اور تنگ نظری و تاریکی سے نجات پانے کے لیے روشنی کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ روشنی سے ہی زندگی عبارت ہے اور یہ خوشیوں کی علامت بھی ہے۔ لہٰذا رفعت صاحب روشنی کے متلاشی ہیں اور دعا کرتے ہیں۔

میرے خالق مجھے پھر زندگی دے
اندھیرا چھا رہا ہے روشنی دے

ان کی نظموں میں کرب وآگہی کا ایک نیا سلسلہ ملتا ہے جو ان کی زندگی کے خارزار کو ایک نئی روشنی بخشتا ہے۔ چنانچہ ایک نظم ''کہیں سے روشنی آئے'' ملاحظہ ہو۔

اندھرا سرسراتا ہے نفس میں
دیدہ و دل میں، رگ و پے میں
اندھیرا سانس لیتا ہے ہواؤں میں
اندھیرا رقص کرتا ہے فضاؤں میں، خلاؤں میں
اندھیرا چیختا ہے آسمانوں میں، گھٹاؤں میں
اندھیرے نے کیے ہیں مسخ خدوخال
تہذیب وتمدن کے
اندھیرے نے مٹادیں صفحۂ احساس سے
آیاتِ دلداری
اندھیرے میں کہیں اک دوسرے سے ہی
نہ ٹکرا جائیں سیارے
اندھیرے کی گھپاؤں میں نہ کھو جائیں
زمیں پر زندگی کے واسطے ہم رینگنے والے
اندھیرا جم کے رہ جائے
نہ آخر زندگی کے روئے زیبا پر
کہیں سے روشنی آئے
کہیں سے روشنی آئے

رفعت صاحب کی نظموں میں ہمیں ہر قسم کے مضامین اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ نظر آتے ہیں کہیں وہ معاشرے میں انسانیت سوز واقعات کے دردناک مناظر پیش کرتے ہیں تو کہیں تلخ حقائق کا پردہ فاش کرتے ہیں کہیں ٹوٹے دلوں کی مسیحائی کرتے ہیں تو کہیں رومانیت

سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ان کے یہاں رومانیت اور حقیقت ساتھ ساتھ بھی نظر آتے ہیں۔
نظم ''خوابوں کی دنیا'' کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

تمہارے خواب لے گئے مجھے خوابوں دنیا میں
مگر دنیا میں خوابوں کی تعبیر کہاں ملتی ہے

یہ حقیقت ہے کہ ہر خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا۔لہٰذا انسان کو جفا و وفا، ظلم وستم اور خلافِ عادت وخلافِ توقع ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار رکھنا ضروری ہے۔لیکن ذہنِ انسان کبھی ایک روش پر قایم نہیں رہتا۔ہمہ وقت تبدیلیوں سے گزرنا اس کا خاصہ ہے۔کبھی کبھی انسان بچپن کی یادوں میں کھو کر سب کچھ بھول جاتا ہے۔یہ یادیں اس کے ذہن کو تروتازہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ایک نظم ''گھر'' میں لکھتے ہیں۔

کیا وقت کی گردش نے مجھ کو آوارہ
چھٹا وہ تو پھرا شہر شہر میں لیکن
جو کچے گھر میں سکون تھا ملا نہ محلوں میں

بچپن کی جز وقتی حسین یادیں ہمیشہ تروتازگی بخشتی رہتی ہیں۔تنہائی میں یہ یادیں بہترین ساتھی کا کام کرتی ہیں۔آج انسان کا سب سے بڑا المیہ اس کی تنہائی ہے۔وہ بھیڑ میں رہ کر بھی خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔خود ہی اپنے مسائل ومصائب سے جوجھتا رہتا ہے رفعت صاحب لکھتے ہیں۔

نہ کوئی دوست دشمن، عجیب دنیا ہے
یہ زندگی ہے کہ تنہائیوں کا صحرا ہے

....

اے سروش مت پوچھو میری کیا حقیقت ہے
زندگی کے صحرا میں درد کا شجر تنہا

علامت سازی میں رفعت صاحب کو ملکہ حاصل ہے۔یہاں درد کا شجر ایک نئی علامت

بن کر سامنے آیا ہے۔اس کی مناسبت سے زندگی کے صحرا اور تنہائی نے معنویت نے اور بھی اضافہ کردیا ہے۔ان کی یادیں ہیں جو گویا تصویر تنہائی کا دوسرا رخ ہے۔

رفعت صاحب کے یہاں کلاسکی اور نو کلاسکی شاعری کے نمونے نظر آتے ہیں۔اسی لیے ان کی شاعری پر کبھی میرؔ تو کبھی فانیؔ اور کبھی فراقؔ کا پرتو نظر آتا ہے۔

آج سروش قلم سے تیرے آنسو چھلکے پڑتے ہیں
سچ کہوں تو چپکے چپکے حال یہ کس کا لکھے ہے

ان کی غزلوں میں سوز و گداز، درد و کیف، نغمگی، شیرینی اور اثر آفرینی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام کلاسیکل شاعری سے نزدیک نظر آتا ہے۔اس کے علاوہ زبان پختہ، رواں، سلیس ہے زبان میں برمحل اور سٹیک الفاظ کا استعمال مزید حسن پیدا کردیتا ہے۔حالانکہ غزلیں طرب ونشاط سے کم اور زندگی کے کرب والم سے زیادہ روشناس نظر آتی ہیں۔زندگی کے تلخ حقائق اور رموز سے آشنائی کی تڑپ انہیں خودشناسی کے نہاں خانوں میں لے گئی مگر وہ افتادِ طبع سے خوش نظر نہیں آتے شاید اس لیے کہ جوں جوں وہ اپنی ذات کے نہاں خانے میں اترتے ہیں انھیں تحیرات کا ایک جہان ملتا ہے اور یہ اندرونی ہلچل ان کے دل کو مضطرب کردیتی ہے۔لیکن وہ تائدِ غیبی سے مایوس نہیں شعر ملاحظہ ہو۔

ابھی مرا نہیں انسان اس کی سچائی
خدا کی آنکھ میں انصاف کی ہے بینائی

رفعت صاحب نے مختلف تحریکوں کے عروج کا دور دیکھا۔ ۱۹۴۵ء میں بمبئی میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں بھی شرکت کی یہ اس تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔اور ہر نیا تخلیق کار خود کو اس سے وابستہ کرکے شہرت و مقبولیت کی بلندیوں کو چھو لیتا تھا۔رفعت صاحب نے ان کی محفلوں جلسوں اور مشاعروں میں تو شرکت کی لیکن کلی طور پر اپنی فکر کو کسی تحریک، نظریہ یا دبستان سے وابستہ نہیں کیا۔لیکن ترقی پسند تحریک سے تعلق الگ معنی رکھتا ہے کیونکہ سید سجاد ظہیر، سبطِ حسن، کیفی اعظمی، ضیاء الحسن اور علی سردار جعفری وغیرہ جو اس تحریک کے روحِ رواں اور رفعت صاحب

کے مشفق دوست ہیں۔ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''ڈاکٹر کنور محمد اشرف، پریم ساگر گپتا، رمیش سنہا، رومیش چندر، ہاجرہ بیگم کمیونسٹ پارٹی اور''نیا زمانہ''اور''نیا ادب'' کا دفتر مجھے علی گڑھ گھرانہ لگا اور اس عقیدتی گھر میں میں روز تیسرے دن جانے لگا۔''

لیکن انھوں نے خود کو نمائشی باتوں سے ہمیشہ بچائے رکھا اور خاموشی سے اپنی کاوشوں میں سرگرداں رہے۔وہ نہ جدیدیت کے حامی ہیں اور نہ مابعد جدیدیت کے حالانکہ بسیار نویس ہیں۔ان کی تقریباً مطبوعہ وغیر مطبوعہ ۶۵ سے زیادہ کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں جن کے صلہ میں انھیں وقتاً فوقتاً انعامات واعزازات سے نوازا جاتا رہا اور تقریباً دو درجن سے زیادہ انعام واکرام وہ حاصل کر چکے ہیں۔ان کے قلم میں اس قدر روانی پیدا ہوگئی تھی کہ سفر ہو یا حضر کوئی مصروفیت ہو بسترِ علالت ہو یا بسترِ مرگ اشہبِ قلم جولانیاں بھرنے کے لیے بے قرار رہتا۔یہی وجہ ہے کہ آج وہ ہمارے درمیان موجود ہیں۔ان کی بے شمار نظمیں، غزلیں، مضامین، ناول، افسانے، ڈرامے، تراجم، اوپیرا وغیرہ انھیں حیاتِ جاوداں عطا کر چکے ہیں۔وادیِ گل، ذکر اس پری وش کا، نقشِ صدا، روشنی کا سفر، وادیِ غزل، مری صدا کا غبار، کرب، تنہائی، شاخِ گل، شہرِ غزل، سرِ شام، گم ہوتا ہوا آسمان وغیرہ شعری مجموعے اور ڈگر پنگھٹ کی، زندگی اک سفر ڈرامے ریت کی دیواریں، اندھیرے اجالے کے بیچ، شہرِ نگاراں اور افسانے پتہ۔پتہ بوٹا۔بوٹا، بمبئی کی بزم آرائیاں اور بستی نہیں ہے دلّی ہے تین جلدوں میں خودنوشت، فن نشریات پر براڈ کاسٹنگ وغیرہ وہ عظیم سرمایہ ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔وہ اردو ہندی انگریزی تینوں ہی زبانوں میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ song of life ان کی مشہور کتاب ہے۔ہندی میں منظوم ڈرامے، غزل کے رنگ خودنوشت اور ناول بہت مقبول ہوئے۔لیکن در حقیقت وہ کمال کے نظم گو شاعر تھے۔ان کی نظمیں تاثیر سے پر ہیں۔

رابطہ: 09897694581

ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی

امروہہ ایک قدیم تاریخی بستی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ صدیوں پہلے اسے امر جودھا نام کے ایک راجا نے آباد کیا مگر اس زمانے کے حالات تاریخ کے اندھیروں میں گم ہیں۔ اس وقت سے لے کر آج تک اس بستی نے نہ جانے کتنے نشیب و فراز دیکھے اور کتنی منزلوں سے گزری۔ جب مسلمانوں نے اس سرزمیں پر قدم رکھا تو یہ خاک ایسی مردم خیز ثابت ہوئی کہ مختلف علوم وفنون کے انگنت ماہرین نے یہاں جنم لیا۔ ناموران امروہہ کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان پر کام کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن اسی امروہہ کے ادیب قلم کے شاہکار اور محقق نے اس پر کام کیا اور ناموران امروہہ کو کتابوں میں زندہ کردیا۔ اس شخصیت کا نام ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی ہے

مصباح احمد صدیقی کی پیدائش یکم جنوری 1960 کو استجاب احمد صدیقی کے یہاں محلہ گھیر مناف امروہہ میں ہوئی مدرسہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ سے حفظ قران کے بعد دو سالہ تجوید کا کورس پاس کیا۔ ایم۔اے اردو (روہیلکھنڈ) اور ایم۔اے فارسی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) سے کیا اور عمر خیام ایوارڈ حاصل کیا۔ اس کے بعد انہوں نے فارسی لغت بحر الفضائل فی الافاضل کا تنقیدی مطالعہ و تحقیق متن پر ریسرچ کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی۔ ایچ کی ڈگری حاصل کی۔

تحفتہ الانساب، امروہہ کے افسانہ نگار اور امروہہ کے منتخب افسانے، تذکرہ علمائے امروہہ شعرائے امروہہ (دو جلدوں میں) امروہہ کے ہندو شعراء، قوۃ الکلام، کلیات شہباز، آئینہ عباسی، تکملئہ جواہر فریدی، چمنستان عطاء، کلیات لاابالی، اساریہ کشف صوفیہ (اردو، ہندی، فارسی

ترجمہ وحواشی) مناجات خواجہ عبداللہ انصاری وصد پند لقمان (اردو، ہندی) فتوحات فیروز شاہی، ثمرات القدس میم شجرات القدس کی تصحیح وغیرہ مصباح احمد کی صدیقی کی تصانیف ہیں اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ مصباح احمد صدیقی نے نہ صرف اپنی زندگی میں امروہہ کا نام روشن کیا بلکہ آئندہ نسلوں کو بھی اپنے اسلاف آباء واجداد کے کارناموں کو اجاگر کرنے اور سامنے لانے کا شعور وجذبہ عطا کیا۔ فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ، رضا لائبریری رامپور نے مصباح احمد صدیقی کی کئی کتابوں کو شائع کیا اور کئی کتابوں کو بہار اور یوپی اردو اکیڈمی نے ایوارڈ سے نوازا۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی

انجینئر محمد سمیع الدین

مصباح احمد صدیقی

''اردو ادب کی ترقی میں ضلع بجنور کا کردار'' موضوع سے متعلق کچھ تاریخی کتابیں، تذکرے، شعراء کے دواوین اور نقادانِ ادب کی کتب کو دیکھنا شروع کیا تو حیران و ششدر رہ گیا کہ ضلع بجنور کا ایک ایک شہر علماء و فضلاء کا ملجا و ماویٰ، ادباء و شعراء کا گڑھ اور صوفیاے عظام کا دارالسلام ہے۔ چاہے وہ نگینہ ہو کہ نور پور، سیوہارہ ہو کہ دھام پور، نجیب آباد ہو یا کرت پور، یا بجنور کا خطۂ یونان ''حبیب والا''۔

ایک ماہ تک پوری محنت اور لگن کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا اور یہ سوچ کر قلم اُٹھانے سے پہلے ہی ہتھیار ڈال دیے کہ اس بحرِ ناپیدا کنار کی غوطہ زنی کر کے یا متھ کر کوئی موتی نکال لانا جو ابھی تک خواص نہیں بلکہ عوام کی نظروں سے بھی اوجھل ہو، مجھ جیسے طفلِ مکتب کا کام نہیں، مایوس ہو گیا۔ اچانک قرآن پاک کی آیتِ کریمہ کا وہ جملہ ذہن میں آیا کہ ''لا تقنطوا من رحمت اللہ'' بس اللہ رب العزت کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو کر التجا کی تو اللہ سمیع و بصیر نے اپنے نام کی مناسبت سے مخدومِ گرامی قدر عالی جناب انجینئر محمد سمیع الدین کا نامِ نامی اسم گرامی ذہن و دل میں ڈالا۔ یہ نام ذہن میں آتے ہی مانو دیدہ و دل روشن ہو گئے اور میں خوشی سے پھول گیا کہ اب شاید یوسف کے خریداروں میں میرا نام بھی شامل ہو جائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

تو آیئے سرزمین ضلع بجنور کے نگینے سے نکل کر ایک ایسے مدینے میں داخل ہوتے ہیں جس کو عوام و خواص، حبیب والا اور صاحبان علم و دانش ضلع بجنور کا خطۂ یونان کہتے ہیں۔ اس مدینے میں ایک ایسا خزینہ ہے جس کو صاحبانِ ادب انجینئر محمد سمیع الدین علیگ کے نام سے جانتے اور

مانتے ہیں، اسی صوفیائے عظام علماء وفضلاء، ادباء وشعراء کے گڑھ خطۂ یونان یعنی قصبہ حبیب والا میں محترم میاں جی محمد سعید الدین انصاری (متوفی ۱۹۴۳ء) کے گھر ۱۷ ستمبر ۱۹۴۰ء کو انجینئر محمد سمیع الدین نام کے خزانہ علمی وادبی وتاریخی نے آنکھ کھولی۔ جونسبا آقائے دوجہاں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے میزبان مشہور صحابی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن حبیب والا میں حاصل کی پھر دھام پور آئے۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۹۵۸ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ گئے جہاں سے ۱۹۶۷ء میں نمایاں کامیابی کے ساتھ انجینئرنگ میں گریجویشن کیا۔ مختلف محکموں میں منفرد خدمات انجام دیتے ہوئے اتر پردیش کے محکمۂ آبپاشی سے پوری طرح عزت واحترام وپاکدامنی کے ساتھ ۳۰ ستمبر ۱۹۹۸ء کو سرکاری ملازمت سے خلاصی پائی۔

بے شک انجینئر محمد سمیع الدین صاحب ایک خاندانی درویش صفت اور قلندرانہ مزاج کی حامل شخصیت کے مالک ہیں۔ یہاں میں آپ کی شخصیت سے متعلق محترم ایس۔ ایم ظفر صاحب کے مقالے کا ایک مختصر اقتباس پیش کرنا چاہوں گا۔ وہ فرماتے ہیں:

> جناب سمیع الدین میں بیک وقت وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک بہترین انسان میں ہونی چاہئیں۔ آپ بہترین دوست، کامیاب انجینئر، فرض شناس آفیسر، خوش مذاق، سلیقہ مند، باوضع، متواضع، منکسر المزاج، نرم اور شیریں گفتار، صاف گو، جری بہادر، حوصلہ مند، درویش صفت، ادب نواز، علم دوست اور حسنِ مجلس رکھنے والے عمدہ انسان ہیں۔

اسی سبب ملازمت سے فارغ البالی کے بعد آپ نے اپنی زندگی اردو ادبیات اور صوفیانہ سرمائے کی اشاعت وتحقیق وتنقید کے لیے وقف کر کے اور وہ کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں کہ میدان تحقیق کے بڑے بڑے شہ سوار آپ کے آگے تیشہ رکھ کر کہتے ہیں "یا استاذ"۔ راقم الحروف نے جب بجنور کے خطۂ یونان میں جلوہ گر ہوئے محمد سمیع الدین نام کے درِ شہوار کا

تعارف کرانے کا ارادہ کیا تو آپ کا کام دیکھ کر اوسان خطا ہو گئے۔ پھر ہمت ہاری مگر شاید یہ مخدومی انجینئر محمد سمیع الدین انصاری صاحب کا ہی تصرف ہے کہ مضمون جیسا بھی ہے مکمل ہو گیا۔

محترم محمد سمیع الدین صاحب کے سرمایۂ تحقیق کو دیکھ کر قدم قدم پر خیال آیا کہ میاں کیوں دخل در معقولات کرنے کی جرأت بیجا کر کے خود کو نا اہلی کی سند دلانا چاہتے ہو۔ بہر حال۔

انجینئر محمد سمیع الدین صاحب ایک جناتی لکھاڑ شخصیت کا نام ہے، جنھوں نے اپنی ہمہ وقتی مصروف سرکاری ملازمت، گھریلو اور سماجی ذمہ داریوں کے باوجود اتنا لکھا ہے کہ بڑے بڑے بسیار نویس حیرتی ہیں۔ میں ان کے کام کو آدھے ادھورے طور پر دیکھ کر ہی حیران رہ گیا کہ کیا غضب کی محنت شاقہ کی ہے اور کس طرح معروف و غیر معروف شخصیات کے حالات کو کھود نکالا ہے۔ آپ کی جس کتاب کو اُٹھا کر دیکھتا حیرت میں اضافہ ہوتا کہ کس بلا کی کوہ کنی کی ہے اور کیسے کیسے پہاڑ سر پر اُٹھائے ہیں۔ ایسی کوہ پیمائی کے لیے تو ایک نہیں کئی اداروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ انجینئر محمد سمیع الدین صاحب کے موضوعات مختلف النوع ہیں۔ یعنی ادبیات، اسلامیات، تاریخ و تہذیب و تمدن اور تصوف وغیرہ۔ ان میں ہر ایک موضوع پر پوری تحقیق و تفتیش اور حالات کا جمع کر لینا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ آپ کی کاوشوں کو دیکھ کر ذہانت و دانشمندی کے ساتھ سلیقے اور حسنِ ترتیب و تدوین و تحقیق کا بھی معترف ہونا پڑتا ہے کہ آپ نے جزئیات کو بھی اہمیت دے کر آئندہ تحقیق کرنے والوں کے لئے ایک راستہ ہموار کر دیا ہے۔ بالخصوص آپ کی اہم عالمانہ تصنیف ''تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ'' وہ عظیم و بلیغ کارنامہ اور میدان تصوف و تاریخ کا وہ شاہکار ہے کہ اس جوئے شیر لانے پر آپ کو جس قدر داد و تحسین سے نوازہ جائے کم ہی کم ہے۔ احقر نے اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ لگایا کہ انجینئر محمد سمیع الدین صاحب کو تاریخی الجھنوں اور نسبی گتھیوں کو سلجھانے اور سنوارنے کا بڑا ملکہ ہے جو بلاشبہ محنت شاقہ اور وسعتِ مطالعہ کی دین ہے۔ اب مختصراً انجینئر محمد سمیع الدین صاحب کے علمی سرمائے کا تعارف پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

1/ ''سلطان الشہداء، سید سالار مسعود غازی'' 2008 کی مطبوعہ ایک اہم ترین و

قابل مطالعہ تحقیق ہے جس میں بڑے سلیقہ مندی، محنت اور تلاش کے ساتھ دادِ تحقیق دی ہے۔ 229 صفحات کی ۹/ابواب کی کتاب میں سالار مسعود غازی سے متعلق تمام ہی ضروری معلومات کو محققانہ طور پر یکجا کر دیا گیا ہے اور تحقیق و تلاش کے دوران آپ نے کوئی بھی امکانی ماخذ چھوڑا نہیں ہے۔ سید سالار مسعود غازی پر اب تک پیش کیے گئے کاموں میں سمیع الدین صاحب کا کام میرے ناقص مطالعے کی بنیاد پر سب سے اچھا کام ہے۔ کتاب میں شامل اہم مقامات کے نقشے اور تصاویر بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

2/ سید عبدالرحمٰن فضل اللہ (المعروف بہ سید سلطان بہرائچی) یہ کتاب بھی 2008 میں شائع ہوئی۔ 298/صفحات اور 10/ابواب پر مشتمل اس کتاب کو پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ محترم سمیع الدین صاحب نے کس کس طرح ایک ایک کوچہ و برزن کی خاک چھانی ہے اور نسب ناموں کی مدد سے کیسی دشوار گتھیوں کو تحقیقی حوالوں سے صاف و شفاف اور واضح کر دیا ہے۔ یہ کتاب حضرت شاہ سید عبدالرحمٰن الملقب بہ شاہ قطب جہانگیر (متوفی ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء) پر ہے جو بزرگ مشائخ میں سے تھے اور سلسلۂ چشتیہ میں شیخ علاء الدین مشہور بہ نور تاج بخشی اور زندہ پیر سے خلافت و اجازت پائی تھی۔ سمیع الدین صاحب نے اس مختصر مگر جامع کتاب میں جو تحقیقات پیش کی ہیں وہ لائق صد تحسین ہیں۔

3/ ''قائم چاند پوری'' یہ کتاب بلاشبہ اردو ادبیات میں ایک عمدہ اور قابل قدر اضافہ ہے جو 334/صفحات اور ۱۱/ابواب پر مشتمل ہے۔ راقم الحروف نے اپنی طالب علمانہ زندگی میں قائم چاند پوری پر بہت کچھ پڑھا اور سُنا ہے مگر اس نوعیت کی کوئی کتاب احقر کی نظر سے نہیں گذری وقت کی کمی اور سیمینار کی حد بندیاں قدم قدم پر اشہبِ قلم کو لگام دے رہی ہیں ورنہ یہ کتاب مکمل ایک طویل مقالہ چاہتی ہے۔ سمیع الدین صاحب نے قائم چاند پوری کا کس قدر باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے اس کا اندازہ کتاب پڑھ کر ہی لگایا جا سکتا ہے۔ قائم کی پیدائش سے لیکر وفات، قائم کا گھرانہ، آبا و اجداد و اخلاف، قائم کا ادبی قد، قائم کا مرقد، کون سا گوشہ ہے جو اچھوتا چھوڑا گیا ہے۔ سبحان اللہ۔ مطالعے کے بعد بے ساختہ میری زبان سے اپنے لیے یہ الفاظ نکلے کہ ''دیکھ اس

طرح کرتے ہیں تحقیق وتلاش''۔ سمیع الدین صاحب کی یہ تصنیف نہ صرف قائم چاند پوری بلکہ اردو ادب کی بہترین خدمت ہے اور آئندہ قائم پر کام کرنے والوں کے لیے مشعل راہ ہے۔

4/ ''تاریخ راپڑی'' راپڑی جو کبھی ایک اہم تاریخی شہر تھا۔ محمد غوری کے زمانے میں مسلم آبادی واقتدار کا ایک اہم مرکز رہا محترم سمیع الدین صاحب نے بذاتِ خود بار بار وہاں جا کر اس کے ہر گلی محلے میں گھوم کر مستند تاریخی حوالوں سے ایک کتاب ترتیب دی جس کا نام ہے ''تاریخ راپڑی'' اور اپنے وسعت مطالعہ اور دقت نظر سے مکمل جزئیات نگاری کے ساتھ اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ وہاں کی مساجد ومقابر کے فوٹو اور نقشوں نے کتاب کی اہمیت وافادیت میں اضافہ کیا ہے۔ ۲۶۴ صفحات کی کتاب میں ایک جہاں سمو دیا ہے، مانو سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔

5/ ''چند قدم گھر سے ۔۔۔۔'' یہ کتاب انجینئر محمد سمیع الدین صاحب کے سفر پاکستان کی پُر از معلومات داستان ہے جس میں انھوں نے اپنے ساتھ ہم لوگوں کو یعنی کتاب پڑھنے والوں کو بھی اچھی طرح لاہور وکراچی کے گلی محلوں، بازاروں، مزاراتِ اولیاء، مساجد و مدارس اور دیگر تاریخی عمارتوں کی سیر کرا دی ہے۔ یہ کتاب اپنی اہمت وافادیت کے پیش نظر دو مرتبہ شائع ہوئی۔ اردو کی کسی کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہونا اس کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ کتاب کے مطالعے سے انجینئر محمد سمیع الدین صاحب کی تحقیق وتلاش اور خوب سے خوب تر کی جستجو کے ساتھ ان کے مزاج کی ادبی چاشنی کا بھی معترف ہونا پڑتا ہے۔ اس کتاب کی زبان وبیان محاوراتی اور انداز تحریر بہت خوبصورت، پر اثر اور رواں ہے۔ دل چاہتا ہے کہ اس کے جستہ جستہ اقتباسات پیش کر کے اپنے دعوے کو بدلیل ثابت کروں مگر مقالے کی طوالت سے ڈر لگتا ہے۔ پھر بھی ایک مختصر سا اقتباس بطور تبرک پیش کرتا ہوں جو آسان، سادہ اور محاوراتی زبان کا ثبوت ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب محمد سمیع الدین صاحب سرکاری ملازمت میں ہونے کے سبب بعض سرکاری بندشوں کی وجہ سے پاکستان جا کر اپنے بھائیوں سے نہیں مل سکے اور ایک طویل عرصے تک ان کی یاد میں تڑپتے رہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد اپنے بڑے بھائی کو فون پر اطلاع دیتے ہیں اس کی منظر کشی ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:

''ریٹائر ہونے کے بعد جب میں نے ایک بار ٹیلیفون پر ان سے کہا تھا کہ اب میں ریٹائر ہو چکا ہوں، اب ضرور آؤں گا تو انھوں نے فوراً قدرے چونکتے ہوئے کہا تھا کہ تو ابھی سے ریٹائر ہو گیا! میرے سامنے تو ابھی بھی وہ منظر ہے کہ تو مچل رہا ہے اور میں انگلی پکڑے تجھے مدرسے لے جا رہا ہوں اور پھر اس کے بعد ان کا گلا کچھ رندھ سا گیا تھا اور انھوں نے ریسیور رکھ دیا تھا۔ ادھر میں بھی بے قابو ہو کر رونے لگا۔

بقول جگر مراد آبادی

اِدھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی، ان سے آہ بھی نہ ہوئی

بحر حال یہ کتاب بھی انجینئر محمد سمیع الدین صاحب کے تاریخی و تحقیقی ذہن و فکر کی غماز ہے۔ کیونکہ اس میں بھی آپ نے اپنی جزئیات نگاری کے سبب کسی بھی گوشے کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ یہ کتاب بھی ۳۲۶ر صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ محمد سمیع الدین صاحب صرف ایک انجینئر ہی نہیں بلکہ وہ ایک ذہین محقق و مدقق، تاریخ داں، تذکرہ نگار، داستان گو، حساس سیاح، ماہر علم معاشیات، ماہر آثار قدیمہ، ماہر علم اقتصادیات، ماہر علم حیوانات، ماہر صحافی، انسانی و سماجی درد رکھنے والے ایک خدا رسیدہ درویش صفت انسان ہیں۔

6/ ''دُرِ بے بہا'' یہ کتاب ۲۰۱۰ء میں شائع ہونے والی ۳۹۰ر صفحات پر مشتمل انجینئر محمد سمیع الدین صاحب کی وہ تصنیف ہے جو ان کے اسلامی جذبے اور دینی فکر و نظر کی دین ہے۔ اس کتاب میں ان ۲۶ر پیغمبروں کا ذکر بڑی تفصیل سے قرآنی حوالوں کے ساتھ کیا گیا ہے جن کا اسم گرامی قرآن پاک میں آیا ہے۔ آپ نے اس کتاب میں ان تمام ۲۶ر پیغمبروں کے حالات تحقیق و تلاش کے بعد تاریخی حوالوں کے ساتھ قلمبند کیے ہیں جو ایک اہم تاریخی اسلامی اور معلوماتی کام ہے۔

7/ ''تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ'' انجینئر محمد سمیع الدین صاحب قبلہ کی یہ کتاب اسم با مسمیٰ ہے جہاں اس کا نام بہت بھاری بھرکم ہے وہاں اس کی ضخامت بھی تقریباً تین ہزار صفحات پر

مشتمل ہے اور ساتھ ہی اس کے مضامین بھی اس قدر اہم، پر مغز اور نادر و نایاب معلومات سے لبریز ہیں۔ کتاب سیرت کی بے پناہ خوبیوں کے ساتھ حسنِ صورت سے بھی پوری طرح بنی سنوری ہے۔ کتاب کا سرسری سا ہی مطالعہ کر کے میں نے سوچا کہ، میں نے تو اپنی ادبی زندگی میں اتنا پڑھا بھی نہیں ہے جتنا انجینئر محمد سمیع الدین صاحب نے لکھا ہے۔

یہ اہم ترین کتاب چار ضخیم جلدوں میں منقسم ہے۔ ہر جلد کا مجموعی نام ''تذکرہ گنج ہائے گراں مایہ'' ہے اور ہر جلد کا خصوصی الگ الگ نام بھی ہے ۔

راقم الحروف نے یہاں صرف ابواب کے عنوانات کی نقل کرنے پر اکتفاع کیا ہے۔ اگر ان کی تفصیلات بھی پیش کروں تو یہ مقالہ خاصہ طویل ہو جائے گا۔ یہ جلد ۸۳۸ر صفحات پر محیط ہے۔ اور اس میں ایک جہانِ انصارانِ ہند و پاک بلکہ ''ہند کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر'' والا معاملہ ہے اور شرقی و غربی کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔

''تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ'' کی جلد دوم ''قریہ جو ایک ہے عالم میں انتخاب'' ہے جو ضلع بجنور کے مشہور و معروف علاقے حبیب والا عرف حسین پور حمید جس کو ضلع بجنور کا ''خطۂ یونان'' کہتے ہیں، کی بڑی تفصیلی اور محققانہ تاریخ ہے۔ یہ کتاب کل چار ابواب پر مشتمل ہے

اس کتاب میں شیوخ و سادات کے شجرات پر تفصیلی عالمانہ و محققانہ بحث کی گئی ہے جو انجینئر محمد سمیع الدین صاحب کے ماہر انساب ہونے کی مستند دلیل ہے۔ اس پر آپ نے بڑی باریک بینی سے بحث کی ہے۔ کتاب پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انساب کا حق ایک محقق ہی صحیح معنی میں ادا کر سکتا ہے جیسے ایک محدث جب تک اسماء الرجال سے واقف نہ ہو تب تک احادیث پر کماحقہ' جرح و بحث نہیں کر سکتا۔ انجینئر محمد سمیع الدین صاحب ایک محققانہ ذہن رکھنے والے تاریخ داں ہیں اس لیے انساب کی چھان پھٹک میں بھی پوری طرح کامیاب ہیں۔

''تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ'' کی تیسری جلد ''منبع الاسرار'' کے نام سے ہے جو تصوف جیسے اہم ترین موضوع پر مشتمل ہے جس میں تصوف کے رموز و نکات، صوفیہ کرام کے سلاسل، صوفیانہ تعلیمات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی ڈھیر سارے بڑے بڑے صوفیہ کرام کے

سوانحی حالات تحقیق وتدقیق کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ آخیر میں چند اہم صوفیہ کرام کے مزارات کے فوٹو بھی دیئے ہیں جو کتاب کی اہمیت وافادیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہ کتاب بارہ ابواب پر منقسم ہے او794 صفحات پر محیط ہے۔

''تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ'' کی چوتھی جلد ''تذکرۂ جہانیاں'' کے نام سے ہے۔ اس کتاب کا مواد خالص تاریخی ہے جس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی تاریخ، عہد حکومت، ان کے نمایاں کارنامے، اولاد، شجرے اور اصلاحات وغیرہ پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

ان تمام تصانیف کے علاوہ انجینئر محمد سمیع الدین صاحب کی مندرجہ ذیل تصانیف اور ہیں جن کے اسماء اس طرح ہیں: ''کہکشاں'' ''آب گینہ'' (اردو) ''پریتی پنچ'' (ہندی) ''حبیب الانساب'' اور کچھ دیگر کتابیں جن کی زیارت یا حسن سیرت وصورت سے راقم الحروف ابھی تک محروم ہے۔ ابھی بھی کئی اہم کتابیں زیر اشاعت وزیر ترتیب ہیں جن میں ''حبیب الانساب'' اور ''گھر واپسی'' کے نام خاص ہیں۔

افسوس! کہ میں اپنی کم علمی اور محدود مطالعے کے سبب ان تصانیف عالیہ کا صحیح تعارف نہیں کرا سکا ہوں۔ اپنی عجز بیانی کا ذکر اس مضمون میں کئی جگہ کر چکا ہوں۔ آخر میں پھر کہتا ہوں: یہ سب بحث وتکرار کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ انجینئر محمد سمیع الدین صاحب کے کاموں کا تعارف کرانا مجھ جیسے طفل مکتب اور شکستہ قلم کا کام نہیں۔ اسی لیے غالب کے ایک مصرعہ اور میر تقی میر کے ایک شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں جو میرے قلم عجز بیاں کی تفسیر ہیں۔ غالب میر زبان میں کہتا ہے:

مصرع: حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اور میر تقی میر نے تو میری پوری حقیقت اور کیفیت بیان کردی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

سرسری ہم جہان سے گذرے
ورنہ ہر جہاں جہانِ دیگر تھا

رابطہ:9997161315

سب سے کم عمر کی اکادمی ایوارڈ یافتہ --فرح ناز

مغربی یوپی کا شہر میرٹھ جو تعلیم اور تجارت کا ایک بڑا مرکز ہے۔اس تہذیبی اور ثقافتی شہر میں جب سے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی تقرری چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے شعبہء اردو میں ہوئی اردو کی ترقی میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔وہ مغربی اتر پردیش میں واقع صوبائی یونیورسیٹز کے شعبہ اردو میں سب سے زیادہ سرگرم وفعال صدر شعبہ ہیں۔اسلم جمشید پوری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ پتھر کو تلاش کر، اسے تراشتے ہیں اور پھر اس پتھر کو نگینہ بنا دیتے ہیں اور یہ نگینہ اردو ادب کی خدمت کرتے ہوئے چمکنا شروع ہو جاتا ہے۔ایسے ہی ایک تراشے ہوئے پتھر کا نام فرح ناز ہے۔

5 جون 1989ء کو میرٹھ شہر میں جمیل احمد صدیقی اور سیدہ نسرین بانوں کے یہاں پیدا ہوئی فرح ناز نے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ سے ایم اے، ایم فِل کیا اور ابھی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے۔عالمی پرواز ڈاٹ کام، بزم سہارا میں آپ کے مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں۔فرح ناز کا قلمی نام ''انام'' ہے۔ان کا رجحان طنز ومزاح کی جانب ہے اور ابھی تک ان کے زیادہ تر مضامین طنز و مزاح پر ہی آئے ہیں۔ضلع بجنور کے نامور شاعر، ادیب، صحافی اسدرضا پر فرح ناز ''انام'' کی حال ہی میں ایک کتاب 'اسدرضا بحیثیت طنز ومزاح نگار' منظر عام پر آئی ہے اور اس کتاب پر یوپی اردو اکادمی لکھنو نے 2015 کا ایوارڈ دیا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ ایوارڈ یافتہ لوگوں کی فہرست میں سب سے کم عمر نام فرح ناز کا ہوگا۔اتنی کم عمر میں صاحب کتاب ہو جانا ایک بڑی بات ہے، اور یہ عمل فرح ناز کی کامیاب منزل کی جانب اشارہ کرتا ہے۔کئی سیمینار اور ورکشاپ میں شرکت کر مقالہ پیش کر چکی فرح ناز کو ''نودت فن کار اعزاز'' سے بھی نوازہ جا چکا ہے۔

فرح ناز سے جب ضلع بجنور کے حوالے سے ایک مضمون تحریر کرنے کی درخواست کی تو انہوں نے سب سے کم وقت میں اپنا مضمون روانہ کیا ہم ان کے اس جذبے کی قدر کرتے ہیں اور اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا کرتے ہیں کہ وہ فرح ناز کو اردو ادب کا ایک روشن ستارہ بنا دے اور انکی ہر نیک خواہش پوری کرے (آمین)۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی

اسد رضا کی نثری خدمات

فرح ناز

ضلع بجنور برسوں سے تاریخی وادبی نقطۂ نظر سے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ سر زمین بجنور میں شروع سے ہی علم وادب کے پرچم کو لہرانے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ جب ہم تاریخی اعتبار سے اس پر روشنی ڈالتے ہیں تو ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ہر قسم کی تحریکات میں اس سرزمین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خواہ اس کا تعلق ادب سے ہو یا ملت سے۔ سیاست سے ہو یا سماج سے۔ ہر قسم کی تحریکات میں ہمیشہ اس کا بھرپور تعاون رہا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر، خلافت اور عدم تعاون، نمک ستیہ گرہ، کرو یا مرو 1942 جیسی متعدد تحریکوں میں بھی بجنور کے حضرات کا پورا پورا ساتھ رہا۔ اس کی خاک سے ہی پیدا ہوئے مولوی مجید الحسن کے ہاتھوں ''مدینہ'' جیسا اعلیٰ پائے کا اخبار نکلا۔ جس نے ہندوستان کی آزادی میں ایک مشعل راہ کا کام انجام دیا۔ جس کی روشنی میں نہ صرف آزاد ہندوستان کے سپنے تعبیر ہوئے بلکہ سرزمین بجنور اردو صحافت اور اردو ادب کو بھی ایک نیا راستہ دکھائی دیا۔ ''مدینہ'' اخبار بیسویں صدی کے اعلیٰ ترین اخباروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جس میں اکبر الہ آبادی، ڈاکٹر اقبال، حسرت موہانی اور ظفر علی جیسے بڑے بڑے فن کاروں نے اپنے قلم کے جوہر دکھلائے۔

بجنور کی ایک اور اہم شخصیت کے مالک مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا نام نہ صرف بجنور کے لیے بلکہ پورے ہندوستان کے لیے لائق فخر ہے جو پوری طرح ملک وقوم کے محبت کے جذبے سے رطب اللسان تھے۔ انہوں نے بہت سی شہرۂ آفاق تصانیف تحریر کیں اور

جنگ آزادی میں بھی ایک اہم کردار ادا کیا۔ ان کے علاوہ بجنور کی متعدد ہستیوں کے نام حافظ محمد ابرا ہیم نگینوی، (سابق گورنر، حکومت اتر پردیش)، بیرسٹر آصف علی، عبدالطیف گاندھی، گووند سہائے، چودھری مہاراج سنگھ، لکھن سنگھ تیاگی اور چندن سنگھ وغیرہ آزدیِ جنگ میں سرمایہ فخر ہیں۔

سید اسد رضا نقوی اپنے والد کی تیسری بیوی سیدہ قمر بانو کے بطن سے 2/ جنوری 1952 کو پیدی سادات ضلع بجنور یو پی میں صبح سویرے پیدا ہوئے۔ جب آپ نے لکھنے کا آغاز کیا تو شروع شروع میں آپ نے اپنا تخلص اسد بجنوری استعمال کیا۔ مگر بعد میں وقت کے ساتھ جب آپ ترقی پسندی اور جدت پرستی سے متاثر ہوئے تو آپ نے اپنا تخلص اسد بجنوری سے اسد رضا اختیار کر لیا۔

اسد رضا کو اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں پر قدرت حاصل ہے۔ جس کی وجہ سے تینوں ہی زبانوں کے اخبارات و رسائل میں آپ کی تحریریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اردو اخبار راشٹریہ سہارا میں تین دن ''تلخیاں'' عنوان سے طنزیہ کالم لکھ رہے تھے جو آپ نے حال ہی میں لکھنا چھوڑا ہے۔ ایک ویکلی کالم ہندی راشٹریہ سہارا اخبار میں اور انگریزی اخبار ویکلی ''سہارا ٹائمز'' میں بھی آپ مضامین لکھتے ہیں۔ سہارا کے ٹی وی پروگرام میں بھی آپ حصہ لینے سے گریز نہیں کرتے اور سہارا پریوار کے تمام رسائل و اخبارات میں آپ کی تخلیقات موجود ہوتی ہیں۔

ابتک اسد رضا کی آٹھ کتابیں شائع ہو کر مقبول عام کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ جن میں تین بچوں کے لیے دلچسپ اور کھٹی میٹھی کہانیوں کے مجموعے ''چاند نگر کے سیر''، ''ننھے منو کی سرکار'' اور ''کرکٹی مشاعرہ'' ہیں۔ آپ کی تحریر کردہ چٹ پٹی کہانی ''چاند نگر کی سیر'' مغربی بنگال میں نصابی کتاب ''سلیس اردو'' کے اندر شامل ہے۔ شاعری کے دو مجموعے ''آئینے احساس کے''، ''شہرا احساس'' اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے مجموعے ''شوخیِ قلم''، ''ادبی اسپتال'' اور ''شوشے'' ہیں جن میں ''ادبی اسپتال'' کے اب تک دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ''ننھے منوں کی سرکار'' اور ''کرکٹی مشاعرہ'' کو چھوڑ کر آپ کی تمام کتابوں کو یو پی اردو اکادمی، بہار اردو اکادمی اور دہلی اردو اکادمی کی جانب سے انعامات سے نوازا گیا ہے۔ اسد رضا صاحب نے اب تک دو ہزار سے بھی زائد کالم و

مضامین لکھے ہیں جو اردو، ہندی اور انگریزی کے اہم روزناموں اور رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

اسد رضا کی نثر نگاری پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو نظم کے مقابلے ان کی نثر کا دامن زیادہ وسیع اور کشادہ نظر آتا ہے۔ جس میں ان کے فن طنز و مزاح کے معیاری نمونے اپنے عروج پر جلوہ گر نظر آتے ہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ طنز و مزاح کی راہ ایک دشوار راہ ہے۔ کیوں کہ ایک اعلیٰ اور معیاری طنز و مزاح ہر طرح کے پھکڑ پن، ابتذال، ہرزہ سرائی اور سوقیانہ پن سے پاک ہوتا ہے اور اسے ادبیت کا بھی پورا لحاظ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اسد رضا اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''........یوں بھی شعر کہنا آسان ہے مگر طنزیہ و مزاحیہ لکھنا نہ صرف مشکل ہے بلکہ ''آ بیل مجھے مار'' کے مصداق ہے۔''[1]

لہٰذا یہ سچ ہے کہ وہ پہلے شاعر ہیں مگر بنیادی طور پر وہ طنز و مزاح نگار ہیں۔ اپنے قلم کی شوخیوں کے متعلق وہ یہ رقم فرماتے ہیں:

''شوخیِ قلم ہو یا شوخیِ صنم دونوں سے دل کو فرحت اور دماغ کو راحت حاصل ہوتی ہے۔ چونکہ لڑکپن سے ہی ہمارا دل مائل بہ فرحت اور دماغ مائل بہ راحت رہا ہے۔ لہٰذا ہمارا قلم بھی شوخیاں کرنے لگا اور آج تک کر رہا ہے۔ اگر چہ ہمارے والد بزرگوار نے ہماری بسم اللہ کے بعد ہمارے ہاتھ میں قلم اس لیے دیا تھا کہ ہم اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ان کی ہی طرح (مرحوم گزیٹڈ آفیسر تھے) بڑے آفیسر بن کر ان کا اور خاندان کا نام روشن کریں۔ لیکن خدا سمجھے ہمارے اس قلم کو جس نے ہمیں آفیسر تو نہیں بننے دیا بلکہ اول درجے کی ہندوستانی زبان اردو میں تیسرے درجے کا مزاح نگار بنا دیا......''[1]

ان کا قلم شاعری کے مقابلے نثر کے میدان میں زیادہ تیزی سے دوڑتا اور شوخیاں کرتا نظر آتا ہے۔ وہ طنز و مزاح کو نثر میں لکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جس کی وضاحت وہ اس طرح کرتے ہیں:

''نثر میں طنز و مزاح کو میں اس لیے ترجیح دیتا ہوں کہ معاشرہ کی ناہمواریوں، بدگمانیوں، ثقافتی، سیا

سیاسی و معاشی استحصال، فرقہ پرستی، رہبران کی دورخی زندگی اور قول و فعل نے تضاد کو اشعار کی بہ نسبت نثر میں بہتر طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔'' ۷

نثر میں اب تک ان کے چھ مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں جن میں تین طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے مجموعے اور تین بچوں کے لیے مزاحیہ و طنزیہ کہانیوں کے مجموعے ہیں۔ جنہیں میں نے اپنی سہولت کے مطابق دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ ان کی نثری خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے پہلے ہم طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا اجمالی طور پر جائزہ لیں گے۔ پھر بچوں کے لیے لکھے گئے مزاحیہ و طنزیہ کہانیوں پر بات کریں گے۔ اسد رضا کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ''شوخیٔ قلم'' ہے۔ جو دسمبر 2003 میں مکتبہ، نئی آواز، جامعہ نگر، نئی دہلی سے شائع ہوا۔ جس میں ۳۱ رمضامین ۱۴۴ رصفحات پر مشتمل ہیں۔ شروع میں سات بڑے ادبا نے طنز و مزاح کی دنیا میں اسد رضا کا پرتپاک خیر مقدم کیا ہے اور اپنی نیک دعاؤں سے نوازا ہے۔ مجموعے کے آخر میں ''احوال واقعی'' میں اسد رضا نے اپنا مختصر احوال عرض کرتے ہوئے کتاب کے شائع ہونے میں اپنا تعاون عطا کرنے والے حضرات کا شکریہ ادا کیا ہے۔

اسد رضا کی نثری تحریریں نہایت شگفتہ، شوخ اور دلچسپ ہوتی ہیں۔ شاعری کے ساتھ ساتھ انہوں نے نثر میں بھی ہزارہا مضامین، سفرنامے، خاکے اور کالم کے ذریعے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ خصوصاً کالم نگاری کی روایت کو قائم رکھنے میں ان کا قلم بہت معاون و مددگار ثابت ہوا۔ ان کے تمام مضامین متنوع، شائستہ، Readability سے پُر، دلکش اسلوب کے مالک ہیں جس کی وجہ سے اسد رضا اپنے عہد کے دوسرے طنز و مزاح نگاروں میں ایک منفرد اور معیاری اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے فن کی بلندی اور ادبی شعور کے سلسلے میں ان کا مضمون ''مرزا اسد اللہ خاں کا خط طنز و مزاح کو دوسرے درجے کا ادب سمجھنے والوں کے نام'' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''برخورداران و نافرمانِ ادب! سنو ہم کو یہ باتیں پسند نہیں کہ تم لوگ طنز و مزاح یعنی میرے انتہائی پسندیدہ موضوع کو دوسرے درجے کا ادب قرار دو۔ کل عالم برزخ میں برخوردار یوسف ناظم سے ملا

قات ہوئی۔ کہنے لگے'' چچا جان آپ کی شاعری پر جان چھڑکنے والے، آپ کے نام پر بڑے بڑے سیمینار میں دولت، حلوے اور مرغے اڑانے والے چند دانشوروں کا ایک طبقہ کہتا ہے کہ طنز و مزاح دوسرے درجہ کا ادب ہے۔ صورت حال اس حد تک ابتر ہے کہ آپ کے نام سے منسوب ادارے جو تنقید و تحقیق، فارسی ادب، شاعری اور صحافت وغیرہ کے لیے ڈاکٹروں، پروفیسروں اور ایڈیٹروں کو ہزاروں کے انعامات دیتے ہیں۔ لیکن طنز و مزاح کو نظر انداز کرتے ہیں۔ جب میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا ساری دنیا میں میرے نام سے منسوب اداروں کے سربراہان، شگفتگی کے دشمن ہیں؟ تو ناظم میاں نے کہا'' جی ہاں! بیشتر طنز و مزاح کے مخالفین ہیں۔'' جب ایک طنز و مزاح نگار نے ایک ایسے ہی ادارے کے سربراہ سے دریافت کیا کہ غالبؔ کے نام سے طنز و مزاح نگار کو ایوارڈ کیوں نہیں دیا جاتا تو انہوں نے فرمایا'' ہم نے شروع میں دو طنز و مزاح نگاروں کو ایوارڈ دیا تھا۔ اس امید کے ساتھ کہ وہ ہمیں سیمیناروں، مشاعروں اور ادبی و غیر ادبی جلسوں میں مدعو کریں گے۔ لیکن انہوں نے انعام لے کر ہماری طرف دیکھا بھی نہیں لہٰذا ہم نے طنز و مزاح پر ایوارڈ دینا بند کر دیا......''

اسدؔ رضا کے طنز و مزاح کا نقطۂ نظر ہمارے سماج میں پنپ رہی غلطیوں اور ناہمواریوں پر مبنی ہے۔ کیوں کہ ادب معاشرے کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ اس لیے اسدؔ رضا کا فن طنز و مزاح نگاری بھی اپنے عہد کی سماجی، سیاسی، اخلاقی قدروں پر بھرپور وار کرتا ہے جو قاری کو اپنی جانب متوجہ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ سیدھے سادھے انداز میں بڑی سے بڑی بات بھی ہنرمندی سے کہہ جاتے ہیں۔ وہ محض تفریح طبع کے لیے سطحی نثر نہیں لکھتے بلکہ قاری کو دعوت فکر بھی دیتے ہیں اور اپنے خیالات فکر و فلسفے کو مزاح کا سہارا لے کر بیان کرتے ہیں۔ اپنے مضمون'' بکروں اور موسمی قصابوں'' کی بہار جیسا کے عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ بقرہ عید کے وقت پیشہ وارانہ قصابوں کے ساتھ ہی دیگر برادریوں کے لوگ بھی پیسہ کمانے کے لیے سر پر ٹوپی اور بغل میں چھری رکھ کر گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔ جو نہ تجربہ کار ہونے کی وجہ سے بہت سے مسائل سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"......چھت کے برساتی پانی کی نکاسی کے لیے لگائے گئے پائپ کے قریب لے جا کر موسمی قصاب نے بکرے کو ذبح کرنے کے لیے چھت پر گرانا چاہا۔لیکن بکرے نے خود قصاب صاحب کو ہی گرا دیا۔ہم نے انہیں اٹھایا اور پھر بکرے کو زمین پر لٹانے میں ان کی مدد کی۔ہم نے قربانی سے قبل پڑھی جانے والی کتاب میں دیکھ کر دعا پڑھی اور علامتی طور پر جیسے ہی چھری بکرے کی گردن پر چلائی ویسے ہی بکرے نے اگلے دو پیروں کو جنہیں قصاب رسی سے باندھنا بھول گیا تھا چلا کر موسمی قصاب کے ٹخنوں کو ہلکا سا زخمی کر دیا۔خیر ہم فوراً بکرے کے اگلے پیروں کو رسی سے باندھ دیا اور قصاب صاحب نے بکرہ ذبح کرنا شروع کیا۔جدھر سے بکرے کی گردن پر چھری چلائی جا رہی تھی موسمی قصاب ادھر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔لہٰذا جیسے ہی گردن کی رگیں کٹنا شروع ہوئیں خون کی دھا ریں قصاب نومشق کے چہرے کو لالہ زار بنا گئیں......دراصل موسمی قصاب بکرہ ذبح کرنے میں خا صے اناڑی ثابت ہوئے اور بڑی مشکل سے بکرا ذبح ہوا۔اب کھال اتارنے میں قصاب صا حب کو کافی دشواری ہوئی اور اس عمل کے دوران وہ کھال کے ساتھ ساتھ بکرے کی بوٹیاں بھی اتارنے لگے تو ہمیں بہت غصہ آیا۔"بھیا! کھال اتاریے، بوٹیاں نہیں۔" ہم نے موسمی قصاب کو ڈانٹا۔دریں اثنا سلیم پور، جمنا پار سے ہمارے چھوٹے بھائی بقر عید کی مبارک باد اور قربانی کا گوشت دینے کے لیے آ گئے۔ہم سے گلے ملنے کے بعد جیسے ہی بھائی کی نظر موسمی قصاب پر پڑی تو وہ ہنس کر بولے "ارے میر صاحب! آپ قصاب کب سے بن گئے۔؟" یہ سن کر قصاب صاحب نے سر جھکا لیا اور دو آنسو ان کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں بھائی سے کہا "خدا کے لیے کسی سے نہ کہیے گا، غریبی اور بے روزگاری سے تنگ آ کر بچوں کی خاطر یہ کام کرنا پڑا۔دراصل بقول ولی دکنی ؎

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

یہ شعر پڑھ کر وہ بغیر اجرت لیے ہی جانے لگے........"[1]

اسد رضا اپنے گرد و پیش کے ماحول اور واقعات پر گہری نظر رکھتے ہیں اور حالات

حاضرہ کا گہرا شعور۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع اور اپ ڈیٹ ہے۔ تبھی تو وہ ادب کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا طنز و مزاحیہ مضمون ''تخلیق وتنقید میں زلفم زلفا'' خصوصی طور پر ذکر کا حامل ہے جس میں وہ تخلیق وتنقید کے چولی دامن کے ساتھ کو بڑے دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں اور تخلیق وتنقید کو ایک دوسرے پر اہمیت دینے والے پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ وہ اردو ادب سے خاص لگاؤ رکھتے ہیں اور یوسف ناظم کی نظروں میں تو ''انھوں نے ادب کا صرف مطالعہ ہی نہیں کیا ہے اسے گھول کر پیا بھی ہے۔'' یہ اقتباس دیکھئے:

''مگر آپ نے ہی نئی نسل کو نظر انداز کر کے اردو ادب کی راہیں مسدود و محدود کرنے کی کوشش کی ہے۔ صرف بڑے بڑے ناموں سے مرعوب ہوتی رہی اور ان کے قصیدے پڑھتی رہیں۔'' تخلیق کا الزام سن کر تنقید چیخ کر بولی: ''تخلیق کی بچی! یہ تیرا بہتان ہے کہ میں بڑے ناموں سے مرعوب ہوتی ہوں اور ان کے قصیدے پڑھتی ہوں۔ یہ کام تو صرف تو نے ہی کیا۔ کبھی کسی بادشاہ کی مدح سرائی کی، کبھی کسی نواب کی جی حضوری، کبھی کسی سیاسی پارٹی کے گن گائے، کبھی کسی وزیر کے، کبھی کسی ظالم سرمائے دار کو مزدوروں کا مسیحا قرار دیا، کبھی کسی بدکار سیاست داں کو صاحب کردار ثابت کیا۔ یہ تمام کارہائے بد تخلیق کاروں نے اے تخلیق تیرے ہی سہارے کیے اور انعام واکرام حاصل کیے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو تیری زلفوں کو سنوارنے، تیرے رخساروں کو چمکانے اور تیری پیشانی کو دمکانے میں میرا ہی خونِ جگر شامل ہے۔'' [1]

مندرجہ بالا اقتباس ان کے علمی شعور اور موجودہ دور میں ادب کی حالت پر ان کے طنز کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ وہ ادب کے ساتھ ہو رہے کھلواڑ اور ادب کے نام پر ہو رہے مذاق سے بھی بخوبی آگاہ ہیں۔ جس میں کروڑ پتی انسان جو ادب کی الف، ب سے بھی واقف نہیں ہے لاکھوں روپے خرچ کر کے دوسروں کے کلام کو اپنے نام سے منسوب کر کے نہ صرف آل انڈیا مشاعرے پڑھنے کا افتخار حاصل کرتے ہیں بلکہ فرضی ایوارڈ، اعزاز اور خطاب سے بھی خوب سرفراز ہوتے ہیں۔ اسد رضا ادب میں در آئی اس آلودگی کو دور کرنے کے لیے اپنے طنز کے تیز و تیکھے نشتر چلاتے ہیں اور اسے اپنی مزاح کا نشانہ بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

"............دروغ بر سرِ راوی ایک نوع مشق شاعر نے ہمیں بتایا کہ ضلع نمائش کے مشاعرے میں پڑھنے کا موقع حاصل کرنے کے لیے اس نے کنویز کو دس ہزار روپے دیے تھے۔ جب ہم نے اس شاعر سے دریافت کیا کہ اتنے روپے صرف ایک غزل پڑھنے کے لیے کیوں دیے تو اس نے نہایت خندہ پیشانی سے جواب دیا" دراصل میں ایک آل انڈیا مشاعرے میں پڑھنے کا افتخار حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ یوں بھی دس ہزار کی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کیوں کہ میرا دودھ کا کاروبار ہے۔ دس ڈیریاں اور سو بھینسیں ہیں۔ دودھ میں پانی ملا کر میں ہر ماہ بیسیوں ہزار روپے کماتا ہوں۔ اس لیے دس ہزار کنویز کو دے دیے تو مجھ پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" [1]

"..........گذشتہ ماہ جب اپنی نمبر دو کی کمائی سے عرب پتی بنے نمائش خاں کو ایک ایسی ہی اسپانسرڈ تقریب میں "ادیب ہند" کا جلیل القدر خطاب دیا گیا تو بعض مستند اور صاحب طرز ادیبوں نے دبی زبان میں یہ اعتراض کیا "نمائش خاں نے اپنی تمام بے ادب کتب انٹرنیٹ سے چرائے گئے مواد میں اپنے زر خرید لوگوں سے معمولی ردو بدل کرا کے شائع کرائے ہیں۔ لہٰذا خاں صاحب کو "ادیب ہند" کا خطاب ہرگز نہیں دیا جانا چاہیے تھا۔" یہ اعتراض سن کر تقریب کے کنویز نے غصہ سے کہا "تو کیا یہ خطاب آپ جیسے قلاش ادیبوں کا دیا جاتا جو کسی کو ایک کپ چائے یا فلٹر سگریٹ بھی نہیں پلا سکتے......" [2]

"........اگر آپ چاہیں تو حضرت مے خوار مراد آبادی کی انجمن بصد احترام آپ کو "ای شاعر" کے اعزاز سے اور جناب بے باک بجنوری کی کلچرل سوسائٹی "مسٹر ای مین" کے خطاب سے نواز دے گی"۔ ہمارا مشورہ سن کر نمائش خاں کی باچھیں کھل گئیں۔ لیکن کچھ شرماتے ہوئے خاں صاحب نے آہستہ سے کہا "میں آپ کے دونوں دوستوں کو دو دو لاکھ روپے کے چیک تو اعزاز و خطاب کے لیے آج ہی دے دوں گا تاہم اس سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ انگریزی، اردو اور ہندی کے چند رسائل و اخبارات میں چند دانشوروں کے میرے بارے میں مضامین شائع ہو جائیں تا کہ میرے سلسلے میں عوام و خواص کے درمیان ساز گار اعزازی فضا قائم ہو جائے۔" "یہ کون سی بڑی بات ہے۔ ہم ابھی تھوک میں مضمون لکھنے اور لکھوانے والے معشوق کار

گلی سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ یہ کہہ کر ہم نے فوراً جناب معشوق سے موبائلی رابطہ قائم کیا اور عرض مدعا کیا۔ انہوں نے بتایا کہ انگریزی میں فی مضمون دس ہزار، ہندی میں دو ہزار اور اردو میں پانچ سو روپے ہوں گے.........." [1]

کیوں کہ اسد رضا کی نگاہ معاشرے اور انسانی نفسیات کے اندر اتر کر اس کا بغور مشاہدہ کرتی ہے۔ اس لیے حقائق کا بیان کرتے ہوئے ان کے قلم میں ایک خاص قسم کا طنز وجود پاتا ہے جسے وہ اپنے قلم میں موجود لطیف اسلوب کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ وہ جہاں موجودہ وقت میں ادبی دھاندلی کو بے نقاب کرتے ہیں وہیں وہ عہد حاضر میں گرتے ہوئے نظام تعلیم کو بھی طنز آمیز مزاح کا استعمال کر اپنے ہنر کا شاہکار نمونہ بنا دیتے ہیں۔ اپنے مضمون "اسکول کی تلاش" میں وہ کارپوریشن اسکولوں کی صورت حال بیان کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

"سب سے پہلے ہم اپنے محلے میں واقع کارپوریشن کے اسکول گئے۔ اسکول کی عمارت تو بڑی تھی۔ لیکن دیواروں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے گذشتہ دو دہائیوں سے سفیدی نہ ہوئی ہو۔ کھیل کا میدان مویشی خانہ بنا ہوا تھا۔ اونچی اونچی گھاس میں مویشی چر رہے تھے اور ان کے پاس ہی اسکول کے چند بچے کھیل رہے تھے اور ایک دوسرے کی ماں بہنوں سے رشتے جوڑنے والی گالیاں بھی دے رہے تھے۔ ہم اس مویشی خانے کو پار کر کے اسکول کی عمارت میں داخل ہوئے ایک کلاس میں جھانک کر دیکھا تو وہاں ماسٹرنی صاحبہ سویٹر بننے میں اور طلبا و طالبات شرارتیں کرنے میں مصروف تھے۔ ایک بچے نے دوسرے بچے کی کتاب پھاڑ دی تو دونوں گتھم گتھا ہو گئے اور ایک دوسرے کو پیٹنے لگے۔ شور سن کر ماسٹرنی صاحبہ نے لڑنے والے بچوں کو اپنی میز کے پاس بلایا اور انہیں مرغا بننے کا حکم دیا۔ بعد ازاں وہ پھر سویٹر بننے میں مصروف ہو گئیں........" [2]

کارپوریشن اسکول کے ساتھ ہی اسد رضا فائیو اسٹار پبلک اسکول کی اصلیت کو بھی بڑی معصومیت اور صاف گوئی سے بیان کرتے ہیں۔ جہاں معیاری تعلیم کے نام پر بھاری فیس اور رشوت خوری کا بازار گرم ہے۔

"کیا آپ اپنے بیٹے کا داخلہ کے لیے رجسٹریشن کرا چکے ہیں؟ جی نہیں، ہم نے نہایت ادب سے

کہا، میڈم! کیا داخلے سے پہلے رجسٹریشن کرانا لازمی ہے۔"

"بالکل! ہمارے اسکول میں تو بعض دور اندیش والدین ہنی مون پر جانے سے پہلے ہی اپنے ہونے والے بچے کا رجسٹریشن کرا دیتے ہیں۔ خیر! اگر آپ نے ابھی تک رجسٹریشن نہیں کرایا ہے تو اسکول کو ایک لاکھ ڈونیشن دے کر آپ رجسٹریشن کے بغیر بھی اپنے بچے کو ہمارے اسکول میں داخل کرا سکتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے اس حورِ تعلیم نے پروسپیکٹس اور فارم ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ون تھاؤزینڈ پلیز (مہربانی کر کے ایک ہزار روپے دیجئے)"[1]

مندرجہ بالا سطور پر غور کرنے سے ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اسد رضا نے اپنے مخصوص انداز میں نظامِ تعلیم کی ناہمواریوں کو ہمارے سامنے بے تکلف انداز میں رکھ دیا ہے۔ جس میں وہ عوامی زندگی کی ضروریات کی تکمیل میں پیش آئی کمزوریوں اور خامیوں کو تحریر موضوع بناتے ہیں اور صحافت سے منسلک ہونے کے باعث ان کی تخلیقات کے مختلف پہلو ایک عام طنز و مزاح نگار کے مقابلے زیادہ گہرائی اور گیرائی سموئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے متنوع موضوعات میں عصرِ حاضر کی حقیقی بصیرت بکھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ "ایک شعر بریانی"، "تعزیت کی آڑ میں" اور "افطار پارٹیوں کی زمرہ بندی" وغیرہ ان کے قلم کے ایسے نمونے ہیں جس میں وہ سیاسی مفاد حاصل کرنے اور کاروباری اشتہارات دینے والے لوگوں کو ہدف طنز بناتے ہیں اور سماج کے مختلف گوشوں کی جانب ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں:

"راویانِ سحر البیان اور شاعرانِ خوش الحان کے مطابق جنوبی دہلی کی ایک قدیم بستی حوض رانی کی نئی کالونی میں ایک ایسے مشاعرہ کا انعقاد ہوا جس میں کلام پر کم اور طعام پر زیادہ توجہ دی گئی بلکہ بعض سامعین کے جو بہر حال شعرا کے مقابلے میں اکثریت کا درجہ رکھتے تھے خیال میں محفلِ مشاعرہ میں پیش کردہ کلام سے کہیں زیادہ لذیذ اور خوش ذائقہ طعام تھا اور ہوتا بھی کیوں نہیں۔ آخر اس محفلِ مشاعرہ کا اہتمام علاقے کے ہوٹل مالکان نے ہی تو کیا تھا۔ ایک غیر مصدقہ اطلاع کے مطابق کل علاقہ جاتی مشاعرہ کا مقصد اردو کا فروغ کم اور ہوٹلوں کے کھانے کی پبلسٹی زیادہ تھی......"[1]

''پرچار پس افطار کے لیے اس مرتبہ سیاست دانوں بالخصوص متوقع امیدواروں نے کچھ نئے طریقے بھی ایجاد کیے۔ مثال کے طور پر مغربی ریاست کے ایک ضرورت سے زیادہ سیکولر غیر مسلم امیدوار نے روزہ خیر سگالی رکھا اور اپنی روزہ کشائی کی تقریب کا انعقاد نہایت تزک و احتشام سے کیا۔ یہی نہیں امیدوار موصوف نے روزہ کشائی کے بعد اپنے بنگلے پر نماز جماعت کا نہ صرف انتظام کیا بلکہ بہ نفس نفیس انہوں نے نماز خیر سگالی بھی باجماعت پڑھی۔ سنا ہے کہ اس امیدوار سے مسلم رائے دہندگان سب سے زیادہ متاثر ہوئے اور یہ کہ اس کی کامیابی میں مسلم ووٹ کا رول انتہائی اہم تھا۔'' ۲

''تعزیت کی آڑ میں'' میر مِنن جو پروفیسر کی یاد ایک تعزیتی جلسہ کرتے ہیں اشتہار میں پروفیسر کا ذکر کم اور اپنے عہدوں کی بڑائی زیادہ کرتے ہیں اور تقریر میں بھی اپنی خوب تعریف بیان کرتے ہیں:

''مرحوم نقوی انصاف پسند اور حق گو تھے۔ لہٰذا وہ ہمیشہ میری قائدانہ صلاحیت اور دیانت دارانہ سماجی حیثیت اور علمی قابلیت کی دل کھول کر ستائش کیا کرتے تھے۔ امسال چھوٹے امام باڑہ کی سیکریٹری شپ کے لیے جب انتخاب کی نوبت آ گئی تو نقوی صاحب نے ہی مجھ ناچیز کو اتفاق رائے سے دوبارہ سیکریٹری بنانے کی پرزور وکالت کی تھی اور میرے حق میں وہ ٹھوس دلائل پیش کیے تھے کہ میرے تمام مخالفین دانتوں تلے انگلی دبا کر رہ گئے تھے........'' ۳

اس قسم کے اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسد رضا ایک ذہین اور بے باک قسم کے فن کار ہیں۔ جو اپنے تجربات کے متعدد رنگوں کو جس روپ میں دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اپنی تحریروں میں بھر دیتے ہیں جو ان کے فن کو جلا بخشتے ہیں اور تفریح طبع کے ساتھ ساتھ انسان کو غور و فکر کرنے پر راغب کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے طنز و مزاح کے ذریعے زندگی میں موجود بے اعتدالیوں اور شخصیتوں میں پائے جانے والے تضاد کا مذاق اڑا کر زندگی کے لطف و انبساط میں اضافہ کرتے ہیں۔ ''گھریلو شوہر'' ان کے طنز و مزاح نگاری کا ایک بہترین نمونہ ہے، جس میں آج کے دور میں خواتین کو سرکار کی طرف سے ملے ریزرویشن اور زیادہ سہولتوں کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں، جس

کے زیر اثر عورتیں ملازمت کرتی ہیں اور شوہر گھر سنبھالتے ہیں:

''لیکن شیخ صاحب! آپ نے ہی ملازمت کیوں چھوڑی؟ اپنی بیگم سے نوکری چھوڑنے کا مطالبہ کیوں نہیں کیا آپ نے؟ ہمارا سوال سن کر وہ کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر کہنے لگے :بات یہ ہے کہ بیگم ایم۔ای یعنی ماسٹر آف انجینئر ہیں۔ جب کہ میں انجینئرنگ میں ڈپلوما ہولڈر ہوں۔ بیگم ایک بڑی کمپنی میں چیف انجینئر ہیں اور میں صرف جے۔ای تھا۔ بیگم کی تنخواہ پچاس ہزار روپے ماہانہ ہے اور میری صرف پانچ ہزار تھی۔ لہٰذا ایک چارٹیڈ اکاؤنٹینٹ سے سارا حساب کتاب لگوا کر ہی بیگم نے اپنی ملازمت کو جاری رکھنے اور مجھے استعفیٰ دلا کر گھریلو شوہر بنانے کا فیصلہ کیا۔''[1]

چونکہ اسد رضا کا مطالعہ نہایت وسیع اور اپ ڈیٹ ہے۔ اس لیے وہ دور حاضر میں سائنس کے میدان میں ہو رہے نئی نئی ایجادات اور الیکٹرانک آلات سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ اس لیے اکثر وہ اپنے مضامین میں الیکٹرانک آلات کا نہ صرف ذکر کرتے ہیں بلکہ ان کے فوائد کے ساتھ ساتھ ان کے نقصانات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں:

''............مثلاً کمپیوٹر دیکھ دیکھ کر ہماری آنکھیں کمزور ہوگئیں تو یہ کمزوری کیا ای بیماری نہیں ہے۔ یا اگر ہمارے پھیپھڑے ای سگریٹ کی وجہ سے خراب ہونے لگیں تو کیا آپ اسے ای بیماری نہیں کہیں گے؟ یہی نہیں ہماری بیماریوں کا علاج بھی ای طریقے سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہماری آنکھوں کا چیک اپ ای آلات یعنی کمپیوٹر رائیزڈ مشینوں سے ہی کیا گیا........آج میں نے کئی دوشیزاؤں سے ای رومانس کیا۔ 50 تاجروں سے ای مذاکرات یعنی ویب کیم کے ذریعے کاروباری بات چیت کی۔ 500 ای آلات یعنی کمپیوٹروں کی ایک خریداری کی اور ہماری کمپنی نے پانچ کروڑ کی اپنے سامان کی ای سیل کی........''[2]

اپنے مضمون ''یہ مسائل موبائل'' میں وہ موبائل کے مسئلے کو بڑی خوش اسلوبی سے بیان کرتے ہیں:

''..........خاں صاحب نے موبائل فون کے اتنے فوائد اور فضائل بیان کیے کہ ہم

نے اسی روز دفتر جا کر اپنے افسر اعلی سے یہ درخواست کی کہ وہ ہمیں موبائل دلانے کی زحمت فر مائیں۔ باس یعنی افسر اعلیٰ نے ہماری درخواست سن کر پہلے تو ہمیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور پھر غصہ سے بولے "بڑا افسر بننے کے لیے موبائل چاہیے؟" ہم نے فوراً عاجزانہ انداز میں کہا "سر! افسر تو آپ ہی ہیں، موبائل تو صرف اس لیے چاہتا تھا تاکہ فیلڈ میں کام کے دوران وقتاً فوقتاً آپ سے ہدایت حاصل کرتا رہوں۔" ہماری یہ دلیل جمیل سن کر افسر اعلی کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور انہوں نے فوراً اپنی پرسنل سیکریٹری کو حکم دیا کہ اسٹور سے ہمارے لیے ایک موبائل فون منگوایا جائے۔ بعد ازاں ہمارے افسر اعلیٰ نے ہمیں موبائل اس ہدایت کے ساتھ عنایت کیا کہ ہم اسے ہمیشہ کھلا رکھیں یعنی کبھی آف نہ کریں۔ کیوں کہ دفتر کو ہماری ضرورت کبھی بھی پڑ سکتی ہے۔ اس طرح صاحب موبائل ہونے کے بعد ہم دفتر کے ۲۴ گھنٹے کے ملازم ہو گئے......"[۲]

واقعی حقیقت تو یہ ہے کہ اسد رضا صاحب وقتی طور پر مزاح پیدا نہیں کرتے اور نہ ہی خیالی دنیا کی سیر کراتے یا قاری کا دل بہلاتے ہیں بلکہ وہ بدلتے ہوئے سماج کی حقیقت کے تجربات کو اہمیت دیتے ہیں اور اپنے اردگرد سے مواد اکٹھا کرتے ہیں۔ کیوں کہ یہ سچ ہے کہ کوئی بھی فن پارہ ادبی دائرے میں تب تک شامل نہیں ہوتا جب تک وہ سماج کی سچی عکاسی پیش نہ کرے۔ وہ زندگی کو احساس کے آئینے سے روشناس کراتے ہیں اور جدید متنوع موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں۔ بقول پروفیسر سید جعفر رضا:

"اسد رضا کی تخلیقی صداقت اسے موضوع کی واقعیت سے ہم آہنگ رکھتی ہے جس میں ذاتی تجربوں کو عمومی صداقت کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان کی طنزیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہماری گرد و پیش کی دنیا سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ہمارے مشاہدے کا حصہ ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی مضحکہ خیزی سے ہم پہلی بار روشناس ہوتے ہیں....."[۱]

"لیکن جہاں تک ہماری بیوی کا تعلق ہے تو انہیں کرکٹ سے اتنا ہی لگاؤ ہے جتنا ہمیں شاعری سے ہے۔ اس لیے وہ گھر اور باہر دونوں جگہ کرکٹی زبان بولتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی بچی ان کی حکم عدولی کرتی ہے تو وہ ڈانٹ کر کہتی ہیں "اگر میرا حکم نہیں مانا تو تجھے بول کی طرح نچا

دوں گی۔'' بیٹے کو وہ کچھ اس طرح سمجھاتی ہیں'' دل لگا کر نہیں پڑھو گے تو امتحان میں تمہارے وکٹ گر جائیں گے اور تم آؤٹ یعنی فیل ہو جاؤ گے۔'' ۲

'' آج کل کتابوں میں مقدمات، ابتدائیوں، دو لفظ، پیش لفظ وغیرہ کی شکل میں نثری قصیدہ خوانی کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں '' من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو'' پر عمل کرتے ہوئے بعض ادیب و شاعر ایک دوسرے کی شان میں قصیدہ خوانی کرتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ نثری قصائد اخبار و رسائل اور کتب میں شائع بھی ہو جاتے ہیں اور جلسوں میں پڑھے بھی جاتے ہیں۔ مثلاً گذشتہ دنوں دو ادھیڑ شاعروں نے ایک دوسرے کو میرؔ عصر اور غالبؔ دوراں ثابت کرنے کے لیے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ اب یہ بات دیگر ہے کہ اس باہمہ قصیدہ خوانی سے میرؔ اور غالبؔ دونوں کی روحیں شرمندہ اور طرفداران میرؔ و غالبؔ کی طبیعت پراگندہ ہوئیں تاہم ایک دوسرے کو حاجی کہنے والے دونوں شاعروں کو اس نثری قصیدہ خوانی سے عارضی اور سستی شہرت ضرور مل گئی اور چند مشاعروں میں انہیں غیر شعر فہم منتظمین مشاعرہ نے بصد احترام مدعو بھی کیا۔'' ا

'' سنا ہے پہلے کچھ لوگ بیوی گزیدہ ہوا کرتے تھے۔ لیکن بقول نمائش خاں اب ٹی وی گزیدہ حضرات بھی ملنے لگے ہیں۔ ٹی وی اور بیوی کے تعلق باہم پر تو متعدد دانشوران کرام اور ماہرین بیویات، ٹیویات روشنی ڈال چکے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک اونچا سننے والے دانشور نے تو ٹی وی اور بیوی کے درمیان مماثلت اور تفریق کو اجاگر کرتے ہوئے یہ تک کہہ دیا تھا کہ '' ٹی وی اور بیوی دونوں بولتے ہیں اور بہت بولتے ہیں۔ لیکن ٹی وی کا سوئچ آف کر کے اس کی بولتی کو بند بھی کیا جا سکتا ہے۔ البتہ بیوی کی زبان کو آسانی سے نہیں روکا جا سکتا۔'' تاہم میں اس دانشور سے صد فی صد متفق نہیں ہوں۔ کیوں کہ ٹی وی سیریل بالخصوص ساس بہو سے متعلق سیریل دیکھتے وقت عموماً بیویاں اتنی کھو جاتی ہیں کہ وہ بولنا بھول جاتی ہیں........'' ۲

اسد رضا کے طنز و مزاحیہ مضامین کی ایک اہم خوبی ان کے دلچسپ اور نرالے عنوانات بھی ہیں جو جدید اور متنوع ہونے کے سبب قاری کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ مثلاً '' تخلیق و تنقید میں ذلفم زلفا''، '' بیوی جہیز اور ہم''، '' ای رومانس''، '' خاوند بچاؤ تحریک''، '' گنجا مشاعرہ''، '' پس رسم

اجراء''، ''فن دادطلبی''، ''الیکٹرانک رشتہ داریاں''، ''قصہ ادبی آلودگی کا''، ''ادبی اسپتال''، ''مرغا ماسٹر''، ''گھریلو شوہر''، ''ایک شعر بریانی''، ''گھروالی جمہوریت''، ''انٹرویو نوکرانی مہارانی کا''، ''ٹی وی گزیدہ'' وغیرہ ان کے مضامین کے ایسے انوکھے عنوانات ہیں جو اپنے اندر بلا کی کشش سموئے ہوئے ہیں کہ قاری انہیں پڑھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا ہے۔

اسدؔ رضا کے مجموعوں کا جائزہ لینے پر ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے مجموعوں میں جو سفرنامے موجود ہیں۔ وہ بھی ان کے قلم کی لطافت میں ڈوبے ہوئے ہیں، جنہیں وہ جدت بیانی اور شیریں زبانی کے ساتھ ایک خاص ادا سے تحریر کرتے ہیں۔ سفرنامے میں قلم کار در اصل کسی مقام کی سیر اس طرح کراتا ہے کہ وہ تمام چیزیں جن سے اس کا سفر کے دوران سابقہ پڑتا ہے قارئین کی نظروں کے سامنے پھر جاتی ہیں۔ وہ جس جگہ کی سیر خود کرتے ہیں اپنے قاری کو بھی بذریعہ قلم وہاں لے جاتے ہیں۔ اسدؔ رضا اپنے سفرناموں کا آغاز بڑے ظریفانہ انداز میں حسن و توازن کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

''جب ہمارے بوس نے تحکمانہ انداز میں کہا'' آپ کو کنیا کماری تک جانا ہے'' تو مارے خوشی کے ہمارے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ کیوں کہ گذشتہ دس برسوں میں باس نے ایک مرتبہ بھی کنیا کنواری تک تو کیا کسی ضعیفہ تک جانے کے لیے بھی نہیں کہا تھا۔ لہٰذا ہم نے کچھ شرماتے اور کچھ گھبراتے ہوئے دریافت کیا'' سر یہ کنواری کنیا کہاں رہتی ہے؟............'' [1]

یہ اسدؔ رضا کی خاص خوبی ہے کہ وہ معمولی سے معمولی بات کو بھی مزاح کے پیرائے میں اس طرح ڈھال دیتے ہیں کہ قارئین مسکرائے بغیر نہیں رہ پاتے اور سفر کے دوران کے ملنے والے مقامات و واقعات کو بھی بڑے ہنر سے بیان کرتے ہیں مثلاً ایران کے سفر کے دوران مشہد مقدس مقام کے ایک واقعے کو اپنے لفظ کی جادوگری سے اس طرح بیان کرتے ہیں:

''مشہد مقدس شیعہ فرقے کے لیے ایک انتہائی متبرک مقام ہے۔ امام علی رضا کے روضہ کے پاس ہی رضا مارکیٹ ہے۔ جہاں سجدہ گاہیں، جانمازیں، تسبیحیں اور عربی آیات کے حامل سفید کپڑے سے بنے ہوئے کفن وغیرہ فروخت ہوتے ہیں۔ چونکہ شیعہ عقیدے کے مطابق

امام علی رضاؑ کے روضہ سے مس کیے ہوئے کفن کے باعث مردے کو ثواب ملتا ہے۔ لہٰذا مشہد مقدس جانے والے بیشتر شیعہ زائرین بڑی تعداد میں کفن خرید کر لے جاتے ہیں۔ ہمارے ساتھ ملتان یونیورسٹی، (پاکستان) کی فارسی کی ایک سنی لیکچرر بھی تھیں، جنہیں کفن سے متعلق اس شیعہ عقیدے کا علم نہیں تھا۔ جیسے ہی وہ رضا مارکیٹ کی ایک دوکان میں داخل ہوئیں تو ایک نوجوان دوکاندار نے ان سے فارسی زبان میں دریافت کیا۔ کیا انہیں کفن چاہیے؟ بس اس سوال کو سن کر لیکچرر صاحبہ غصے میں آگئیں۔ دراصل وہ سمجھیں کہ نوجوان دوکاندار ان سے مذاق کر رہا ہے اور انہیں (معاذ اللہ) بوڑھا سمجھ کر کفن کی بات کر رہا ہے۔ محترمہ نے فارسی زبان میں دوکاندار کو صلوتیں سنانا شروع کر دیں۔ کفن تیری جوانی پر پڑے۔ تیرے ماں باپ، بہن بھائی اوڑھ کر سوئیں، موئے مجھے کفن خریدنے کی کیا ضرورت؟"[1]

ان کے خاکوں میں موجود ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں میں شخصیت کے حیات و کارنامے سے لے کر زندگی کے دلچسپ واقعات بھی موجود ہیں۔ جن کو انہوں نے اپنی حسن نیت اور حسن قلم کے ساتھ بڑی خوبی سے تحریر کر ایسے پیکر تراشے ہیں جن میں خاکہ نگاری کے مختلف رنگ ابھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔

"..........ایک مرتبہ ہم نے گلزار صاحب سے دریافت کیا "سائنس حقائق کی تحقیق کرتا ہے اور ادب حقائق کو مبالغہ آرائی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ لہٰذا کیا ایک شاعر وادیب کو سائنس کی دنیا کی کمان سنبھالنے میں دشواری پیش نہیں آئی؟" یہ سوال سن کر گلزار صاحب نے کہا "ارے بھئی! سائنس میں بھی تو خوردبین سے چھوٹے چھوٹے ذرات خلیوں اور جراثیم کو بڑھا چڑھا کر دیکھا جاتا ہے تاکہ سائنسی تحقیق آسانی سے کی جاسکے۔ اس طرح ادب میں سماجی، معاشی، ثقافتی، مذہبی، تعلیمی اور سیاسی معاملات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے تاکہ قارئین، سامعین اور ناظرین کو دین و دنیا کا آئینہ آسانی سے دکھایا جاسکے۔ اس لیے سائنس اور ادب ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔"[2]

اسد رضا صاحب نے اپنے خاکوں میں سبھی شخصیات کے ڈیل ڈول اور نین نقش میں

اپنی برجستہ بیانی سے اس طرح رنگ بھرتے ہیں کہ اس ہستی کی ہستی بولتی اور چلتی پھرتی تصویر آنکھوں کے سامنے چھن سے آجاتی ہے اور قاری خود کو اس انجان شخص سے شناسا محسوس کرتا ہے۔ مثلاً اپنے ایک خاکے ''مظہر امام: بڑا ادبی نام'' میں وہ مظہر امام کے خاکے کو خوش ذوقی کے ساتھ اس طرح تراشتے ہیں:

''ادبی ثروت مند کی کہانی لمبی چوڑی پیشانی، علمیت و تجربات کی روشنی سے منور، سوچتی ہوئی آنکھیں، آزاد غزل کے کھڑے اشعار جیسی کھڑی ناک، میؔر کے مصرعوں کی مانند نازکی والے لب، دیوان غالبؔ سے ملتا جلتا کتابی چہرہ، اپنے ادبی قد کی طرح لمبا قد، نرم گفتار، سبک رفتار، بہار کی شگفتگی اور کولکاتہ کی شائستگی سے معطر کردار کا حامل کوئی شخص اگر راجدھانی دہلی کے میورو ہار فیز 1 کی صاف ستھری سڑک پر ہاتھ میں بید لیے ہوئے ٹہلتا ہوا مل جائے تو سمجھ لیجئے آپ کو دوردرشن کے سابق ڈائریکٹر، آزاد غزل کے بانی اور اردو کے ایک نامور شاعر و ادیب صاحب اکرام و انعام مظہر امام کا دیدار نصیب ہوگیا۔''[1]

جہاں تک اسدؔ رضا کے خاکوں کے عنوانات کا سوال ہے تو وہ بھی ان کے مضامین کی طرح دلچسپ و متنوع ہیں۔ مثلاً ''خوبرو اردو''، ''اردو کا ایک پکا رنگ: گوپی چند نارنگ''، ''طنز و مزاح کا چار مینار: مجتبیٰ حسین''، ''شہر یار سخن''، ''نواز کی دلنوازیاں''، ''قمر شاعری کا رئیس الادب وہ'' وغیرہ ان کے خاکوں کے ایسے عنوانات ہیں جنہیں پڑھتے ہی قاری ان خاکوں کی خوبیوں اور خامیوں سے بڑی حد تک آشنا ہو جاتا ہے۔ ''حکیم التنقید شارب ردولوی'' کے خاکے میں وہ خود اپنے انوکھے عنوان کی وضاحت کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''شاید آپ کو ہمارے اس مضمون کے عنوان پر ہی اعتراض ہو۔ لیکن اگر حکیم الدین، حکیم الامت، حکیم السیاست اور حکیم المعاشیات ہو سکتے ہیں تو حکیم التنقید کیوں نہیں ہو سکتے۔ یوں بھی اردو تنقید کا مرض اتنی پیچیدگیوں میں مبتلا ہو گیا ہے کہ اب اسے حکماء بلکہ حکام نما حکماء کی ضرورت ہے........''[2]

ہر فن میں ماہر اسدؔ رضا صرف ایک شاعر اور طنز و مزاح نگار ہی نہیں ہیں بلکہ ایک صحافی

کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں۔ روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' میں وہ قریب پچھلے بارہ سالوں سے مشہور و مقبول طنزیہ و مزاحیہ کالم ''تلخیاں'' لکھتے آرہے ہیں۔ جس میں وہ عہد حاضر کے مسائل پر بے باک اور دلچسپ جملوں میں قارئین کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ دراصل کالم ایک طرح کا صحافی فیچر ہے۔ جس میں منتخب موضوعات پر کالم نگار اپنے مخصوص انداز میں رائے پیش کرتا ہے اور موضوع کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کراتے ہوئے قارئین کے ذہن کو فکر عطا کرتا ہے۔ در حقیقت دور جدید میں کالم نگاری ایک خاص اہمیت کی حامل ہے اور کالم نگار کے اکثر تبصرے تو دقیق اور پیچیدہ مسائل تک سلجھانے میں معاون و مدگار ثابت ہوتے ہیں۔ کیوں کہ طنزیہ و مزاحیہ کالم میں قلم کار معاشرے کی محرومیوں، کمزوریوں اور برائیوں کو بڑی خوبی کے ساتھ اپنا موضوع بناتا ہے۔

اسدؔ رضا حالات حاضرہ کے ایک ایسے ہی وقعت و اہمیت کے حامل صحافی ہے جو معاشرہ سے پورے طور پر آگاہی رکھنے کے سبب روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے حادثات و واقعات کو بڑی حسن و خوبی کے ساتھ اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں اور خوش طبعی سے معاشرے کی خامیوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ بقول مجتبیٰ حسین:

''اسدرضا ایک معروف صحافی، ذہین طنز و مزاح نگار اور مخلص انسان ہیں۔ ان کے طنز میں ہمدردی اور مزاح میں شگفتگی پائی جاتی ہے۔'' [1]

اسدؔ رضا کی کالم نگاری کے چند نمونے جو ان کی قلم کی شائستگی اور ایمانداری کا ثبوت پیش کرتے ہیں اور جو ہر قسم کی لاگ و لپیٹ سے پاک ہیں، قارئین کے پیش نظر ہیں:

☆ عالم یوم بزرگان منایا گیا۔ ایک خبر

• اور اس موقع پر بعض نوجوان سیاست دانوں نے دعا کی کہ بزرگ وزرا جلد اللہ کو پیارے ہو جائیں تا کہ وہ وزیر بن سکیں۔

☆ انا ہزارے کے حامیوں نے صفائی مہم چلائی۔ ایک خبر

• لیکن کرپشن کا صفایا پھر بھی نہ ہو سکا۔

☆ دولت مند زیادہ ٹیکس دینے کے لیے تیار رہیں۔ پی چدمبرم

• اور عوام زیادہ مہنگائی جھیلنے کے لیے

☆ فرضی دستاویزات سے بینک سے لاکھوں نکالے۔ ایک خبر

• لہٰذا بینک کے اصلی ملازمین گرفتار کیے جائیں۔

☆ بے روزگاری کے خاتمہ کے لیے پائلٹ پروگرام۔ ایک خبر

• جس سے کم سے کم پروگرام کے لیے رکھے جانے والے ملازمین کی بے روزگاری تو ختم ہو جائے گی۔

اس طرح ان کے تمام کالموں میں فکر و فن کو سمیٹے ہوئے ان کے ہنر کی بے مثال جھلکیاں بآسانی دیکھی جا سکتی ہیں جس میں وہ واقعہ نگاری میں اپنے حسن و بیان سے ایک دلکش اور منفرد رنگ بھر دیتے ہیں۔ جس کے سبب وہ اپنے ہم عصر کالم نگاروں میں بھی ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین ان کے اس فن پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"اسد رضا ہر فن مولیٰ قسم کے انسان ہیں۔ شاعری کے راستہ سے ادب میں داخل ہوئے۔ پھر صحافت کو نہ صرف گلے سے لگایا بلکہ اپنے گلے کا ہار بنا لیا۔ گلدان صحافت کے سارے ہی شعبوں سے ان کی طویل وابستگی رہی ہے۔ پچھلے چند برسوں سے وہ طنزیہ کالم نگاری کے حوالے سے اردو طنز و مزاح کے دشت کی سیاحی بھی فرمانے لگے ہیں۔ ان کی طنزیہ اور مزاحیہ تحریریں اکثر اخبارات اور رسائل میں نظر سے گزرتی ہیں اور اسی نسبت سے وہ ہمیں عزیز بھی ہیں۔ کم از کم ہندوستان کی اردو صحافت میں طنزیہ کالم نگاری کی روایت اب ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ایسے ویران اور سنسان ماحول میں اسد رضا اپنی شگفتہ تحریروں کے ذریعہ اس روایت کو آگے بڑھانے میں حتی المقدور اپنا حق ادا کر رہے ہیں۔" [1]

[1] سہ ماہی رسالہ انتساب، مجتبیٰ حسین، شمارہ نمبر ۶۷، ص ۱۵۱

معروف تنقید نگار - ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی

ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی ادب کی دنیا میں بحیثیت تنقید نگار معروف ہیں۔ایک سائنس دا ل ہونے کے باوجود اب ان کا مشغلہ اردو ادب کی خدمت ہے۔ضلع بجنور کا یہ سپوت اردو کی ترقی میں کردار ادا کر رہا ہے۔تقریباً دو درجن کتابوں کے خالق ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی کے بارے میں کاروان ادب بھوپال کے مدیر کوثر صدیقی لکھتے ہیں وہ عرصہء دراز سے بچوں کا کردار ساز ادب تخلیق کر رہے ہیں۔شمیم صاحب کی نظر نو جوانوں میں شعر و ادب اور تہذیبی روایات سے ہٹتے ہوئے رجحان پر ہے۔ڈاکٹر شمیم احمد کی کتاب گنجینہء رباعیات پر اپنی رائے دیتے ہوئے پروفیسر طلحہ رضوی (پٹنہ) لکھتے ہیں ''شمیم احمد صدیقی نگینوی کے رچے ہوئے شعری ذوق اور وسعت مطالعہ کی جس نے ان سے ایسی منفرد کتاب مرتب کرا دی جس کی نظیر نہیں۔گنجینہء رباعیات اپنی خصوصیات اور محاسن کے اعتبار سے بے شک ایک انوکھا مجموعہ ہے جس کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔بلاشبہ یہ نوجوانوں اور بیعت بازی جیسے شغل سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بیحد اور مفید اور کارآمد ثابت ہوگا۔ڈاکٹر شمیم صاحب کی جدت پسند طبیعت نے اس کام میں محنت اور مشقت کو راہ دی اور ایسی ریاضت کرائی کہ ایک یادگار مجموعہء رباعیات وجود میں آ گیا۔

ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی کی پیدائش قصبہ نگینہ میں 1946ء کو ہوئی۔ان کی پوری زندگی جہد مسلسل اور عمل پیہم کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ڈاکٹر شمیم کی کم عمری میں ''ڈیڑھ، دو سال تک ابتدائی تعلیم جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں اقامتی طالب علم کی حیثیت سے ہوئی۔کچھ عرصہ پرائیویٹ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ساتواں درجہ اپنے وطن نگینہ سے، آٹھواں اور نواں درجہ گورنمنٹ کالج جھانسی سے اور دسواں درجہ نگینہ سے پاس کیا۔لکھنؤ یونیورسٹی سے بی ایس سی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ڈاکٹر شمیم نے 1964ء میں ایم ایس سی کیمیاء پاس کرنے کے بعد تین سال تک امیر الدولہ اسلامیہ کالج میں تدریسی خدمات انجام دیں اور 1967ء سے 1979ء تک سی ایس آئی آر (CSIR) کے جونیئر ریسرچ فیلو رہ کر دوائی پودوں کے کیمیاوی ریسرچ کی ملازمت میں پرموشن کے دروازے بند ہونے پر بھی ڈاکٹر شمیم نے ایسے کارہائے نمایاں انجام دئے کہ مرکزی حکومت

کے محکمۂ صحت نے 2005ء میں ان کو لائف ٹائم ایچومنٹ ایوارڈ اور پچیس ہزار روپیہ کے نقد انعام سے سرفراز کیا۔ ہندوستان کے بیشتر صوبوں بلکہ سری لنکا، ملیشیا، انڈونیشیا، سنگاپور اور بنگلہ دیش کے سفر کئے۔ انہوں نے وقت کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے قوم کے بچوں کو اغیار کے اسکولوں کی بے دینی سے محفوظ رکھنے کی خاطر 1985ء اور بعد کے برسوں میں الہدیٰ ماڈل اسکول نام کے انگلش میڈیم اسکول کے قیام اور فروغ میں بحیثیت فاؤنڈر سکریٹری انتھک محنت کی۔

دہرہ دون قیام کر کے ہمالین انسٹی ٹیوٹ آف فارمیسی اینڈ ریسرچ کو شروع کرنے میں مدد کی۔ اس کے بعد سے انہوں نے خود کو اردو زبان کے فروغ کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ چنانچہ اس وقفہ میں انہوں نے چھوٹے بچوں کو کھیل کھیل میں اردو سکھانے کے لئے تعلیمی تاش شائع کئے۔ ثانوی درجات کے بچوں میں اردو کا ذوق پروان چڑھانے کے لئے بیت بازی کی جامع کتاب ''گلدستۂ بیت بازی'' شائع کی۔ 2009ء میں اس نادر انتخاب کو ''عکس بر عکس'' نام کی کتاب کی شکل میں شائع کیا۔ گذشتہ چار سالوں میں ان کے سائنس، طب اور اردو شعر و ادب سے متعلق کئی درجن مضامین اور ہر موضوع کی اردو کتب پر کئی درجن تبصرے بھی مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے۔ پانچ جلدوں پر مشتمل ایک ضخیم شعری مجموعہ ''گلدستہ در گلدستہ'' کی اشاعت کی۔

''ادبی معلوماتی پہیلیاں'' بھی ڈاکٹر شمیم کے تخلیقی و تحقیقی ذہن کی ایک انوکھی دین ہے۔ کُل پانچ سو پہیلیوں پر مشتمل ایک کتاب میں انہوں نے کھانے پینے کی چیزوں، روزمرہ استعمال کی چیزوں، پرندوں، جانوروں۔ کھیلوں، تاریخی مقامات اور واقعات وغیرہ سے متعلق دس دس پہیلیوں کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ تھوڑی بہت اردو جاننے والے بچے اور بڑے ان کے حل تلاش کرنے میں بے حد محظوظ ہوتے ہیں۔ اور اردو کے نئے نئے الفاظ سے متعارف ہونے کے علاوہ ان کی عام معلومات میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے۔ گنجینۂ رباعیات شمیم احمد صدیقی کا تحقیقی کارنامہ ہے جس میں الف سے ی حروف والے رباعیات شامل کی گئی ہے۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی

نگینہ کا نگینہ: علینا عترت

ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی

اس حقیقت سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ اُردو کے نثری ادب (فکشن) کے مقابلہ اس کے شعری ادب میں خواتین کا حصہ بہت کم رہا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اوّل تک حصول علم کے لئے خواتین کا گھر سے باہر قدم نکالنا بڑا معیوب سمجھا جاتا تھا اور شعر و شاعری کو عموماً کارِ فضول بلکہ حد درجہ مکروہ فعل تصوّر کیا جاتا تھا۔ جن ادب نواز گھرانوں میں شعر و شاعری کا ماحول تھا اُن گھرانوں کی خواتین اپنے فطری ذوق کی تسکین کے لئے وسیع القلب بزرگوں کی سرپرستی میں سُخن دانی کے رُموز سے واقفیت حاصل کر کے زیادہ تر حمدیہ، نعتیہ، رثائی یا منقبتی انداز کی نظمیں تخلیق کرتی تھیں۔ بہاریہ یا رومانی غزلیات اگر کہی بھی جاتی تھیں تو اُن کا لب ولہجہ نسائی نہیں ہوتا تھا۔ 1950 کے بعد خواتین کے تعلیمی رجحان میں اضافہ کے ساتھ اُردو شاعرات کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوا، لب ولہجہ میں بھی تبدیلی آئی اور اُن کی تخلیقات ادبی جرائد کی زینت بننے کے علاوہ مشاعروں کی اسٹیج پر بھی گونجنے لگیں۔

مغربی اترپردیش کے بجنور ضلع میں نگینہ نام کا ایک بڑا قصبہ ہے جس کی زرخیز زمین نے اپنے نام کی مناسبت سے زندگی کے ہر شعبہ میں انسان نُما نگینوں کو وجود بخشا ہے۔ چنانچہ روحانیت کے شعبہ میں حضرت شاہ محمد یٰسین صاحب جیسے پائے کے بزرگ ظاہر ہوئے جن کے فرمانے پر شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نے ''فضائل قرآن'' نامی شہرہ آفاق کتاب کی تدوین کی۔ یہ کتاب ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں کے علاوہ درجن بھر غیر ملکی زبانوں میں بھی شائع ہو چکی

ہے اور کروڑوں اہلِ ایمان کو فیض یاب کر رہی ہے۔ سیاسی میدان میں حافظ محمد ابراہیم جیسے منظم، مدبّر اور منکسر المزاج شخص نے خود کا ایسا لوہا منوایا کہ وہ نہ صرف صوبائی اور مرکزی حکومتوں میں وزیر بنائے گئے بلکہ صوبۂ پنجاب کے گورنر بھی بنائے گئے۔ ثقافتی میدان میں رفعت سروش جیسا مشہور زمانہ ادیب، شاعر، صحافی اور ڈرامہ نگار پیدا ہوا جس نے آخری دم تک یعنی ۸۲ سال کی عمر تک اُردو زبان و ادب کی ایسی خدمات انجام دیں کہ اب اُردو زبان و ادب کا کوئی تذکرہ اُن کے نام کے بغیر ادھورا سمجھا جانے لگا۔ ان ہستیوں کے علاوہ اسی قصبہ کی مٹی نے ایک ہی گھر میں پانچ بہنوں کی شکل میں شاعرات کی ایسی کہکشاں کو بھی وجود بخشا جس کی شاید ہی کوئی دوسری مثال بر صغیر کے کسی گھرانے میں دیکھنے کو ملے۔ نگینہ کے مشہور محلہ سرائے میر کے سید التجا حسین زیدی اس معنی میں بڑے خوش قسمت ثابت ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آٹھ سعادت مند بیٹیاں اور دو بیٹے عطا فرمائے جو اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوئے اور پانچ بیٹیوں نے اپنی تمام خانگی اور دیگر ذمہ داریوں کو نبھاتے ہوئے لیلیٰ اُردو کے گیسوئے پریشاں کو سنوارنے کا کام بھی انجام دیا۔ چنانچہ ازدواجی رشتوں سے منسلک ہونے کے بعد شمیم زہرا اور نصرت مہدی نے سرزمین بھوپال میں، نزہت زہرا نے پاکستان میں، منیر زہرا (مینا نقوی) نے اغوان پور ضلع مراد آباد میں اور علینا عترت رضوی نے نوئیڈا میں قیام کرتے ہوئے اپنی شاعری کے ذریعہ نگینہ کا نام روشن کیا۔

علینا عترت اپنے دس بہن بھائیوں میں آٹھویں نمبر پر ہیں اور پانچ شاعرات میں سب سے چھوٹی بہن ہیں۔ انہوں نے اپنے شوہر محمد فاضل رضوی، جو کہ کول انڈیا (Coal India) میں انجینئر ہیں، کے ساتھ مل کر اپنے ایک بیٹے اور بیٹی کو اعلیٰ عصری تعلیم سے آراستہ کرنے کے ساتھ ہی ان کو اس قدر اُردو بھی سکھائی کہ وہ اپنے بزرگوں کی اُردو تصانیف سے کماحقہٗ فیضیاب ہو سکیں۔ یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ 6رجون 1967 کو پیدا ہوئی علینا کی شاعری کی ابتدا پختہ عمر میں عجب انداز سے 2011 میں ہوئی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد کم و بیش 15 ربرس تک درس و تدریس سے وابستگی اور بچوں کی دیکھ ریکھ نے ان کے اندر چھپے ہوئے قدرتی شاعر کو باہر آنے سے روکے رکھا۔ لیکن جب وہ سخت بیمار ہو کر گھر میں مقید ہوئیں اور بچے بھی خاصے

سمجھدار ہو گئے تھے وہ اس شاعر کو باہر آنے سے نہ روک سکیں۔ اس لطیف واقعہ کا ذکر انہوں نے 2011 میں کہی گئی 18/اشعار پر مشتمل ''تکمیل'' نام کی طویل نظم میں کچھ اس طرح کیا ہے۔

پھر ایک روز کسی نرم نرم جھونکے نے
کہا یہ کان میں آکر بہت ہی چپکے سے
ذرا سا آنکھوں کو کھولو تو تم کو دکھلاؤں
مہکتی زندگی کیسے ہے تم کو سکھلاؤں
کہاں سے آئی ہو کب سے یہاں کھڑی ہو تم
میرے وجود کے ہر رنگ سے جڑی ہو تم
یہ گنگناتی ہوئی وادیاں یہ گلکاری
ندی کی جھومتی ہوئی یہ کلکاری
یہ دھوپ چھاؤں کے بادل یہ مخملی احساس
مچل رہے ہیں بہت پیار سے تمہارے پاس
مہکتے دل ہیں یہاں خوشبوئے محبت سے
خدا کے نور سے پیدا ہوئی حرارت سے
ہوا کا جھونکا جو کانوں میں اس کے بول گیا
تو اس نے چونک کے پلکوں کو اپنی کھول دیا

شاید ہمارے قارئین میں سے بہت سے حضرات اس امر سے ناواقف ہوں کہ پنڈت آنند نرائن ملاّ نے بھی بغیر کسی استاد کی بیساکھیاں استعمال کیے اور ہائی کورٹ کا جج رہتے ہوئے اردو شاعری کی تمام اصناف پر ایسی دسترس حاصل کی اور ایسے گل بوٹے بکھیرے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (این سی پی یو ایل) نے 2010 میں خلیق انجم کی مدد سے سات سو ستر (770) صفحات پر مشتمل ان کی کلیات شائع کی۔ علینا کی خداداد شاعری بھی اسی قسم کی مستثنیات میں سے ہے البتہ

اپنے اطمینان کے لئے انہوں نے اپنے کلام کا کچھ حصہ شاعر زماں فرحت احساس کو دکھا کر اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کی سند بھی حاصل کرلی۔ اپنے تدریسی فرائض کی ادائیگی کے دوران علینا نے بچوں کے لئے خاصی تعداد میں اخلاقی اور معلوماتی کہانیاں بھی مرتب کی تھیں۔ جن میں سے بیشتر آکاش وانی بھوپال سے نشر ہو چکیں اور عنقریب کتابی شکل میں شائع ہونے والی ہیں۔ یہ بات بھی انتہائی قابل تعریف ہے کہ 2011 میں دل ودماغ کے مختلف گوشوں میں دبے بیٹھے شاعر کو جب باہر آنے کا موقع ملا تو انہوں نے اس کی ایسی حوصلہ افزائی اور خدمت کی کہ صرف چار برس کی مختصر مدت میں ان کے کلام کا اولین مجموعہ ''سورج تم جاؤ'' 2014 کے آخر میں سخن شناس صاحبان کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ ادبی حلقوں میں ان کی نثری و منظوم نگارشات کی بازگشت سنائی دینے پر 2014 کے آخری ایام میں علینا کو عالمی فروغ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اور اب حال میں دہلی اردو اکادمی نے اس مجموعہ کلام کو اوّل انعام کا مستحق قرار دیا۔ راقم السطور کے ناقص علم میں ابھی تک اس طرح کی کوئی دوسری مثال نہیں آئی کہ شاعری کی ابتداء کے بعد محض ۴ برس کے وقفے میں کسی شاعر کا اوّلین مجموعہ کلام منصۂ شہود پر آگیا ہو اور اس پر ملک کے مختلف شعبوں میں قائم کم وبیش ڈیڑھ درجن اردو اکادمیوں میں سے کسی اکادمی نے اول انعام بھی عطا کیا ہو۔

''سورج تم جاؤ'' میں کل سو (100) غزلیات، اٹھارہ (18) آزاد اور پابند نظمیات اور نو (9) قطعات ہیں۔ مجموعہ کلام کے عنوان اور اس کے دیباچہ میں نقل سورج سے کئے گئے مکالمہ کو پڑھ کر قاری کو عجب قسم کے لطف اور کیف کا احساس ہوتا ہے۔ گویا سورج ایک شفیق ماں کا وہ کھلنڈرہ بچہ ہے جو اپنی ماں کو سکون سے کام نہیں کرنے دیتا لیکن ماں اپنی ممتا سے مجبور ہو کر اس کو محض پیار سے سمجھانے پر ہی اکتفاء کرتی ہے۔ ہم طوالت سے بچنے کیلئے صرف شروع کے چند جملے قارئین کی نذر کر رہے ہیں۔

''سورج تم پھر آگئے؟ سورج تم جاؤ............ میں اندھیرے میں رہنے کی عادی، خوش ہوں اس عالم تنہائی میں، سرد راتوں نے بہت محبت سے سنبھال رکھا ہے مجھے۔ رات سے گہری دوستی ہے میری، تم کیوں آئے ہو؟ اب اس سے پہلے کہ تمہاری یہ دھوپ میرے تن بدن میں

احساسات کی حدت بھر دے، تم جاؤ، سورج تم جاؤ۔"

علینا کی غزلیات کو سرسری طور پر دیکھنے سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے خود کو کسی ازم یا ادبی گروہ سے وابستہ نہیں کیا بلکہ اپنے ذہن کی کھڑکیوں کو پوری طرح کھلا رکھ کر بڑی چابکدستی اور احساس ذمہ داری کے ساتھ شعروں کی تخلیق کی ہے۔ عہد حاضر کے گھٹے گھٹے ماحول میں ان کے کلام کا نرم اور نکھرا ہوا لہجہ نیز شگفتہ پیرایۂ اظہار ایک بالکل تازہ خوش گوار آواز کا درجہ رکھتا ہے۔ اور قاری سے انکی فن دانی کا لوہا منواتا ہے۔ انہوں نے اپنی غزلیات میں سورج، چاند، چراغ، ہوا، مٹی، روح اور بدن کو ان کے اصل معنوں میں اور بطور استعارہ بھی جا بجا استعمال کیا ہے اور ان سے نئے نئے مطالب نکالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش خدمت ہیں۔

اُداسی، شامِ تنہائی، کسک، یادوں کی بے چینی
مجھے سب سونپ کر سورج اُتر جاتا ہے پانی میں

سوگیا تھا جو سرِ شام تھکا تھا سورج
بڑی مشکل سے دمِ صبح جگایا میں نے

چاندنی بھیج دی بس پیار جتانے کیلیے
چاند خود آیا نہیں شب کی شکایت تھی یہی

ہم نے مہتاب کو گھٹتے کبھی بڑھتے دیکھا
پھر بھی ہر حال میں رُخ اس کا دمکتے دیکھا

اپنے قدموں پہ اندھیروں کو جھکانے کیلیے
شام ہوتے ہی چراغوں سی میں جل جاؤں کیا

نہیں بجھائے ہواؤں نے پہلی بار چراغ
یہ سانحہ تو میرے ساتھ بار بار ہوا

ابھی تو چاک پہ جاری ہے رقص ہے مٹی کا

ابھی کمہار کی نیت بدل بھی سکتی ہے
اپنی مٹی سے علینا روح کی اُلفت تو دیکھ
مضطرب ہے یہ بہت اگر تو پریشانی میں ہے
مٹی کو جب سمٹنے کا آیا نہیں شعور
خود کوزہ گر نے چاک سے اس کو مٹا دیا
ہمار مٹی کو تو ذرہ ذرہ ہونا تھا
ترا تو کچھ بھی نہیں تو فقط محافظ ہے
جتا کے روح نے پھر تن کو سوگوار کیا
جس میں ہو روح و جسم کی تکرار دم بدم
ہم سے تعلق ایسا نبھایا نہ جائے گا

محبت کا جذبہ ایک فطری حقیقت ہے۔ ہر ذی ہوش کبھی نہ کبھی اس سے گزرتا ہے۔ وہ کبھی کامیاب ہوتا ہے تو کبھی ناکام۔ علینا جیسی حساس شاعرہ اس مقدس جذبہ سے کیسے محروم رہ سکتی تھیں۔ ان کی غزلیات کے تغزل سے بھرپور یہ اشعار ملاحظہ کریں۔

گزرے لمحات کے پر کیف حسیں پس منظر
نظر آتے ہیں ان آنکھوں سے بھی گفتار سے بھی
کیسی آہٹ ہوئی کیوں چونک اٹھی خاموشی
یوں لگا جیسے میرا نام لیا ہے تو نے
کاش ایسا ہو کہ یوں مجھ میں وہ شامل ہو جائے
جسم سے پہلے میری روح کو حاصل ہو جائے
محبت تو علینا سائباں ہے
اسے رکھنا نہ تم دیوار کر کے

غم کیسا جو حاصل نہ تھے قربت کے اجالے
کافی تھی تسلی کو تری اک نظر بھی

علینا کے کلام کو دیکھ کر اس بات کا بخوبی احساس کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی صنف کو محض صنف نازک خیال نہیں کرتیں۔ اُن کے اشعار صنف نازک میں حوصلہ، خود اعتمادی، ہر سرد و گرم کے مقابلہ کرنے کا مؤثر ذریعہ بھی ہیں۔ لیکن اس خود اعتمادی کے زعم میں وہ اللہ رب العزت کے اس فرمان کو بھی فراموش نہیں کرتیں۔ جس میں ارشاد ہے "الرّجال قوّامون علی النساء." اس رنگ کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

گرجتا کیا ہے سمندر ترے سکوں کیلئے
بدن کو دھوپ میں رکھ رکھ کے ریگزار کیا

میری خودداری پہ اک وار کیا تھا تو نے
بے سبب یوں ہی نہیں شور مچایا میں نے

بنت حوا ہوں نہ سمجھو گے کہ کیا ہے مجھ میں
قدرتِ حق کا ہر اک راز چھپا ہے مجھ میں

جتنے طوفان اٹھاؤ گے میں سہہ سکتی ہوں
تیز آندھی میں لچکنے کی ادا ہے مجھ میں

اک کہانی کی طرح ہم کو بھلانے والے
ہم نہیں ہیں کوئی کردار فسانے والے

اب کہ جب لوٹے گا وہ تو فاصلہ رکھیں گے ہم
یہ ارادہ اس کے آتے ہی بدل جاتا ہے کیوں

جو لوٹ آئے کوئی سفر سے تو پھر مسافر کہاں رہا وہ
وہ مسافر ہے جو سفر میں ہے اور کبھی لوٹ کر نہ آئے

دل کی آواز کا دروازہ مقفل کر کے

بند کردیں سبھی راہیں تری رسوائی کی

ہر ایک سجدہ میں دل کو ترا خیال آیا

یہ اک گناہ عبادت میں بار بار ہوا

ہم نے علینا کے مجموعہ کلام سے جو جستہ جستہ اشعار سطور بالا میں پیش کئے ہیں ان سے سخن شناس قارئین نے یہ تو بخوبی اندازہ کرلیا ہوگا کہ علینا کے کلام میں کلاسیکی رچاؤ اور جمالیاتی حس خاصی نمایاں ہے۔ انہوں نے غزل کی خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے نزاکت خیال اور الفاظ کے انتخاب میں بھی دقت نظر سے کام لیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ علینا کی تمام غزلیات فکر کی بلندی اور عزت نفس کے عناصر سے پُر ہیں جو قاری کو چونکاتی بھی ہیں اور محظوظ بھی کرتی ہیں۔ ہمیں قوی امید ہے کہ اپنے اسی منفرد لب ولہجہ کے ساتھ انکا تخلیقی سفر جاری رہے گا اور اس میں جلا بھی پیدا ہوتی رہے گی۔ اور وہ ایک درخشاں نگینے کی طرح اپنے آبائی وطن یعنی نگینہ کا نام روشن کرتی رہیں گی۔ انشاء اللہ

نسیم منزل، مدح گنج پولیس چوکی،

سیتاپور روڈ، لکھنؤ-226020

موبائل:09307065182

تائیدی کلمات

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر مذہب کو اپنے مشن اور پیغام کی ترسیل کے لیے زبان کی ضرورت ہوتی ہے زبانوں کی یہ سب سے بڑی خصوصیت اُردو زبان سے بھی جدا نہیں؛ یوں تو اس ہند آرائی زبان کی آبیاری مختلف مذاہب اور مکاتب فکر کے لوگوں نے کی ہے؛ لیکن عربی اور فارسی زبانوں سے قربت کی بنا پر اس زبان سے مسلمانوں کا تعلق نسبتاً زیادہ رہا ہے؛ اسی لیے بعض لوگوں کو یہ کہنے کا موقع خوب ملا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اُردو زبان کا یہ خاصہ ہے کہ ہر عمل میں اس زبان نے اس غلط پروپگنڈہ اور مذہبی رجحان کی تردید کی ہے اسی لیے آج اُردو زبان کا دامن مختلف پھولوں کا گلدستہ ہے، جس کی خوش بو سے محبت، امن اور اتحاد کا پورا چمن مہکتا ہے۔

آزادی کے بعد سے اُردو تعلیم کا رجحان کم ہوتا گیا بالخصوص شمالی ہند میں اس رجحان کا سب سے زیادہ اثر دیکھا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو چند حلقوں تک محدود ہو کر رہ گئی ان میں اُردو زبان بولی اور سمجھی تو جاتی ہے؛ لیکن پڑھنے اور لکھنے کا رجحان اُردو تعلیم کا بہتر نظم نہ ہونے کے باعث اور بھی کم ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود مسلمان بھی اس زبان سے دور ہوتے چلے گئے، ریاست اتر پردیش اس تشویشناک رجحان کی سب سے بڑی مثال ہے ان حالات میں بھی ہندی اور انگریزی تعلیم یافتہ قلم کار کی اُردو زبان میں تخلیق نہ صرف قابلِ ستائش ہے؛ بل کہ یہ تخلیق ایک مثالی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ ڈاکٹر شیخ نگینوی اسی سلسلہ کی اک کڑی ہیں جنھوں نے "بجنور" کی ادبی تہذیبی فضا اس کی اہمیت اور اس کے تاریخی ورثہ کو سمونے کی ایک کامیاب کوشش اپنی اس کتاب بعنوان "دبستانِ بجنور" میں کی ہے یہ ان کی دوسری تصنیف ہے اس سے قبل فیضانِ راقم کے عنوان سے ایک کتاب تخلیق کر چکے ہیں، اس کتاب کی اشاعت کی ابھی محض ایک سال گذرا کہ اب ان کی دوسری تصنیف ہمارے سامنے ہے۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی کامرس کے طالب علم ہیں اور ان دنوں محکمہ برقیات سے وابستہ ہیں، اپنے موضوع مواد اور زبان و بیان کے اعتبار سے یہ کتاب انتہائی اہم ہے امید ہے کہ یہ کتاب اُردو قارئین و محققین کو بے حد پسند آئے گی اور ان کے علم میں اضافہ کرے گی۔ فیضانِ راقم کی طرح اس کتاب کی بھی پذیرائی ہوگی اور زبان و ادب میں ایک گرانقدر اضافے کے طور پر تسلیم کی جائے گی۔

ڈاکٹر قاسم انصاری
اسسٹنٹ پروفیسر
شعبۂ اُردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

دبستانِ بجنور کے قلم کار

محمد عرفان | شمیم احمد | محمد سمیع الدین | ابرار کرتپوری | سرور نگینوی | عشرت جاوید

جلیس نجیب آبادی | اقبال احمد | محمد احمد دانش | اویس اکرم | معین شاداب | مصباح احمد

منصور احمد | فرقان سنبھلی | وسیم اقبال | شیخ نگینوی | فرح ناز | احتشام نعمانی

ظہیر ربانی | تہذیب ابرار | پرویز عادل | ڈاکٹر زیبا ناز | ذی وقار احمد | علیم ہاشمی

Dabistan-e-Bijnor

Compiled By : Dr. Shaikh Naginvi

BOOK CORPORATION

81-88912-66-2